

اسلام میں

خواتین کے حقوق



ہماری مطبوعات

تفسیر عاشورا	درس قرآن
عزاداری کیوں؟	مکتب تشیع اور قرآن
عاشورا اور خواتین	اسرار پنج البلاغہ
پیام شہید اہل	پنج البلاغہ سے چند منتخب نصیحتیں
ہمارا پیام	مدح الہی بیت
آزمائش	شیعیت کا آغاز کب اور کیسے
درس انقلاب	فلسفہ امامت
اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں	الہی بیت آیہ تطہیر کی روشنی میں
شناخت انگلہار	ائمہ سیر (مختصر سیرت موصوفین)
عوامی حکومت یا ولایت فقیہ	سوانح حیات حضرت فاطمہ الزہراء
کتاب المؤمن	الہی بیت کی زندگی مقاصد کی ہم آہنگی زمانہ کی نیرنگی
خاندان کا اخلاق	فدک تاریخ کی روشنی میں
ازدواج و اسلام	آمریت کے خلاف ائمہ طاہرین کی جدوجہد
اسلام میں خواتین کے حقوق	صدائے حضرت سجاد
آسان مسائل	سوانح حیات حضرت امام حسین
عورت پردہ کی آغوش میں	تفسیر سیاسی قیام امام حسین
اسلامی اتحاد مسلک الہی بیت کی روشنی میں	اثبات وجود خدا
مادیت و کیونزم	۲۰ جواب
خاک پر سجدہ مقصد اہمیت حقیقت	آسان عقائد (دو جلدیں)
مسجد مقصد تقاضہ کثرت واریاں	تعلیم دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)
عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز	حسین شناسی
دعائے افتتاح — دعائے ندبہ	انقلاب حسین پر محققانہ نظر
زیارت جامعہ	فکر حسین کی الفب

اِسْلَامِ مِیْنُ خَوَانِیْنُ كَے حُفُوْقُ

تالیف

اُستاد شہید مرقنہ مطہری

یكے از مطبوعات

بازار الشفا الاممیتہ لا پاکستنا

۲- جے - ۵/۴ - ناظم آباد - نمبر ۲ - کراچی



طبع سوم

جمادی الاول ۱۴۱۹ھ، ستمبر ۱۹۹۸ء

نام کتاب _____ اسلام میں خواتین کے حقوق

تالیف _____ استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

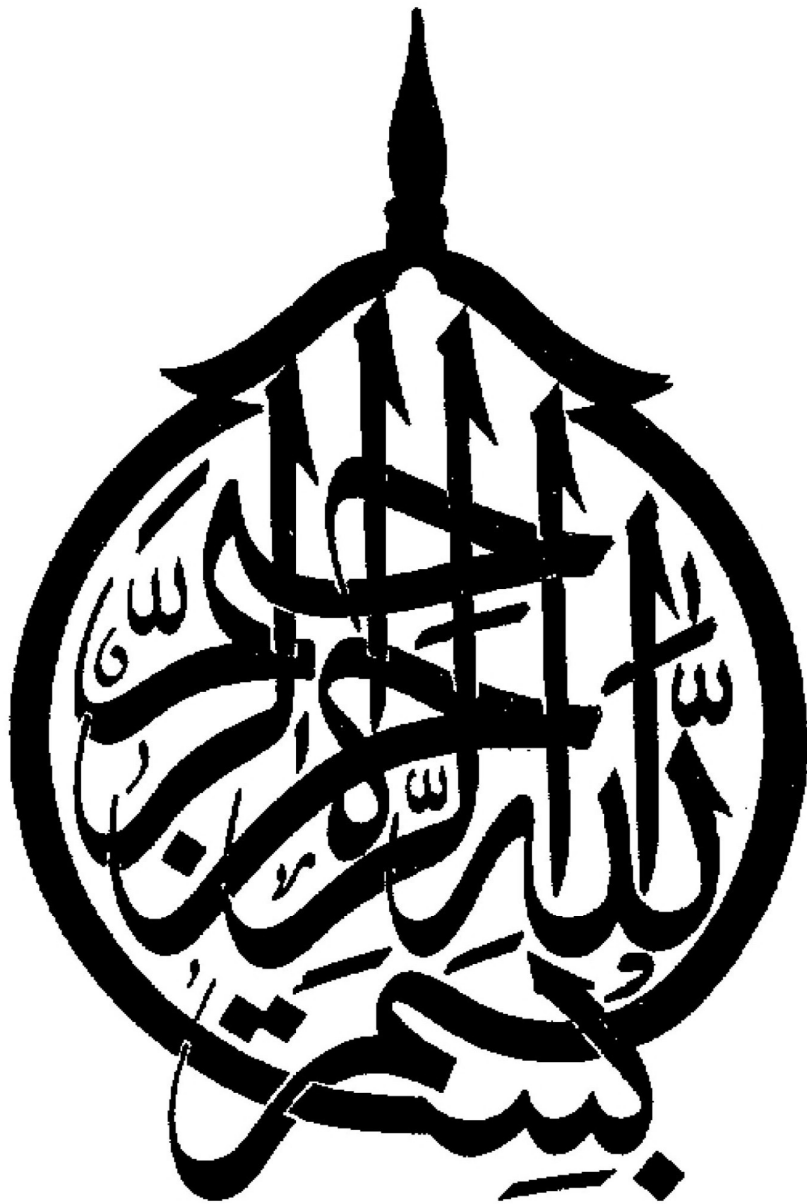
ترجمہ _____ مولانا مرتضیٰ حسین صدر الافاضلؒ

ناشر _____ دارالشفافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع دوم _____ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ جنوری ۱۹۹۳ء

تعداد _____ ۲۰۰۰

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں



فہرست کتاب

عربی ناشر
حرف اول

مترجم

○ — مصنف

○ — کتاب

○ — ترجمہ

شہید مضمیری

مقدمہ مؤلف

پیش گفتار مؤلف

○ — عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات

○ — آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں ؟

○ — تاریخ کا جسیرہ

○ — ایرانی معاشرے میں مذہبی رجحانات

کتاب کا آغاز

از مؤلف

۷۷ ملا حصّہ

خلاصہ مطالب از مؤلف :-

○ — خواستگاری و رنامزدگی

○ — کیا مرد کی طرف سے خواستگاری عورت کی توہین ہے ؟

○ — مرد کی فطرت، طلب و نیاز — عورت کی فطرت، جلوہ و نیاز

- ۶۰۔ مرد خریدار و محال ہے، عورت کا خریدار نہیں ہے۔
- ۶۱۔ حیثیت و احترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ اور نفیس طریقہ منگنی ہے۔
- ۶۲۔ چالیس قانونی نکات مرتب کرنے والے کو قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔

دوسرا حصہ

- ۶۴۔ خلاصہ مطالب از مؤلف :-
- ۶۶۔ نکاح موقت - متعہ -
- ۶۷۔ متعہ اور آج کی زندگی -
- ۶۸۔ وقتی رہبانیت -
- ۶۹۔ آزمائشی شادی یا نکاح موقت (متعہ) کونسا طریقہ بہتر ہے -
- ۷۰۔ نکاح موقت -
- ۷۱۔ اعتراضات و جوابات -
- ۷۲۔ انتقاد - چالیس نکات پر -
- ۷۳۔ نکاح موقت اور حرم سرا -
- ۷۴۔ حرم سازی کے معاشرتی اسباب -
- ۷۵۔ کیا ازدواج موقت بوس رانی کے لیے جواز مہیا کرتا ہے؟
- ۷۶۔ آج کی دنیا میں حرم سرا -
- ۷۷۔ ازدواج موقت سے خلیفہ کی منافقت -
- ۷۸۔ حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث -

تیسرا حصہ

- ۷۹۔ خلاصہ مطالب از مؤلف :-
- ۸۰۔ سرنوشت کے انتخاب میں آزادی -

- ۱۰۱ — ختم سے پہلے نکاح ۔
- ۱۰۲ — ریکوں یا بہنوں کے معاوضہ ۔
- ۱۰۳ — رسول اللہؐ نے حضرت معصومہؑ کو انتخاب میں آ کر رکھا ۔
- ۱۰۴ — اسلامی تحریک میں خواتین کا انقلاب سفید ۔
- ۱۰۵ — باپ کی اجازت ۔
- ۱۰۶ — مرد بندہ شہوت اور عورت اسیر محبت ہے ۔

چوتھا حصہ

- ۱۱۳ — خلاصہ مطالب از مولف ۔
- ۱۱۵ — اسلام اور بدلتی زندگی ۔ ۱۔
- ۱۱۵ — زمانے کے تقاضے ۔
- ۱۲۰ — خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے ؟
- ۱۲۲ — انطباق یا نسخ ؟
- ۱۲۴ — اسلام اور بدلتی زندگی ۔ ۲۔
- ۱۲۴ — انسان، معاشرہ اور عقل ۔
- ۱۲۹ — منجھ اور جاہل لوگ ۔
- ۱۳۱ — قرآنی تشیل ۔
- ۱۳۲ — اسلام اور بدلتی زندگی ۔ ۳۔
- ۱۳۶ — قوانین اسلام میں جوڑ، موڑ اور اسرار و رموز ۔
- ۱۳۸ — جسم و صورت کے اختلاف سے زیادہ روح و حقیقت پر توجہ ہے ۔
- ۱۳۹ — مستقل ضرورتوں کے لیے پائدار قانون اور بدلتی ضرورتوں کے لیے متبادل قانون ۔

- ۱۴۲ - ○ رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ -
- ۱۴۳ - ○ ہیٹ پہننا حرام نہیں ، دم چھلانا حرام ہے -
- ۱۴۴ - ○ اہم اور اہم تر مسئلہ -
- ۱۴۵ - ○ ویٹو کا حق رکھنے والے قوانین -
- ۱۴۵ - ○ حاکم کے اختیارات -
- ۱۴۶ - ○ اہل جہاد -

پانچواں حصہ

- ۱۴۶ - ○ خلاصہ مطالب از مولف :-
- ۱۴۷ - ○ قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ -
- ۱۴۷ - ○ براہری یا مشابہت -
- ۱۴۸ - ○ اسلام کی جہاں بینی میں عورت کا مرتبہ -
- ۱۴۹ - ○ مساوات ؟ ہاں — مشابہت ؟ — نہیں -
- ۱۵۰ - ○ حقوق انسانی کا منشور ، فلسفہ ہے ، قانون نہیں ہے -
- ۱۵۱ - ○ فلسفہ کو پین سے ثابت نہیں کیا جاسکتا -
- ۱۵۱ - ○ یورپ میں حقوق نسوان کی تاریخ پر ایک نظر -
- ۱۵۲ - ○ انسان کی حیثیت اور حقوق -
- ۱۵۳ - ○ منشور حقوق انسانی کے اہم نکات -
- ۱۵۴ - ○ مقام و احترام انسان -
- ۱۵۵ - ○ مغربی فلسفوں میں انسان کا مندر اور گراؤٹ -
- ۱۵۶ - ○ مغرب انسان کے بارے میں تضاد اور تناقض سے دوچار ہے -
- ۱۵۷ - ○ مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی -

حصہ حصہ

۱۸۵

۱۸۵

خداوند مطالب از مؤلف :-

۱۸۶

○ - عائلی حقوق کی فطری بنیادیں - (۱)

۱۸۷

○ - طبعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں فرق -

۱۸۸

○ - معاشرتی حقوق -

۱۹۰

○ - عائلی حقوق -

۱۹۲

○ - عائلی حقوق کی فطری بنیادیں - (۲)

۱۹۳

○ - خاندانی زندگی فطری ہے، یا باہمی مفاہمتی زندگی؟

۱۹۴

○ - چار عہدوں کا مفروضہ -

۱۹۹

○ - عورت، فطرت کے زاویہ نظر سے -

۲۰۳

سیاتواں حصہ

۲۰۳

خداوند مطالب از مؤلف :-

۲۰۳

○ - عورت و مرد کے فرق - (۱)

۲۰۴

○ - عورت و مرد میں فرق و اختلافات -

۲۰۵

○ - نقص و کمال یا تناسب -

۲۰۶

○ - نظریہ افلاطون -

۲۰۸

○ - ارسطو، افلاطون کے مقابلے میں -

۲۰۹

○ - دورنگی -

۲۱۰

○ - نفسیاتی فرق -

۲۱۲

○ - عورت و مرد کے فرق - (۲)

۲۱۲

○ - پروفیسر ریک کے نظریات -

۲۰۴ ○ - شاہکار خلقت -

۲۰۵ ○ - خواہشات سے بلند تر رشتہ -

۲۰۶ ○ - زن و مرد کے باہمی نفسیات و احساسات -

۲۰۸ ○ - ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ -

۲۰۹ ○ - جلد بازی کا انقلاب -

۲۰۹ ○ - ویل ڈیورینٹ کا نظریہ -

۲۲۵ آٹھواں حصہ

۲۲۵ خدمتِ مطالب از مؤلف -۱-

۲۲۶ ○ - مہر اور نفقہ - ۱-

۲۲۸ ○ - مہر کا تاریخی -

۲۲۹ ○ - مہر - نظامِ قانونِ اسلام میں -

۲۳۰ ○ - تاریخ پر ایک نظر -

۲۳۲ ○ - مہر کا حقیقی فلسفہ -

۲۳۶ ○ - قرآن میں مہر -

۲۳۶ ○ - حیوانات میں احساسات کا فرق -

۲۳۸ ○ - غیر شرعی شادیوں میں بدیہ اور کھفہ -

۲۳۸ ○ - فریگی کہ عشق اس کی شادی سے بہتر ہے -

۲۴۰ ○ - مہر اور نفقہ - ۲-

۲۴۱ ○ - جاہلیت کے رسم و رواج اسلام نے منسوخ کر دیے -

۲۴۲ ○ - مہر کا نظام خاص اسلام کا نظام ہے -

۲۴۴ ○ - آئینِ فطرت -

- ۲۴۶ - انتقادات و نظر۔
- ۲۵۲ - مہر اور نفقہ - ۲۵۲
- ۲۵۲ - نفقہ۔
- ۲۵۲ - انیسویں صدی کے آخری حصے تک فزرنگی عورت کی محرومی۔
- ۲۵۴ - یورپ نے عورت کو اقتصادی آزادی کیوں دی؟
- ۲۵۶ - ایک تناظر۔
- ۲۵۷ - انتقاد اور جواب۔
- ۲۵۹ - نفقہ کی تین قسمیں۔
- ۲۶۰ - کیا آج کی بیوی مہر و نفقہ نہیں چاہتی؟
- ۲۶۰ - مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت۔
- ۲۶۲ - نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈا۔
- ۲۶۶ - شوہر کی دولت۔
- ۲۶۹ - کیا حقوق انسانی کا منشور، عورت کی توہین کرتا ہے؟

نواں حصہ

- ۲۷۳ - خدامہ مطالب از مؤلف :-
- ۲۷۴ - مسئلہ میراث۔
- ۲۷۶ - میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب۔
- ۲۷۶ - منہ بولا لڑکا، وارث ہوتا تھا۔
- ۲۷۷ - ہم پیمان (ضامن البحرہ) کا ترکہ۔
- ۲۷۷ - بیوی، ترکہ کا حصہ تھی۔
- ۲۷۷ - ساسانی عہد کے ایران میں عورت کا وارث ہونا۔

- ۲۷۹ — اسلام کی نظر میں عورت کا حصہ میراث۔
- ۲۸۰ — مفرب پرستوں کا اعتراض۔
- ۲۸۱ — میراث کے مسئلے پر زندیقوں کا اعتراض۔

دسواں حصہ

- ۲۸۲ خدندہ مصائب از مولف :-
- ۲۸۳ — طلاق۔
- ۲۸۴ — تقی طلاق۔
- ۲۸۵ — نئی زندگی اور طلاق میں تضاد۔
- ۲۸۶ — ایران میں طلاق۔
- ۲۸۷ — امریکہ میں طلاق کی افزائش کی ہوا۔
- ۲۸۸ — مفروضے۔
- ۲۸۹ — طلاق — ایک بین الاقوامی مسئلہ۔
- ۲۹۰ — غیر شریعہ طلاق۔
- ۲۹۱ — امام حسن کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا۔
- ۲۹۲ — اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا۔
- ۲۹۳ — طلاق اور نظم فطرت۔
- ۲۹۴ — نکاح و طلاق میں قانون فطرت کی نگہداشت۔
- ۲۹۵ — گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ۔
- ۲۹۶ — ماہر نفسیات فریسیسی خاتون کا نظریہ۔
- ۲۹۷ — وہ عورت جس کی بنیاد جذبات پر ہے۔
- ۲۹۸ — گھریلو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوت سے بھی اہم ہے۔

- ۲۱۶ — ○ — فساد میں مساوت -
- ۲۲۰ — ○ — طلاق - کوشش صلح کے پس منظر میں - (۴)
- ۲۲۳ — ○ — گھریلو صلح کا مندرجہ ہر قسم کی صلح سے بد ہے -
- ۲۲۴ — ○ — اسد مہ صدق سے باز رکھنے والی ہر تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے -
- ۲۳۰ — ○ — خاندان کے لیے بیوی کے گذشتہ خدمات -
- ۲۳۲ — ○ — طلاق (آزادی اور حق) - (۵)
- ۲۳۵ — ○ — حق، مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے اس کا تعلق عشق سے ہے -
- ۲۳۶ — ○ — طلاق اس لیے آزادی ہے کہ نشادی کی فطری -
- ۲۳۸ — ○ — طلاق کا جرم مانہ -
- ۲۳۸ — ○ — اگر حق طلاق بیوی کو تفویض ہو -
- ۲۴۱ — ○ — عدالتی طلاق -
- ۲۴۵ — ○ — بند راستے -
- ۲۴۶ — ○ — حلق کو بند راستے -
- ۲۴۷ — ○ — آیت اللہ علی کا خیال -
- ۲۴۸ — ○ — آیات و احادیث -
- ۲۵۱ — ○ — دوسرے دلائل و شواہد -
- ۲۵۲ — ○ — شیخ الطائفہ کا نظریہ -
- ۲۵۷ — گیارہوں حصہ
- ۲۵۷ — خدامہ مصائب از مؤلف :-
- ۲۶۰ — ○ — تعدد از واج -
- ۲۶۰ — ○ — ہنسی کیونکر -

- ۳۶۱ — فلسطون کا نظریہ -
- ۳۶۱ — چند شوہری نظام -
- ۳۶۳ — چند شوہری نظام کے مشکلات -
- ۳۶۴ — تعدد ازواج -
- ۳۶۵ — سلام اور تعدد ازواج -
- ۳۶۸ — ایران میں تعدد ازواج -
- ۳۷۱ — تعدد ازواج کے تاریخی اسباب - ۱.
- ۳۷۲ — چند شوہری نظام کی ناکامی کی وجہ -
- ۳۷۶ — جنسی اشتراکیت کی شکست -
- ۳۸۲ — تعدد ازواج کے تاریخی اسباب - ۲.
- ۳۸۲ — جغرافیائی عوامل -
- ۳۸۵ — یورپ میں چند ازواجی رسم کی صورت حال -
- ۳۸۹ — ماموری -
- ۳۸۹ — خواتین کی بچگی کا سن محدود ہوتا ہے -
- ۳۹۰ — اقتصادی اسباب -
- ۳۹۱ — تعدد و خاندان ، ایک سبب -
- ۳۹۲ — تحقیق -
- ۳۹۵ — کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق - ۱.
- ۴۰۰ — شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عددی کثرت کا سبب -
- ۴۰۲ — بیماریوں سے خواتین کی قوت مدافعت -
- ۴۰۳ — کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق -

- ۴۰۵ — دس لکھ نظریہ -
- ۴۰۶ — دس انگیزوں میں ایک
- ۴۰۸ — تعدد ازدواج ممنوع اور ہم جنس بازی کی اجازت -
- ۴۱۰ — کیا چند ازدواجی مرد کی فطرت ہے؟
- ۴۱۲ — چند ازدواجی نظام یک زوجہ نظام کا سبب ہے۔
- ۴۱۵ — بحث کی اصل صورت -
- ۴۱۶ — بیسویں صدی کے مرد کی نینرگیاں -
- ۴۱۹ — بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحرن -
- ۴۲۰ — غورتوں کی فروانی میں مختلف ردِ عمل -
- ۴۲۳ — چند ازدواجی کے مشکلات و عیوب -
- ۴۲۴ — تحقیق کا صحیح راستہ -
- ۴۲۵ — روحانی زاویہ نظر -
- ۴۲۷ — تربیتی نقطہ نظر -
- ۴۲۹ — اخلاقی زاویہ نظر -
- ۴۳۱ — قانونی نقطہ نظر -
- ۴۳۳ — فلسفی نقطہ نظر -
- ۴۳۶ — چند ازدواجی دستور میں اسلام کا کردار -
- ۴۳۶ — محدودیت -
- ۴۳۷ — عدالت -
- ۴۴۲ — عدل و انصاف کا خوف -
- ۴۴۳ — حرمِ سرائیں -

- ۴۴۳ — دوسرے شرائط و لوازمات ۔
- ۴۴۵ — محترم قارئین !
- ۴۴۵ — آج کا مرد اور تعددِ ازدواج ۔

۴۴۹ فہرست :

- ۴۵۱ ● — فہرست آیات ۔
- ۴۵۲ ● — فہرست احادیث ۔
- ۴۵۴ ● — فہرست اشعار ۔
- ۴۵۵ ● — فہرست اسماء و اماکین ۔ (اعلام)

حرفِ اوّل

○ _____ مصنف

○ _____ کتاب

○ _____ ترجمہ

حرفِ اول

مضف :-

اللہ! اللہ! کتنے ذہین انسان اس نے پیدا کیے ہیں وہ تند و تیز بوجہ جس کے ایک جھکڑے تناور درخت اُڑ جاتے ہیں، وہ تند و سیلاب جو فلک بوس یوانوں کو بہا لے جاتے ہیں۔ وہ آتش نشان دھماکے جن سے پہاڑوں کے کلیجے پھٹ جاتے ہیں۔ انسان کے ایک اشارے، آدم زاد کے ایک کرشمے میں موجود ہیں۔ اللہ نے ابنِ آدم کو تسخیر کائنات کی قوت عطا کی ہے، ہم نے ایسے آدمی دیکھے ہیں جنہوں نے، فضا، مائداد فضا اور ستاروں پر ہاتھ ڈالا اور قدم فرسانی کی ہے۔ علم، آدم کی میراث ہے اور معاشرے کو باغ و بہار بناتا ہے۔ تسخیر کائنات ہو یا تسخیر قلب و نگاہ بشر دونوں کے لیے علم درکار ہے۔ علم جلال بھی پیدا کرتا ہے، جمال بھی۔ علم کا ایک نام قرآن ہے دوسرا نام نبی آخر الزمان ہے۔

ہمارے آپ کے نزدیک ہی علم، سیدھی لیکھ بتاتا اور اسی سے اللہ تک رسائی ہوتی ہے۔ اس راستے پر چلنے کے آداب اور اس راستے کے رہنما امام اور ان کے دبستان سے سند فضل و شرف لینے والے علما ہیں۔ کتاب و سنت کے عالموں میں ایک عالم تھے۔

شیخ مرتضیٰ مطہری ابنِ شیخ محمد حسین مطہری، صوبہ خراسان ایران کے باشندے، فریمان دیہات کے رہنے والے، دیہات سے نکل کر شہر مقدس مشہد، وہاں سے شہر قم، وہاں سے تہران آکر آباد ہو گئے۔ فریمان میں الف بے پڑھی، مشہد میں متوسطات کا درس دیا، قم میں "اجتہاد" کا مرتبہ حاصل کیا۔ قم کے متعدد اکابر کے حضور حاضر ہوئے، جن میں خصوصی اساتذہ یہ تھے :-

آیت اللہ سید حسین بروجرودی۔

آیت اللہ سید محمد محقق۔

آیت اللہ سید محمد حجت۔

آیت اللہ صدر۔

آیت اللہ سید محمد حسین صباطبائی، مفسر فلسفی۔

آیت اللہ سید روح اللہ موسوی خمینی۔

جناب مظہری، روشنی فکر، عمیق نظر، کتبہ رس ذہن، دلکش گفتگو اور علمی درجے کی تقریر و تحریر کی مہارت رکھتے تھے، انھوں نے تفسیر حدیث، فقہ و اصول میں جو کچھ پڑھا ہے تفصیلات سیاسیات، قانون، معاشرتی علوم اور جدید سائنس کے عوالم اور عمیق مطالعات میں سمویا اور قوم کے دانشوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، وہ مغربی افکار کو مشرقی لہجے میں اور مشرقی افکار کو مغربی فلسفے کی روشنی میں لوگوں تک پہنچانے اور دونوں کے درمیان پل بنانے والوں میں تھے۔

تین سال کی عمر میں (۱۹۵۲ء) وہ تہران آگئے، تہران میں ان کا معاشرتی اور علمی مطالعہ پھیل گیا، جوان طلبہ ان کے گرد جمع ہو گئے وہ آیت اللہ خمینی مدظلہ العالی سے قریب ہوتے گئے۔ آقای مظہری نے بہت اپنی مقبولیت کے سہارے یونیورسٹی تک رسائی حاصل کر لی، وہ دانشکدہ الہیات میں لیکچرر دینے لگے اور طلبہ پر ان کا فکری دباؤ بڑھنے لگا، مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی تحریکوں کو قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل کر سکے اور جدید مسائل نیز اسلام کے خلاف زیر زمین اور اندرون معاشرہ، خفیہ اور علانیہ تحریکوں کے سامنے آنے لگے، جینیہ اثرات ان کا مورچہ تھا اور تہران یونیورسٹی اور پریس ان کی جنگاہ۔ وہ اساتذہ اور طلبہ کے ذہنوں پر چھا گئے، وہ جوان نسل کے دلوں میں سم گئے، اسلامی عمل کے پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی انقلاب کے سپاہی بھی تھے وہ ہر وقت دفاع کے لیے تیار اور ہر جگہ کا جوا

دینے کے لیے آگے نظر آتے تھے۔ حسینہ ارشد کے بعد مدرسہ سپہ سالاران کا بیڈ کوارٹر ہوا جسے بعد میں ان کی یاد میں مدرسہ علی شہید مظہری کا نام دے دیا گیا۔

۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء - ۱۹۶۵ء تک وہ جملہ ورک اور پ اختیار کر چکے تھے، وہ سیاسی قائد اور سکری رتھان بن کر، بھرپور شخصیت کی صورت میں سب کے سامنے آئے تھے۔ انہیں جہنمی وصال کے نامی اور نقاب سدھی کے داعی قرار پائے، وہ جیل گئے، حکومت کے غتاب اور شاہ پور کے نشانے پر رہنے لگے۔ انقلاب اپنے شباب پر آیا، ورہیر انقلاب عرق سے فرسٹ ہینچے، تو جناب مرتضیٰ مظہری، مربع اسد م و قائد انقلاب اسدھی سے مذاکرت کرنے پیریں تشریف لے گئے، انہیں جہنمی مدفن نے گھلے لگایا، ہدایت دیے۔ جناب مرتضیٰ مظہری نے واپس آکر تہرانی انقلابیوں کی قیادت سنبھال لی۔

۱۱۔ فروری ۱۹۶۵ء کو انقلاب اسدھی کا میاب ہوا، اور شیخ مرتضیٰ مظہری مجلس شورائے انقلاب کے کن و روح و روان بنائے گئے۔ وہ انقلاب کی اس رفتار، سمت اور بہاؤ کے نگران تھے، وہ تختہ سے مزاج کے کوہ صفت رہتا تھے، وہ سندھ کی طرح نرم، گہرے مگر ندرت چلنے والی کشتیوں کی غرقابی کے اقتدار سے بہرہ ور تھے۔

انقلاب دشمن، انقلاب و انقلاب کے خواہشمند افراد اور قائد انقلاب کو ذہنی اذیت پہنچانے کی نیت رکھنے والوں نے ۲۴ جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ / ۵ ارمی ۱۹۷۹ء کو انہیں شہید کر دیا۔ وہ رام خدا میں جاں بحق ہو گئے، وہ انقلاب اسدھی پر قربان ہو گئے اور زندہ جوانوں کو ستھ مدت کا خون عیا کر کے، تاریخی کے زندہ، بہادر عمامہ دین کی صف میں کھڑے ہو گئے ان کی تاریخ پیدائش ۱۲ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء تھی۔

ان کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ ورہیرے، قوم کے جواں سپاہی ہیں، مدرسے ہیں مسجد ورمہ بارے ہیں، وصال کی نمٹ تحریریں ہیں۔

کتاب :-

”نظام حقوقِ زنان در اسلام“

شہید مرتضیٰ مہرزی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی ہمت آئینہ ہے۔ ان کا فکری افق بلند اور روشن تھا۔ ان کے اندعات کا دائرہ وسیع اور ان کا نسب العینِ اسدِ م تھا۔ وہ عقلی و منطقی ایجے اور عام فہم زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے مجموعے ”زنان کی کتابوں کے نام دیکھیے“ آپ کو دیکھیں گے کہ منصف پس معیار اور کس سطح کا کام ہے۔

تعدادیغ شہید مہرزی :-

● اصول فلسفہ و روشِ ریسم - پانچ جلد۔

● خدمات متقابلِ اسدِ م و یرن -

● عدلِ انھی -

● پیامِ مہرتمی -

● ختمِ نبوت -

● سیرتِ نبویؐ -

● امامت -

● جاذبہ و دافعہ علیؑ -

● حماسہ کربلا -

● قیام و عذابِ مہدیؑ -

● شناختِ قرآن -

● تفسیر سورہٴ حمد و بقرہ - تین مجلد۔

● سیری در رنجِ البلاغہ -

- ولا ولایتہما ۔
 - بست گفتار ۔
 - دہ گفتار ۔
 - عند گرایش بہ مادی گری
 - امدادی غیبی در زندگی بشر ۔
 - انسان و سر نوشت ۔
- جہاں بینی اسلامی بہین الاقوامی میں اسلام کی نظر سے متعلق کتابیں :-

- انسان و ایمان ۔
 - جہاں بینی توحیدی ۔
 - وحی و نبوت ۔
 - انسان در قرآن ۔
 - جامعہ و تالیف ۔
 - زندگی جاوید یا حیات اخروی ۔
 - کتاب سوزی ایران و مصر ۔
 - انسان کامل ۔
 - عرفان حافظ ۔
 - نہفتہائے سدی در صد سالہ اخیر ۔
 - بیسرمون انقلاب اسدی ۔
- علوم اسلامی کا تعارف :-
- فقہ و اصول فقہ

● کلام و عرفان
● منطق و فلسفہ
تعلیم و تربیت :-

● داستانِ راستان -
● منظومہ -
● حب و -
● شہید -
خواتین کے لیے :-

● اخلاقِ جنسی -
● مسندِ حجاب -
● نظامِ حقوقِ زن در اسلام — اسی کتاب کا ترجمہ آپ پڑھیں گے۔
مرد کی طرح عورت بھی مختلف عوم و فنون میں موضوعِ بحث ہے، ادب، تاریخ، نفسیات، فزیکس، بیومن سائنس، معاشیہ اور قانون میں اس کی ذات اور اس کی حیثیت پر کئی زاویوں سے گفتگو ہے۔ پھر مذہب و ادیان بجائے خود ایک باب ہے۔ مشرق و مغرب "عورت" کی سمتیں در دو رنگ ہیں اور دونوں سرے پہلے ہوئے حاضر بحث ہیں۔ عورت کے حقوق، اسلام میں کیا ہیں، اس کا درجہ اسلام نے کیا بتایا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں؟ اس کے حقوق یعنی قوانین کیا ہیں؟

مسلمانوں سے یہ سوالات ہوتے ہیں، چونکہ مسلمان اپنے دین کو کامل و مکمل سمجھتے ہیں لہذا انہیں بھی جواب دینا چاہیے۔ ابتدائی دور، یعنی زمانہ نزولِ قرآن، عہدِ سنت نبویؐ،

ورد و برد و انجیاب میں یہ سواوات اٹھتے تھے اور جواب بھی دیے گئے تھے۔ لیکن زمان و مکان، زبان و بیان کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آنے ضروری تھیں۔ کچھ نہ کچھ بات بدلتی ہے نئے حریف کھڑے ہو جاتے ہیں، منطق و استدلال کے نئے مدعی ابھرتے ہیں، سائنس آف پیپر، سائنس آف، پھر قانون کے شعبے، شخصی قانون، قومی قانون، بین الاقوامی قانون، اس کے بعد قانون، اشتراکات قانون، غاثرات جیسی فلسفۂ موٹسکے نیاں آج کی باتیں ہیں۔ مغرب کے سامنے قوموں کی سپر نڈنگی، اپنی ذات، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اپنی فکری شکست کا قمر دراصل بارادہ و اختیار بلا قیمت یا بڑے سستے داموں بلا وجہ اپنے آپ کو بیچنے کا غلط اقدام ہے۔ آزادی کے بجائے غلامی، زندگی کے بجائے موت، اور موت کے بعد بے نام و نشان رہنے کی تیاری ہے۔ جو بعد مغرب سے اٹھے اور ادھر سب دوڑ پڑے؟، خود داری، غیرت اور اپنے وجود کے احساس سے دست برداری کے یہ حور سرخسے اہل دانش و بنش کو یک نظر نہیں بجاتے، سیاسی اور سماجی مفکر اس پیش قدمی کو اقدام خود کشی جیسا جرم جانتے ہیں۔

کچھ سرمایہ دار، اپنی شان و شوکت میں سرخاب کا پر لگانے کے لیے یورپ کی یا ترکرتے ہیں وہاں سے آکر یورپ میں حور سرخسوں کا پرچار، پھران کے نظام کی وکالت اور اپنے ملک کی مخالفت کو پیشہ بناتے ہیں۔

بدنام اگر ہوں گے، تو کیا نام نہ ہوگا

”دیپہ رازادی یا پھر دلفری غلامی کے نتیجے میں مسلمان سماج، اسلامی قانون پر کبھی توجہ نہ دیتے ہوئے میں کبھی شب خون مارتے ہیں اور پروپیگنڈے کی ایک مہم یعنی سرد جنگ تیز کر دیتے ہیں“

عورت کا مرتبہ۔ عورت کے حقوق۔ زن و مرد میں مساوات۔ نکاح، صدق، میسرث، پردہ، شہادت و... کے چھوٹے بڑے مسائل پر آوازیں اٹھانے

اور افسرے لکھنے پھر محاذ بنانے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ بہت سے ذہنوں میں حق طلبی، بعض حسرات کے لیے اطمینان کا حصول، بعض لوگوں کو بغاوت کا جواب دے کر رہنا، ہر دور میں علماء اسلام نے جواب دیے اور اسلامی قانونوں و فلسفہ قانون کے ماہرین وقت کے تقاضوں کا سامنا کیا ہے۔ اسلام اپنی فکری، منطقی، قانونی اور انسان دوست و انسان نواز تعلیم کی وجہ سے زندہ و پابندہ ہے۔ اس زندگی کو مجروح کرنے کے لیے ایران میں بھی ایک تحریک چلی تھی۔ ایران میں، عورت، بحیثیت بیٹی، بیوی اور ماں کے قانون اسلام یا اس سے قریبی حقوق و فرائض کی پابند تھی، لوگوں نے چاہا اس بند کو توڑ دیں ورنہ کمزور یا ڈھیلا تو بنادینا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے قانون و معاشرے کے زوایے سے کچھ حیلے کیے گئے۔

شہید مرتضیٰ مطہری نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور لوگوں کے اعتراضات و سوالات کے جواب لکھے۔ اس بحث و جنگ کا میدان، تہران کا مسجد۔ "زن روز" تھا، زیر نظر کتاب شہید کے انجمن مضامین کا مجموعہ ہے۔

معاشرہ، تاریخ، فطرت اور نفسیاتی جہات سے عورت کا مرتبہ، خواستگاری، نامزدگی، ازدواج، نکاح، متعہ، تعدد ازواج، نان و نفقہ اور ہر طلاق، عدہ، میراث، اولاد۔ لڑکیاں زیادہ، لڑکے کم۔ ان معاشرتی مسائل کا حل اس کتاب میں زیر بحث ہے۔ جنسی بحران، دنیا کا اہم مسئلہ۔ طوائف بازی۔ آزاد تعلقات جنسی۔ جنسی کمپوزیم۔ دوست لڑکیاں۔ دوست لڑکے۔ اولاد بے پدر۔ بے گھر زندگی۔ گھریلو زندگی۔ فلاسفہ، افلاطون۔ فرامیڈ۔ برٹینڈ رسل۔ اقوام متحدہ کے منشور میں حقوقِ زنان کا تذکرہ نہیں۔

زن و مرد کی مساوات۔ عورت کا استعمار۔ عورت سے اس کا گھر جھینے کا مسئلہ۔ مرد کا جنسی جنون، شادی کے قابل لڑکیاں۔ شادی کے قابل لڑکے۔ عائلی ذمہ داری

مرز کا فرار۔ جیسے غماوین پر گفتگو آپ کو ملے گی۔

اسلامی فقہ و حدیث و قرآن کے عالم کی حیثیت سے شہید مطہری نے بڑی عمدہ بحثیں اور بہت اچھی دسیں، نہایت شاندار تنقیص پیش کی ہیں۔ آج کل کے نئے مسائل ہیں، ان کے بارے میں عقلی دلائل میں جواب ہیں اور توضیحات ہیں۔ اسلامی رویے اور غیر اسلامی رویوں کی نشان دہی ہے۔

کتاب کا اسلوب اور زبان :-

شہید مطہری، فارسی کے سادہ زبان اور سادہ بیان مصنف ہیں۔ وہ آج کے مسائل پر سچ کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ اصل میں فلسفی ہیں مگر عملی اور نتیجہ خیز فلسفے کے نقیب ہیں۔ ایران بلکہ سارے جہاں کے لوگ یہ کر رہے ہیں، سوچ کر رہے ہیں، نتائج کیا ہیں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اسلام کیا کہتا ہے۔ اس کے لیے فقہ، اصول فقہ، قانون اور اصول قانون کا حوالہ اس کے اصطلاحات بھی آنا ضروری تھے، اس لیے بعض عام قاری کو نئے معلومات اور ہم معلومات مہیا کرتے ہوئے شہید مطہری نے حوالے بھی دیے ہیں، اور ہم حاشیے میں کچھ توضیحات لکھے ہیں۔

چار سو سے زیادہ صفحات، اگر صرف کتابی اور خشک خاکے کی صورت میں ہوتے تو بہت سے قاری تھک جاتے۔ موجودہ حالت میں کتاب مجموعہ مقارنات ہے۔ چونکہ یہ مضامین غنائین کے رسالے میں چھپے تھے اس لیے عوامی اور روزمرہ کی زبان اور زیادہ واضح اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔ آپ جنما مطالعہ کرتے جائیں گے روشنیاں تیز ہوتی جائیں گی۔ معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

ترجمہ کیوں؟

اس کتاب کا عربی و انگریزی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ اس لیے

ضروری تھا کہ ہائی وسیع زبان میں۔ خواتین کا سنجیدہ دستِ تحریر کم ہے۔ ہماری زبان میں
سدم و ساس کے تعلیمات پر اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے میں خواتین کے مطالعے تعلیم
ذہنی نشو و ارتقا اور فہم و بصیرت کے مجموعے کی فراوانی ضروری ہے۔
انقلاب اسلامی نے خواتین کو نیا کردار دیا۔

انقلابِ اسلامی ایران نے، خواتین کے، سذمی نظامِ فکر و عمل کے متعدد نئے پہلو نمایاں
کیے ہیں۔ اور اس میں شہیدِ مہمیری کی تعلیم و تربیت و دعوت کا ہاتھ بھی تھا۔ لہذا اردو زبان اور
اردو خوان جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے۔ خصوصاً۔ خواتین کے لیے ان کی زبان میں
ان کی ضرورت کے لیے ان کے اضافی معلومات اور سذمی نظریات کی توضیح و تعلیم کی
غاضر یہ کتاب ہدیہ کی جا رہی ہے۔

سید مرتضیٰ حسین

صدر الافاضل

تہران۔ ۷۔ شوال ۱۳۵۷ھ

مقدمہ

از :-

شہید مطہری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے عہد کے تقاضے، بہت سے مسائل پر دوبارہ نظر کرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہ مسائل پرانی قدروں کے بجائے نئی قدروں کے طلب گار ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ ہے۔

”خاندانی ذمہ داریاں اور نظام حقوق خواتین“۔

آج فرض کیا جا چکا ہے کہ موجودہ ماحول میں اصل موضوع ہے: ”آزادی نسوان“ اور قانونی مساوات زن و مرد۔ باقی مسائل انھیں دونوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس پر زور دینے کے اسباب و علل پر گفتگو آگے ہوگی۔

”نظام حقوق خاندان“ کے ضمن میں ہمارے نقطہ نظر سے اصل بنیادی۔ یا بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ”عائلی نظام“، نظام ہائے معاشرت میں کوئی جد گانہ نظام ہے؟ اس کا منطق یا اس کا معیار دوسری منطقوں اور معیاروں سے کسی خصوصیت کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے؟ وہ عقلی دلائل جو معاشرے کے بہت سے اداروں میں کارآمد ہیں، یہاں ان کی حیثیت بدل جاتی ہے؟ یا اس معاشرتی گروپ میں دو گروپوں سے کوئی اختلاف نہیں ہے؟ اس یونٹ میں وہی منطق اور وہی معیار کام آتے ہیں جو دوسرے معاشرتی اداروں میں بھی کام آتے ہیں؟

اس پریشانی کی اصل یہ ہے کہ ایک تو اس کے ادارے دور کنی، ”دوجنسی“ ہیں۔ دوسری طرف ولیدین و اولاد کا نسلی تسلسل ہے۔ کارخانہ خلقت نے اس یونٹ کی وضع ”باہمی مشابہت کے فقدان“ اور ”عدم یکسانیت“ پر رکھی ہے۔ ان دونوں کے کیفیات میں

اختلاف موجود ہے۔

خاندانی معاشرہ ”طبعی“ ہے۔ باہمی مفاہمت کا موثر ذریعہ ہے۔ ورد و موثراتی یونٹوں کی درمیانی کڑی ہے۔ جسے شہید کی مکھی اور مکھی، جن کے تمام قانون، قواعد و عہدت و جبلت کی بہت سے معین ہیں۔ ان سے سب سے بڑی ممکن نہیں۔ اور ایک مفاہمتی معاشرتی یونٹ جیسے انسانی مدنی معاشرہ اس میں طبعی و جبلتی پہلو کا دخل کم ہے۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں۔ ماضی بعید کے فلسفہ، خاندانی فلسفہ، نیات کو حکمت عملی، ایک مستقل باب، لیتے تھے، اور وہ معتقد تھے کہ اس یونٹ کی منصفی اور معیار انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں سے مختلف ہے۔ افدعون نے ”رسالہ تہویریت“ اور رسونے ”کتاب میاست“ اور ابوعلی سینا نے کتاب شفا میں موضوع کو اسی زاویے سے دیکھا ہے۔

معاشرے میں ”حقوق زن“ پر گفتگو میں بھی صوری طور پر یہ بحث ہے کہ طبعی و انسانی بہت سے مرد و زن کے حقوق یکساں وہم آنگ میں؟ یا ایک دوسرے الگ الگ و ہم آہنگی سے دوسری؟ یعنی خلقت و فطرت نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں وہ خلقت ایک جنسی ہیں یا دونوں؟ آیا حقوق و فرائض معاشرے میں ”مردانگی“ اور ”نسوانیت“ کا عمل دخل ہے؟ یا کوئی تخلیق کی منطق میں دونوں طبعی زاویے سے ایک جنس ہیں؟



مغربی دنیا نے سترھویں صدی عیسوی کے بعد علمی و فلسفی تحریکیں شروع کیں۔ جس کے نتیجے میں ”حقوق بشر“ کے نام سے معاشرتی میدان میں بھی ایک تحریک جنم پیا۔ سترھویں اٹھارویں صدی میں مفکروں اور ادیبوں نے اپنا فکری اثاثہ عوام میں تقسیم کر کے انسان کے ناقابل سلب انتقال فطری حقوق کی بحث عام کر دی۔ اور قابل تعریف محنت کی۔

جان جاک روسو۔ والٹیر۔ مان ٹسکو۔ اسی گروپ کے مفکر و ادیب تھے۔ ان لوگوں کا انسانی معاشرے کی تعلیم و تربیت پر حق بھی ہے۔ یہ دعویٰ کرنا بے جا نہیں کہ انسانی

معاشرے پر ان کا حق ان لوگوں سے کم نہیں جنہوں نے دنیا میں اہم ایجادات و انکشافات کیے ہیں۔ ان لوگوں کا مرکز خیال یہ نکتہ بن گیا کہ انسان فطرتاً اور حقیقت و طبیعت کی بنیاد پر کچھ حقوق اور کچھ آزادیاں رکھتا ہے۔ یہ آزادیاں و یہ حقوق کوئی فرد یا جماعت یا قوم کسی بھی عنوان اور نام سے کسی فرد یا قوم سے نہ چھین سکتی ہے نہ صاحبِ حق خود کسی دوسرے کی صرف منتقل کر سکتا ہے۔ تمام انسان، حاکم و محکوم، سفید و سیاہ، سرمایہ دار و غریب، سب آزادی اور حقوق انسانی "مساوی" ہیں۔

یہ فکری و معاشرتی تحریک بھری اور اس کے نتائج پہلے انگلستان پھر امریکہ، اس کے بعد فرانس میں انقلاب کی صورت میں برآمد ہوئے۔ انقلاب آئے، نظام بدلے، قراردادوں پر دستخط ہوئے پھر دنیا کے دوسرے نقاط پر اس کا اثر پڑنے لگا۔

انسانی حقوق کے فلسفے نے انیسویں صدی میں کچھ نئے فکری زاویے پیدا کیے ان کا تعلق اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے تھا، ان انکار نے حالات میں مزید تبدیلی پیدا کی جس کی ایک شکل ہے سوشلزم۔ مزدور طبقہ کا نفع پر استحقاق۔ سرمایہ داروں سے مزدوروں کے حامیوں کو حکومت کا انتقال۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں "انسانی حقوق" پر جو بحث باہمی اقدامات ہوئے تھے۔ ان میں سے کثیر حکومت کے مقابلے میں قوم یا ممالک کا خانہ دار کے مقابلے میں محنت کش طبقے سے مربوط تھی۔ بیسویں صدی میں "مردوں کے حقوق" اور ان کے مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا مسئلہ اٹھا۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد جب ادارہ "قوم متحدہ" قائم ہوا تو اس نے مساوات حقوق مرد و زن کا کھلا منشور شائع کر دیا۔ یورپ کے تمام معاشرتی اقدامات میں۔ سترھویں صدی سے موجودہ صدی تک سب محور دو تھے:

آزادی — مساوات — اور بس، بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اس سچائے

کہ تحریک حقوق زن مغرب میں دوسری تحریکوں کے زیر اثر تھی اس کے علاوہ یہ تحریک لوپ کے مزاج سے موافق نہ تھی، اس وجہ سے اس تحریک میں آزادی اور مساوات کے عنوان کے آگے بات نہ بڑھی۔

انقلابی رہنماؤں نے یہ طے کر لیا کہ آزادی نسواں اور اس کے حقوق کی مردوں سے یکسانیت جس کا پرچا سترہویں صدی سے شروع ہوا تھا اسی نکتہ پر ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا جب تک عورت کی آزادی اور اس کے حقوق مرد کے برابر نہیں مانے جاتے۔ آزادی اور حقوق انسانی۔ پر بحث بے معنی ہے۔ تمام خاندانی مشکلات صرف اس لیے ہیں کہ عورت نہ آزاد ہے نہ اس کے حقوق مرد کے حقوق کے برابر ہیں۔ اس پہلو کو روشن کر دیا جائے تو خاندانی مشکلات حل ہو جائیں گے۔

اس تحریک میں جس کو ہم نے ”نظام حقوق خاندان کا بنیادی مسئلہ قرار دیا یعنی آیا فطری طور پر نظام کوئی مستقل نظام ہے؟ کیا اس کی منطق اور اس کے معیار دوسرے سماجی اداروں سے جدا ہیں؟ لیکن یہ سوال فکر فلاسفہ سے دور رہے۔ ان کا فکر و نظر کا رخ ایک طرف رہا وہ ہے۔ ”اصل آزادی اور اصل مساوات“ زن و مرد۔

دوسری لفظوں میں، حقوق نسواں کے موضوع بحث کا زاویہ یہ کلیہ رہا۔ ”طبعی و فطری حقوق جو چھینے نہیں جاسکتے“ اسی مرکز پر سارے دائرے بنتے رہے۔ انسانیت میں عورت مرد کی شریک ہے۔ عورت ایک مکمل اور معیاری انسان ہے۔ اس لیے اسے مرد کی طرح ان حقوق سے بہرہ ور ہونا چاہیے جو ”فطرت نے انسان کو دیئے ہیں اور وہ چھینے نہیں جاسکتے۔“

”طبعی حقوق“ کی دریافت کن مصادر سے ہوتی ہے؟ ہم نے اس کتاب کے ابواب و فصول میں نسبتاً کافی و مکثنی بحث کی ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ خود طبیعت ”طبعی و فطری حقوق“ کا حشرچہرہ و ماخذ ہے۔ یعنی اگر انسان کو ایسے حقوق حاصل ہیں جو گھوڑے

دیکھ کر یا مرغ و ماہی کو حاصل نہیں تو اس کی تہہ میں طبیعت و خلقت کا ہاتھ ہے۔ اور اگر تمام آدم زاد جمعی حقوق میں مساوی ہیں اور سب کو آزاد زندگی حاصل ہے تو یہ فرمانِ متن خلقت سے صادر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری دلیل موجود نہیں ہے۔ مساوات و آزادی کو فطری حق ماننے والے دانشوروں کے پاس بھی صرف یہی دلیل ہے۔ نظام خاندان کے بنیادی مسئلہ میں بھی ”طبیعت“ کے علاوہ کوئی ماخذ و مصدر نہیں۔

”نظام حقوق خاندان“ میں ہم جسے بنیادی مسئلہ مانتے ہیں، اس پر مفکرین کی توجہ نہ ہونے کا سبب کیسے؟ آیا موجودہ علوم نے ثابت کر دیا ہے کہ زن و مرد کا اختلاف چند اعضا کا معمولی سا اختلاف ہے اس سے جسمانی ڈھلچے اور ان نفسیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا جن سے حقوق کا تعلق ہے؟ اور اس سے ذمہ داریاں قبول کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موجودہ معاشرتی فلسفے میں اسی وجہ سے کوئی نیا گوشوارہ حساب نہیں کھلتا؟

تفاتیلاً معاملہ برعکس ہے۔ حیاتیاتی و نفسیاتی علوم کی ترقی نے جو انکشافات کیے ہیں ان سے دونوں جنسوں کے فرق نمایاں اور بہت زیادہ روشن ہوئے ہیں۔ ماہرین حیاتیات، فیزیولوجی، اور سائیکالوجی جاننے والوں کے تحقیقات کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ ان باتوں کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ زینتِ حاقِ نسیاں کر دیا گیا۔

اس نفلت و بے توجہی کا شاید یہ سبب ہو کہ تحریکِ تیسری سے ابھری لہذا جہاں اس نے عورتوں کی بہت سی بدبختیوں کو دور کیا وہاں کچھ محجوریاں اور بد نصیبیاں اس کو تحفظ میں دیں اور ان کی معاشے کو بھی اس پیٹ میں سے لیا۔ آئندہ ابواب میں ملاحظہ کیجیے گا کہ یورپ کی عورت، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک معمولی اور روزمرہ کے حقوق سے بھی محروم تھی۔ اسی زمانے میں بل مغرب کو تباہی و مافات کا خیال آیا۔

مساوات و آزادی کے نام سے متعدد تحریکیں وجود میں آچکی تھیں، انھیں میں مسئلہ زیر بحث بھی تھا۔ آزادی و مساوات، دو لفظوں سے معجزہ آفرینی کی امید لگانے والے سب

مسائل نہیں سے حل کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھول گئے کہ مساوات و آزادی کا رشتہ خود انسان کے بحیثیت انسان کے زاویے سے پیدا ہونے والے تعلقات کا پابند ہے۔ منطقی زبان میں مساوات و آزادی انسانی حق ہے اس حیثیت سے کہ وہ انسان ہے۔ عورت چونکہ ایک حیثیت سے انسان ہے۔ ہندو انسان کی طرح آزاد پیدا ہوئی ہے اور مساوی حقوق کی مالک ہے۔ لیکن عورت چند مخصوص کیفیات کی حامل انسان ہے۔ عورت و مرد انسانیت میں برابر ہیں، لیکن یہ دو طرح کے انسان ہیں۔ ان کی خصلتیں دو الگ الگ طرح کی ہیں۔ ان کے نفسیات دو قسم کے ہیں اور یہ دوئی جغرافیائی، تاریخی یا معاشرتی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کے اساس عین تخلیق کے اندر رکھی گئی ہے۔ اس دوئی سے طبیعت کا ایک مقصد وابستہ ہے اور جو عمل طبیعت و فطرت کے خلاف ہوگا اس کے عوارض ناپسندیدہ رونما ہوں گے جس طرح ہم نے آزادی اور انسانوں میں مساوات۔ ان میں سے عورت مرد کا مسئلہ۔ طبیعت کے سرچشمے سے حاصل کیا ہے۔ اسی طرح کیفیتوں کی اکائی یا دوئی میں عورت مرد کے حقوق کا سبق حاصل کرنا ہوگا۔ یونہی خاندانی معاشرہ۔ کم از کم ایک نیم طبعی چینی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب بھی طبیعت و فطرت سے لینا چاہیے۔ کم از کم یہ مسئلہ بھی قابل بحث ہے کہ حیوانات کی دو جنسی جن میں سے ایک جنس انسان ہے، اتفاقاً عمل ہے یا تخلیقی منصوبے کا حصہ ہے؟ آیا دونوں جنسوں کا اختلاف صرف سادہ عضوی اختلاف ہے یا بقول الکیس کارل انسانی جسم کے سطحیے میں اس کی جنسیت کے علامات موجود ہیں؟ کیا منطق و زبان فطرت میں مرد و زن دونوں کے الگ الگ فرائض ہیں یا نہیں؟ کیا حقوق قانون بھی یک جنسی ہیں یا دو جنسی؟ اخلاق و تربیت دو جنسی ہے یا ایک جنسی؟ سزاؤں کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ اور ذمہ داریوں اور فرائض کی صورت کیا ہے؟

اس تحریک میں یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ مساوات و آزادی کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں مساوات و آزادی ایک لازمی شرط ضروری ہے مگر فقط یہی کافی نہیں۔ قانون و

حقوق کی مساوت اپنی جگہ اور دونوں میں مشابہت بھی تو کوئی حقیقت ہے۔ عورت مرد کے حقوق میں برابری مادی و روحانی طور پر ایک بات ہے اور دونوں میں مماثلت اور صورت میں مشابہت دوسری بات ہے۔ اس تحریر میں عمداً یا سہواً ”مشابہت“ کی جگہ ”مساوات“ اور ”مماثلت“ کی جگہ ”برابری“ کو مان کر ایک بنا دیا گیا۔ ”کیفیت“ ”کمیت“ کے تحت اشعار میں آگئی۔ عورت کا ”ان“ ہونا اس کے ”عورت“ ہونے کو نظر انداز کرنے کا سبب بن گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس بے توجہی کو فقط ایک ایسی فلسفی غفلت کا نام نہیں دینا چاہیے جو محنت کی بنا پر ہوئی۔ اس میں دوسرے عوامل بھی تھے جو آزادی اور مساوات ”ان“ کے ذیل میں قابل استفادہ تھے۔

اس مہم کے پس پردہ سرمایہ داروں کے منافع بھی کام کر رہے تھے۔ کارخانہ دار جو عورت کو گھر سے کارخانے میں لانا چاہتے تھے۔ وہ اس سے اقتصادی فائدے اٹھانے کی فکر میں تھے۔ ان لوگوں نے نعرہ لگایا۔ عورت کے حقوق۔ عورت کی اقتصادی آزادی۔ عورت کی آزادی۔ مرد و عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ ان لوگوں کی بدولت مطالبات نے قانونی صورت اختیار کی۔

ویل ڈیورنٹ ”لذتِ فلسفہ“ نویں فصل میں۔ ارسطو، لپٹشے، شوپن ہاور اور یہودیوں کی مقدس کتابوں سے عورت کے بارے میں حقارت آمیز رائے نقل کرتا اور کہتا ہے۔ انقلابِ فرانس میں عورت کی آزادی کا مسئلہ موجود تھا لیکن کوئی عملی تبدیلی نہیں ہوئی۔ انیسویں صدی تک عورت کے پاس ایک قانون تھا جس کی رو سے مرد کو عورت کے اصرار کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں عورت کے حالات میں تبدیلی آئے کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے :-

عورت کی آزادی صنعتی انقلاب کی بدولت ہے..... عورتیں، ہستی
مزدور تھیں، کارخانہ دار سرکش اور گراں قیمت مرد، مزدوروں پر انھیں

ترجیح دیتے تھے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کام ملنا مشکل تھا۔ لیکن مردوں سے اشتہاروں میں درخواست ہوتی تھی کہ بچوں اور عورتوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ آزادی خواتین کے لیے پہلا قدم ۱۸۸۲ء کا قانون تھا جس نے۔ غظیم برطانیہ۔ کی عورت کو وہ اعزاز دیا جس کی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ یعنی، عورت جو روپیہ کمائے گی وہ اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کا حق رکھتی ہے۔ اس اعلیٰ اخلاقی قانون کو انگلستان کے مجلس عوام کے کارخانہ والوں نے وضع کیا اور اس طرح انگلستان کی عورتوں کو کارخانوں میں کھینچ لیا اس سال سے اب تک جان لیوا محنت کی مزدوری نے ان کو گھر بار کے مچھوٹ سے چھٹکارا دلادیا اور دوکانوں اور کارخانوں میں خون پسینہ بہانے کا عادی بنا دیا۔

مشینی دور کی روز افزوں ترقی، صنعتی پیداوار میں ضرورت سے زیادہ اضافہ پھر مصنوعات استعمال کرنے اور خریدنے والوں کو ہزار ہا فلوں و نیمرنگ سے مائل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی خاطر سمعی بصری، فکری و جذباتی، ذوق و ہنر، فن اور آرٹ حتیٰ کہ جنسی عوامل درکار تھے جو گاہکوں کو بلا ارادہ چیزیں خریدنے پر مجبور کریں۔ یہ نئی ضرورت

۱۔ ڈاکٹر علی شایگان: شرح قانون مدنی ایران ص ۳۱۵ ہے؛

عورت اپنی ملکیت پر جو حق رکھتی ہے اور شیعوہ فقہ نے اسے شروع ہی میں تسلیم کیا وہ کچھ عرصہ پہلے اکثر قوانین ممالک میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا اس میں یونان۔ روم۔ جرمن۔ بھی داخل ہیں، کہیں اس حق کا نام و نشان نہ تھا۔ یعنی نابالغ، دیوانے اور مجبور جس کی املاک زیر تحویل حکومت ہو، کی طرح اپنی دولت خرچ کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے عورت کی شخصیت، شوہر کی ذات میں فنا تھی۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۲ء میں "ملکیت زن" کے نام سے دو قانون بنے اور عورت کی ملکیت سے کسٹوڈین شپ ختم ہوئی۔

مجبور کر رہی تھی کہ سرمایہ دار عورت کے وجود سے فائدہ اٹھائے۔ اس مرحلے میں عورت کو استعمال کرنے کا انداز کچھ اور تھا۔ اب عورت جسمانی قوت، کام کرنے کی صلاحیت، معمولی کاری گریا پیداوار میں مرد کا شریک مساوی کی حیثیت سے نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی جاذبیت، مقناطیسی کشش، فکر و خیال کو قابو میں لانے کی قوت، ارادے بدل دینے کی طاقت اور کرامت رہن رکھنے، آبرو بیچ ڈالنے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کا زاویہ سامنے آیا۔ اب پیداوار، صارف کے سر تھوپنے کی بات تھی۔ موٹی سی بات ہے اس کا دوبارہ کے لیے۔ آزادی اور مساوات مرد و زن۔ کارآمد مہم تھی۔

سیاست بھی اس عامل کو استعمال کرنے سے غافل نہ تھی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے قصے آپ بھی پڑھتے اور دیکھتے ہوں گے۔ یہ سب عورت کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی مہم ہے۔ اور مرد اپنے مختلف مقاصد کے لیے اسے استعمال کر رہے ہیں مگر آزادی و مساوات کے پردے میں۔

ظاہر ہے۔ بیسویں صدی کا جوان اس قیمتی لمحے سے غافل نہیں۔ شادی کے بارے میں وہ خاندانی رسم و رواج سے فرار کرنا چاہتا تھا اور مفت، بکثرت، سکس کار، ہاتھ آئے تو اسے خسارہ کیا ہے۔ جوانوں نے عورتوں کی آزادی و مساوات کی خاطر اس کی مطلوبیت اور حقوق تلفی پر سب سے زیادہ مگر مچھ کے آئو بہائے۔ وہ اس جہاد مقدس میں آگے تھا اس کام کے لیے اپنی شادی کو چالیس سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ کبھی کبھی تو اس نے مجرد زندگی گزارنے کی ٹھکان لی۔

بے شک ہماری صدی نے عورت سے بدنصیوں کا ایک طومار واپس لے لیا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہو گئی کہ اسے نئی بدبختیوں کا تحفہ پیش کیا۔ کیوں؟ آیا عورت پابند ہے اسے دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی؟ یا وہ کسی کی پابند نہیں، اسے اختیار ہے، وہ اپنی پرانی بدنصیبیاں بھی دور کر سکتی ہے اور نئی بدبختیوں کو بھی روندنے کا

مجبور کر رہی تھی کہ سرمایہ دار عورت کے وجود سے فائدہ اٹھائے۔ اس مرحلے میں عورت کو استعمال کرنے کا انداز کچھ اور تھا۔ اب عورت جسمانی قوت، کام کرنے کی صلاحیت، معمولی کاری گریا پیداوار میں مرد کا شریک مساوی کی حیثیت سے نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی جاذبیت، مقناطیسی کشش، فکر و خیال کو قابو میں لانے کی قوت، ارادے بدل دینے کی طاقت اور کرامت رہن رکھنے، آبرو بیچ ڈالنے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کا زاویہ سامنے آیا۔ اب پیداوار، صارف کے سر تھوپنے کی بات تھی۔ موٹی سی بات ہے اس کا دوبارہ کے لیے۔ آزادی اور مساوات مرد و زن۔ کارآمد مہم تھی۔

سیاست بھی اس عامل کو استعمال کرنے سے غافل نہ تھی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے قصے آپ بھی پڑھتے اور دیکھتے ہوں گے۔ یہ سب عورت کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی مہم ہے۔ اور مرد اپنے مختلف مقاصد کے لیے اسے استعمال کر رہے ہیں مگر آزادی و مساوات کے پردے میں۔

ظاہر ہے۔ بیسویں صدی کا جوان اس قیمتی لمحے سے غافل نہیں۔ شادی کے بارے میں وہ خاندانی رسم و رواج سے فرار کرنا چاہتا تھا اور مفت، کٹم قیمت، سکس کار، ہاتھ آئے تو اسے خسارہ کیا ہے۔ جوانوں نے عورتوں کی آزادی و مساوات کی خاطر اس کی مطلوبیت اور حقوق تلفی پر سب سے زیادہ مگر مچھ کے آئو بہائے۔ وہ اس جہاد مقدس میں آگے تھا اس کام کے لیے اپنی شادی کو چالیس سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ کبھی کبھی تو اس نے مجرد زندگی گزارنے کی ٹھکان لی۔

بے شک ہماری صدی نے عورت سے بدنصیبوں کا ایک طومار واپس لے لیا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہو گئی کہ اسے نئی بدبختیوں کا تحفہ پیش کیا۔ کیوں؟ آیا عورت پابند ہے اسے دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی؟ یا وہ کسی کی پابند نہیں، اسے اختیار ہے، وہ اپنی پرانی بدنصیبیاں بھی دور کر سکتی ہے اور نئی بدبختیوں کو بھی روندنے کا

اختیار کھتی ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ عورت پر کوئی جبر نہیں ہے۔ پرانی بد نصیبیاں تو اس علت سے پیدا ہوئیں کہ عورت کا انسان ہونا بھلا دیا گیا تھا اور نئی بد بختیاں اس سبب سے پیدا ہوئیں کہ عورت ہونا اس کی طبعی، فطری، ذمہ دارانہ حیثیت، مرکزیت، اندرونی تقاضے، خصوصی صلاحیتیں طاق نسبیاں پر رکھ دی گئیں۔

عجیب بات ہے، جب مرد و عورت کے فطری اور طبعی اختلاف کی بات چھڑتی ہے تو ایک گروپ اے عورت کے نقائص اور مرد کے امتیازات کا قصہ لے بیٹھا ہے آخر کار عورت کی محرومیوں اور مرد کی کامرانیوں پر تان ٹوٹتی ہے۔

محرومی و کامیابی، نقص و کمال کہ مسئلہ نہیں، کارخانہ قدرت نے ایک کو ناقص دوسرے کو کامل، ایک کو کامیاب و کامران دوسرے کو محروم و ناکام نہیں پیدا کیا۔

یہی گروپ اس منطقی و فلسفی مفروضے کے بعد کہتا ہے۔ اچھا، فطرت نے تو غور پر یہ ظلم ڈھا دیا، وہ ناقص و کمزور پیدا ہوئی، تو کیا ہم بھی ایک نیا سبب نہیں اور ظلم پر ظلم کا اضافہ کریں؟ اگر غور کی طبعی حالت کو بھلا دیں تو کیا زیادہ انسانی عمل نہیں ہوگا؟

آفاقاً معاملہ برعکس ہے۔ عورت کی فطری و طبعی وضع سے بے توجہی اس کے حقوق پائمال ہونے کا بڑا سبب بنی۔ گریمر و محاذ لگائے اور عورت سے کہے: ہم تم برابر۔ کام کاج، ذمہ داریاں، فائدے، نتائج، سزائیں سب ملتی جلتی ہوں گی۔ بھاری اور مشکل کاموں میں شریک رہو، برابر کھڑی ہو، اپنی طاقت کے مطابق کام کرو اور اسی کی بنیاد پر مزدوری۔ ہم سے احترام و نگہداشت کی توقع نہ رکھو۔ اپنے روزمرہ اخراجات خود مہیا کرو۔ اولاد کے اخراجات میں اپنا حصہ دو۔ خطرے میں اپنی حفاظت خود کرو۔ ہم تم خرچ کرتے ہیں تم ہم پر اپنے پیسے خرچ کرو۔ تو عورت، معرکے میں پھنس جائے گی کیونکہ اس کی قوت کار کردگی طبعی طور پر کم، اور روپے کا خرچ زیادہ ہے۔ ماہواری

دُک نہ نہ حمل کی بے چینی، وضع حمل کی سختی، شیرخوار کی دیکھ بھال، عورت کو ایسی صورت میں سے دوچار کرنے والی چیزیں ہیں جہاں اسے مرد کی سربراہی دے رکھی ہوئی۔ ذمہ داریاں اور آمدنی زیادہ چلے ہے۔ یہ سب کچھ انسان ہی میں نہیں، جوڑے جوڑے زندگی بسر کرنے والے ہر جاندار کا معاملہ یہی ہے۔ تمام حیوانات میں غریبہ و فطرت کے زیر اثر مادہ کی حمایت نر کا فریضہ ہے وہ مادہ کی حفاظت پر کمر بستہ و حملہ آور رہتا ہے۔

مرد وزن کی طبعی و فطری ساخت کو سامنے رکھا جائے۔ انسان ہونے میں مساوی سمجھا جائے۔ انسانی حقوق کو مشترک مانا جائے، تو ”عورت“ کو نہایت مناسب مقام مل سکتا ہے، ایسا مترتبہ جہاں نہ اس کی ذات کچلی جائے نہ اس کی شخصیت کو نقصان پہنچے۔ زن و مرد کی فطری و طبعی حیثیت کو فرو موٹ کر کے، اور صرف آزادی و مساوات پر اکتفا کریں۔ نتائج سے آگاہی کے لیے کچھ اخباری جائزہ دیتے ہیں، اور یہ جائزہ بھی ان کا جو ہم سے پہلے اس راستے سے گزرے بلکہ منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ دیکھیے وہ کیا کہتے اور کیا کہتے ہیں!

رسالہ ”خواندنیہا“ شمارہ ۷۹، ۳۲۲، ۴، تیسرا ماہ ۱۳۵۳ ش (مطابق جولائی ۱۹۷۴ء) ماہ نامہ ”شہربانی“ کا مقالہ ہے۔ ”سرگزشتہای از زنان کا رگرو جامعہ امریکا“ امریکی معاشرے میں محنت کش عورتوں کی سرگزشت۔ رسالہ ”کرنٹ“ کے مضمون کا ترجمہ۔

مقالہ پڑھنے کے قابل ہے، شروع میں ایک خاتون کا درد دل نقل ہے، نینرز و مرد کی مساوات کا تذکرہ اور ان رعایتوں کا بیان جو گزشتہ زلزلے میں مزدور عورتوں کو دی جاتی تھیں۔ مثلاً:-

۱۔ ہونڈ سے زیادہ وزن نہ اٹھائیں جبکہ مردوں کو یہ رعایت حاصل نہ تھی۔

۲۔ آج عورت اس رعایت سے محروم ہے۔ صوبہ اہایو کی ورکشاپ ”جنرل موٹر“۔

عورتوں کی سزا کا مرکز کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ڈھائی ہزار خواتین یہاں کام کرتی ہیں۔

یہ خاتون ایک بڑے گیس پلانٹ کی دیکھ بھال پر متعین اور کبھی انھیں ایک بھٹی کی صفائی کرنا پڑتی ہے یہ فولادی بھٹی ۲۵ پاؤنڈ کی ہے جسے قوی ہیکل مرد نے سیٹ کیا ہے۔ خاتون زیر لب کہتی ہے۔ میں اندر سے چورا چورا اور باہر سے زخمی ہوجی ہوں..... میرا کام تھا کہ ہر لمحہ ایک ہتھوڑا اٹھاؤں جس کا طول پچیس سے پچاس انچ تک اور وزن پینتیس پاؤنڈ، یہ ہتھوڑا ایک کلنٹے میں لٹکانا پڑتا تھا۔ میرے ہاتھوں پر ہمیشہ گرم اور ہڈیوں میں درد رہنے لگا۔

مضمون میں ایک اور خاتون کا درد دل، پریشانی و بے چینی کی داستان ہے۔ اس کا شوہر بحریہ میں قلی تھا۔ ایک مرتبہ بحریہ کے افسر علی نے مردانہ جہاز میں کچھ عورتوں کی بھرتی کا اعلان کیا.... لکھتی ہے، ان دنوں بحریہ کے ایک جہاز میں چالیس عورتیں اور چار سو اسی مرد دیوٹی پر بھیجے گئے۔ جب یہ جہاز اپنے پہلے مخلوط سفر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ قلیوں کی بیویوں کا خوف و ہراس بے جا نہ تھا کیونکہ انھیں تھوڑی سی مدت میں معلوم ہوا کہ یہاں خالی خولی عشق کی داستانیں ہی نہیں بلکہ ہر عورت کئی کئی اشخاص کے ساتھ جنسی آمیزش میں ملوث ہوتی ہے۔

مقالہ نگار لکھتا ہے۔ ”فلورائیڈ میں آزادی کے بعد بیوہ عورتوں کو عجیب پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہاں قانون کے مطابق ہر بیوہ کو پانچ سو ڈالر تک ٹیکس معاف تھا، ایک بج ”ٹامس ٹاؤن“ نے اس قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اور کہا کہ یہ قانون مردوں کے حق میں مدافعت کرتا ہے (اور صرف عورتوں کو رعایت دیتا ہے)

آگے لکھتا ہے: ”منر میک ڈانلڈ کے ہاتھوں میں سوزش (جلن) تھی، منر اسٹون (جن کے شوہر قلی تھے) اضطراب اور تشویش سے دوچار ہوتی ہے، صوبہ فلورائیڈ میں بیوہ عورتوں پر نقد جبر مانا ہوا ہے۔ اب ہر ایک آزادی کا مزہ چکھے گی۔ بہت لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آ رہا ہے کہ خواتین نے جن حقوق سے فائدہ اٹھایا تھا کیا اس سے زیادہ نقصان برداشت نہیں کر رہی ہیں؟ خیر یہ بحث بے فائدہ ہے کیونکہ کھیل شروع

ہو چکا تھا۔ شائی اپنی اپنی کرسیاں حاصل کر کے بیٹھ چکے اب کی سال طے ہوا ہے کہ امریکہ کے آئین کا ستائیسواں "ترمیم شدہ پیرا گراف" منظور ہو جس کے مطابق جنسی اختلافات کی ہر برتری خلاف قانون قرار پائیں۔ اور یوں ان بیانات کی تصدیق ہو جائے ہو۔ رورڈیو نیورسٹی کے استاد قانون رسکو باؤنڈ نے دیے تھے۔ "امریکہ میں عورتوں کی آزادی عورت کے قانونی خصوصیات کی بنیاد پر فوسسٹناک نتائج کا باعث ہے۔ کیرولین شمالی کے سینٹر "جی ایروین" نے امریکہ کے معاشرتی مطالعے کے بعد تجویز رکھی تھی خاندان سے متعلق قوانین مکمل طور پر بدل دیے جائیں۔ اب مرد کو قانونی طور پر خاندان کے اخراجات کا ذمہ دار نہ ہونا چاہیے۔

یہ رسالہ لکھتا ہے۔ "منزخانہ میکڈانلڈ" کے بقول، ایک قانون بھاری بوجھ اٹھانے کی وجہ سے سیدن خون کی ککایت میں مبتلا ہے۔ ہم اپنی پرانی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مرد عورتوں سے عورتوں کا سلوک کریں، مزدور جیسا نہیں۔ آزادی نسوان کے حامیوں کی نظر میں یہ بات بہت معمولی ہوگی کہ اپنے شاندار ڈرائیونگ روم میں بیٹھ کر کہیں۔ عورت مرد برابر ہیں۔ ان حضرات نے اب تک کا رخاؤ کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ انھیں خبر نہیں کہ اس ملک کی اکثر مزدور خواتین کا رخاؤں میں کام کرتے کرتے جان پر کھیل رہی ہیں۔ ہمیں یہ برابری نہیں چاہیے، ہم سے مردوں کے کام نہیں ہوتے۔ مرد جسمانی لحاظ سے ہم سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اگر یہ طے ہو جائے کہ ہم ان کے مقابلے میں کام کریں اور ہمارے کام کا ان کے کام سے موازنہ ہو، تو ہم اپنی حد تک مستعفی ہیں۔ صوبہ ہائیوڈ میں مزدور دن نے قانون تحفظ حقوق سے جو کچھ پایا ہے، اس سے زیادہ کھویا ہے۔ ہم نے اپنی نسوانی شخصیت ضائع کر دی۔ ہمیں آزادی کے بعد نہیں معلوم کہ فائدہ کیا ہوا۔ ہو سکتا ہے گنتی کی چند عورتوں نے بہتر حالات دیکھے ہوں لیکن ہم بہر حال ان میں نہیں ہیں۔"

یہ تھا اس مقالہ کا خلاصہ۔ مضمون کے اندراجات سے صاف نظر آتا ہے کہ خواتین "آزادی و مساوات" کے نام سے جن مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئیں اس کے نتیجے میں انہیں ان دونوں لفظوں سے چڑھ ہو گئی۔ وہ بھول میں ہیں ان دونوں لفظوں کا گناہ کوئی نہیں۔ زن و مرد، دو الگ الگ مداروں کے دو ستارے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے مدار اور اپنے اپنے دائروں میں گردش کرنا چاہیے۔

"لا الشمس لها ان تدرك القمر....." سورج کو حق نہیں کہ چاند پر جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے جاسکتی ہے ہر ایک اپنے اپنے فلک میں گردش کر رہا ہے۔ "مرد و زن کی اصل سعادت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں دو جنس رہ کر اپنے اپنے دائرہ کار میں سفر جاری رکھے۔ آزادی و برابری کا فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا جب ہر ایک اپنی فطری و طبعی راہ پر چلتا رہے۔ معاشرے میں خلفشار پیدا ہونے کا سبب فطرت و طبیعت کے فرمان سے سربا بی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔ "نظام حقوقِ خواتین، اہلاندان اور معاشرے میں ہم مدعی ہیں کہ یہ مسئلہ اس کا مسئلہ ہے اور اس پر نئے سے نئے نظر کرنا چاہیے۔ گزشتہ اقدار پر اکتفا نہ کی جائے، از سر نو اقدار دریافت ہوں۔ اس بارے میں سب سے پہلے طبیعت و فطرت کو رہنما اصول بنائیں۔ دوسرے مرحلے میں گزشتہ اور موجودہ صدیوں کے تلخ و شیرین تجربے سامنے رکھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت تحریکِ حقوقِ خواتین صحیح معنی میں کامیاب طور پر آگے بڑھ سکے گی۔

○
قرآن کریم۔۔۔ دوست، دشمن دونوں کے نزدیک "حقوقِ خواتین" کا احیاء

لہ سورہ یس کی چالیسویں آیت ہے: "لا الشمس ينبغي لها ان تدرك القمر ولا الليل سابق النهار وكل في فلك يسبحون"

کرتے والا۔ مخالفین کم از کم اتنا تو اقرار کرتے ہی ہیں کہ زمانہ نزول میں قرآن نے "خواتین کے فائزے" اور حقوق انسانی کے بے بڑے بڑے اقدام کیے۔ لیکن قرآن مجید انسان کے عنوان سے "احیاء زن" اور اسے مرد کی شریک انسانیت و حقوق انسانی کے نام عورت کے عورت ہونے اور مرد کے مرد ہونے کو طاق نسیاں کے سپرد نہیں کیا۔
دوسرے لفظوں میں :-

قرآن مجید نے عورت کو اسی زاویے سے دیکھا جو اس کی جبلت و طبیعت کا زاویہ ہے۔ لہذا فرمان قرآن فرمان طبیعت میں ہم آہنگی ہے۔ قرآن میں جو عورت ہے وہی عورت طبیعت میں ہے۔ اللہ کی یہ دو بڑی کتابیں - ایک کتاب تکوین دوسری کتاب تدوین - ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔

مقالات کے اس سلسلے میں اگر کوئی مفید بات دکھائی دے گی تو وہ اسی مطابق و ہم آہنگی کی توضیح ہوگی۔



محترم ناظرین کے سامنے مقالات کا ایک مجموعہ ہے جو ایک خاص موقع پر درج شدہ ۴۵ مطالبہ ۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے "رسالہ زن روز" کے لیے لکھے گئے تھے۔ موضوع تھا "قانون سزا میں خواتین" (زن در حقوق اسلامی)۔ مقالات نے بڑی مقبولیت حاصل کی جن حضرات کو گذشتہ معاملات سے رابطہ نہیں یا اس ماجرے میں موجود نہ تھے، ان کو سیرت ہوگی۔ یہ مقالات پہلی مرتبہ اس رسالے میں چھپے تھے !
میں نے مقالات کے اس سلسلے کے لیے اس رسالے کو کیسے منتخب کیا؟ وہ رسالہ بھی جس چھاپنے کے واسطے کیونکر آمادہ ہوا؟ اس بنا پر "شان نزول" مقالات کا تہا نامہ ہے۔

درج شدہ خورشیدی (۱۹۶۶ء) میں "قوانین مدنی" کا "حقوق خانوادگی" بدلا ہوا

والا تھا، رسائل کی سطح پر، خصوصاً، خواتین کے رسائل مسئلے کو لے اڑے، چونکہ اکثر تجاویز جوتھے وہ کھلم کھلا آیات قرآن کے برعکس تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانانِ ایران میں بے چینی دوڑ گئی۔ مرحوم ابراہیم مہدوی زنجانی، حج اس ہنگامے میں سب سے زیادہ خاک اڑا اور گرمی دکھا رہے تھے۔ موصوف نے چالیس نکاتی منشور ”تیار کیا، اور مجلہ ”زن روز“ میں شائع کیا۔ مذکورہ رسالے نے جدول دار صفحات میں۔ اس دور کی زبان میں ”کوین“ بنا کر۔ چھاپا، اور اپنے پڑھنے والوں سے ان نکات پر رائے طلب کی۔ ادھر قانونی منشور لکھنے والے نے مخالف رائے دینے والوں کا جواب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ انہی دنوں، تہران کے ایک عالم جلیل و محترم نے مجھے ٹیلیفون کیا ادارہ کیمھان و ادارہ اطلاعات کے مدیر حضرات سے انھوں نے ملاقات کی اور ان دونوں اداروں سے نکلنے والے زمانے رسائل میں جو مضامین چھپے ہیں۔ ان پر اظہار خیال فرمایا۔ دونوں حضرات نے کہا کہ اگر آپ رائے دیں تو ہم اسے بعینہ چھاپنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ موصوف محترم نے واقعہ بیان کرنے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اگر وقت اور فرصت اجازت دے تو یہ کام انجام دوں۔ یعنی ہر شمارہ پڑھوں اور ضروری نوٹ لکھوں۔ میں نے کہا کہ اگر میری بات پر اسے میں جوابی حاشیہ نہ لکھا جائے تو میں تیار ہوں لیکن جناب مہدوی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ رسالہ ”زن روز“ میں اپنے چالیس نکات کی حمایت کے سلسلے میں اسی رسالے کے لیے مقالات لکھیں گے، میں بھی تیار ہوں کہ اسی مجلہ میں مقابل کے صفحے پر بحث کروں یوں دونوں نظریوں کے دلائل افکار عوام کے سامنے آجائیں گے۔

موصوف مکرم نے کچھ دن کی مہلت مانگی، وہ ان لوگوں سے دوبارہ رابطہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مجھے ٹیلیفون پر اسے کی طرف سے میری پیش کش منظور ہونے سے مطلع فرمایا۔ اس واقعے کے بعد میں اس رسالے کو خط لکھا جس میں

”قوانین مدنی“ جہاں تک فقہ اسلام کے مطابق ہوں گے میں ان کا دفاع کروں گا۔ مگر میری
 پنجاب مہدوی کے مقالات آمنے سامنے اور برابر برابر اسی رسالہ میں شائع ہوں۔ ضمنی
 طور پر یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مجاہد کو میری تجویز منظور ہے تو میرا اصل خط مع علامت منظوری
 رسالے میں شائع کر دیں۔ رسالے نے یہ بات منظور کر لی اور متین خط شمارہ ۸۷، مجریہ
 ۸/۷، ۲۵/۵ ش ۲۹، اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں چھاپ دیا، اور میرا پہلا مضمون شمارہ
 نمبر ۸۷ میں شائع ہو گیا۔

مطالعات کے دوران ”حقوق زن“ پر مہدوی صاحب کی کتاب پڑھ چکا اور ان کی
 منطق و نظائریے باخبر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے بذاتہ ”اسلام میں عورت کے حقوق“
 کے موضوع سے گہری دل چسپی تھی اور بہت سی یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ مہدوی
 صاحب کے مقالات اور یہ مقالات آمنے سامنے چھپنے لگے۔ ظاہر ہے میں نے بات دینے شروع
 کی جہاں سے موضوع نے بات چھیڑی تھی۔ ان مقالات کے سلسلے نے موصوف کو سخت مشکل
 میں ڈال دیا۔ ابھی چھ ہفتے سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور جوا
 نویسی سے فراغت مل گئی۔ ان چھ ہفتوں میں یہ مقالات اپنی راہ نکال چکے تھے۔ دل چسپی
 رکھنے والے حضرات نے مجھ سے اور مجاہد سے مقالات کے سلسلے کو براہ راست جاری رکھنے
 کا مطالبہ کیا۔ اور میں اس خیال سے متفق ہو گیا۔ اور تینتیس قسطوں تک یہ سلسلہ جاری رہا
 ان مقالوں کی تحریر کا یہ پس منظر تھا۔

میرے پیش نظر جو مسائل تھے ان میں سے کچھ مباحث ان تینتیس مقالوں میں لکھ سکے،
 اس سے زیادہ مقالے لکھنا باقی ہیں۔ لیکن میں اپنی تھکن اور مصروفیات کی بنا پر انہیں لکھنے
 و مرتب کرنے سے رکھا رہا۔ اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کا مطالبہ اس وقت سے

اب تک ہی رہا کہ انھیں دوبارہ کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ میں وقت کا منتظر تھا کہ اس کام کو مکمل طور پر اسلام میں عورت کے حقوق کے نام کیجا چھپواؤں، لہذا مکرر اشاعت پر تیار نہ ہوا۔ آخر کار جب یہ محسوس ہوا کہ اب مجھ سے خود مجھے یہ امید رکھنا یہ نہیں تو جو کچھ موجود تھا، اسی کو کافی سمجھا۔

سلسلہ معاملات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان کی سرخیال :-
نواستگاری (منگنی) - ازدواج موقت (متعہ) - عورت اور معاشرتی استقلال
اسلام اور زندگی میں جدیدیت - قرآن میں عورت کا درجہ - حیثیت و حقوق انسانی
- خاندانی حقوق کی طبیعی بنیادیں - زن و مرد میں فرق - مہر و نفقہ - میراث - طلاق
- تعدد ازواج -

جو مسائل رہ گئے اور یادداشتیں تیار ہیں :-
خاندان میں مرد کا حق حکومت - حق پرورش اولاد - عذہ اور اس کا فلسفہ -
عورت اور اہتمام و فتویٰ - عورت اور سیاست - عورت عدالتی ضوابط - عورت
اور سزا کے دستور - عورت کے اخلاق و تربیت - عورت کا لباس - جنسی اخلاق
- غیرت - عفت - حیا وغیرہ - ماں کے مراتب - عورت اور باہر کے کام کاج - نینر
دوسرے معاملات -

اگر خدا نے توفیق عنایت فرمائی تو یہ حصہ بھی جمع و تدوین کے بعد جلد دوم کی صورت میں پیچھے اور شایع ہوگا -
میں اللہ سے توفیق و ہدایت کی دعا کرتا ہوں -

۲۸ شہریور ماہ ۱۳۵۲ھ ہجری شمسی

مصدق ۲۰ رمضان مبارک ۱۳۹۲ھ ہجری قمری

(۱۹ ستمبر ۱۹۷۴ء)

مرضی مطہری

پیش گفتار :-

- — عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات
- — آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں۔
- — تاریخ کا جبر۔
- — ایرانی معاشکریں مذہبی رجحانات۔

خلاصہ از مؤلف

مجھے خوشی ہے۔ رسالہ "زینِ روز" نے میری خواہش قبول کی اور رسالے میں شائع شدہ، عائلی قوانین کے بارے میں چالیس نکاتی منشور پر میرے ان مقالات کو شائع کرے گا جو "قانون مدنی ایران" میں ترمیم و ترمیم سے مربوط ہیں۔ میں نے ایک خط میں اپنی آمادگی کی جو شرط لکھی تھی، رسالے نے خط کی اشاعت کے ساتھ اسے منظور کر لیا ہے۔

میں یہ موقع غنیمت سمجھتا ہوں، اس طرح میں اسلام کے فلسفہ معاشرہ کا ایک گوشہ جوانوں کے سامنے لاؤں اور ان کے ذہن میں یہ بات واضح کروں کہ اسلام خاندانی (عائلی) روابط کے مسائل پر کیا روشنی ڈالتا ہے۔

میں نے اپنے خط میں یاد دلایا ہے، میں "قانون مدنی" کا دفاع کرنا نہیں چاہتا نہ یہ کہنا ہے کہ وہ قانون جامع و کامل و مکمل اور سو فی صد قانون اسلام اور صحیح معاشرتی اقدار کے مطابق ہے۔ بلکہ مجھے بھی اس پر اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ نیز میں اپنے عوامی اکثریت کا رویہ بھی صحیح و مطابق انصاف نہ جاننے کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ان باتوں کے برخلاف خاندانی تعلقات میں بد نظمی و سبکی بہر حال دیکھ رہا ہوں، اور اس سلسلے میں اساسی ضمانت کا قائل ہوں۔

"کتاب اتقادر قوانین اساسی و مدنی" اور "بیان مقدس یا مشاق ازدواج"

۱۔ منوچہریاں، بانو مہر نگین۔ "اتقادر قوانین اساسی و مدنی، ایران"۔

۲۔ زنجانی، ہریم ہمدوی۔ "بیان مقدس یا مشاق ازدواج"

نام بتاتا ہے کہ مصنف عیسائی فکر سے متاثر ہے اور اسلام کے فلسفے کو نظر انداز کر رہا ہے۔

میں مصنف کی طرح پرانی مردوں کو سو فیصدی بری نہیں سمجھتا نہ ساری قانون مدنی کے ذمے لگاتا ہوں،
 میرے میں اصلاح کی ضرورت ہے، قانون مدنی کے دفاع کی ممکن تبدیلی نہ میرے نزدیک قانون مدنی
 کا نقصان عدم کے زیر ہونا کوئی عیب ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ قانون مدنی کے دفعات کی تبدیلی کے
 حدودہ صلاح کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ میں قوانین اسلام کے ان دفعات پر گفتگو کروں گا جس کا
 مقصد "مقوق زن و شوہر سے ہے اور ان کے روابط یا اولاد یا باہر کے افراد سے تعلقات
 پر نظر ڈالوں گا۔ جہاں جہاں اشارہ کیا اور ان کی تبدیلی کی تجویز رکھی گئی ہے میں ایک
 ایک نکتے کو ان مقالات میں زیر بحث لا کر ثابت کروں گا کہ یہ قوانین گہری نظر ڈالنے سے
 انسانی طبیعی و معاشرتی تقاضوں کے مطابق ہیں اور عورت و مرد کی حیثیت اور انسانی
 شرافت کا ان میں سناؤ رکھا گیا ہے۔ اگر ان پر عمل کیا جائے اور اچھی طرح افذ کیے جائیں
 تو خاندانی روابط میں خوبیوں کے ضامن ہیں۔

محترم پڑھنے والوں کی اجازت سے بحث میں داخل ہونے سے پہلے چند نکتے پیش

کرتے ہوں :-

عالمی روابط کے

بین الاقوامی مشکلات

خاندانی اور عالمی تعلقات کی مشکل کا حل آنا آسان نہیں

ہے کہ جیسے آج کل کے ٹریڈوں کو سوانامی دینے

پر ہے کہ انہیں پر کر دیں ایسے سمینار منعقد کیے جائیں جو ہم روزانہ دیکھتے سنتے رہتے ہیں

اور ان کی فکری سطح معلوم ہے۔ پھر یہ کہ ان مسائل کا حل ہمارے ہی ملک کا کام نہیں ہے

بلکہ اس کا بھی حل نہیں کر سکے ہیں، نہ کسی حقیقی حل کا کسی نے دعویٰ کیا ہے۔

فریڈ ڈیورنٹ "تاریخ تمدن پر مشہور فلسفی و مصنف کہتا ہے : فرض کریں ہم مسئلہ

میں ایک اور بی بی کیوں کیا جائے۔ مترجم۔

ہیں ہیں۔ اور علوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول سے بڑا واقعہ کیا ہوا تھا؟ اس وقت ہمیں اندازہ ہوگا کہ وہ واقعہ جنگ یا انقلاب روس نہیں، بلکہ بڑا واقعہ خواتین کی وضع میں تبدیلی ہے۔ ایسا جھٹکا لگانے والا واقعہ اور وہ بھی مختصر سی مدت میں تاریخ نے بہت کم دیکھا ہوگا۔ ہمارا مقدس گھر ہو ہمارے معاشرتی نظم و ترتیب کا بنیادی پتھر تھا درہم برہم ہو گیا۔ میاں بیوی کا وہ رویہ نہ رہا جو ہوس رانی اور انسانی ہیت کی تبدیلی کے لیے رکاوٹ تھا۔ وہ سچیہ خداقی ضابطے ختم ہو گئے، جنہوں نے ہمیں جنگی زندگی سے تمدن و آداب معاشرت سے آگاہ کیا تھا۔ اور اب کھلم کھلا ہم اس خدائی کو چھوڑ کر اپنے عالم میں منتقل ہو چکے ہیں۔ جہاں زندگی کی صورت و شکل اور نکر و زہن سب کچھ ایک شکنجہ میں نے۔

خاندانی نظم و نسق کی ہرادی، ازدواجی رشتہ کی کمزوری، جوانوں کا شادی کے بوجھ اٹھانے سے قرار۔ مادری رشتے سے نفرت۔ اولاد سے ماں باپ کے رابطے کی نا استواری خصوصاً مادری تعلق کا انقطاع، آج کی عورت کا شرف سے دست بردار ہو کر گھٹیا قسم کی عشق بازی پر اتارنا۔ روز افزوں شلاق کا زور۔ میاں بیوی میں خلوص و محبت کی اپنی اس صدی کے آخری ربع میں بڑے زور و شور کے ہنگامے اور فریادیں سنائی دے رہی ہیں۔

آزاد رہیں
یا منوب کی تقلید کریں!

افس کی بات ہے۔ کچھ بے خبر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھیر و زندگی کے مسائل آہی ہیں جیسے ٹیکسی بس، ٹریفک کنٹرول، وائپر

بجلی کی این کا کام۔ مدت ہوئی یورپ میں ختم و آسان ہو چکا ہے اسی طرح یہ مسائل بھی ہماری نالائقی کی وجہ سے حل نہیں ہوئے۔ میں یورپ کی تقلید و پیروی کر لینا چاہیے۔

دراصل یہی خیالی ہے۔ یورپ والے ان مسائل میں زیادہ مجبور، زیادہ جکڑے ہوئے ہیں ان کے سمجھ دار لوگ بری طرح سے پیچ رہے ہیں۔ تعلیم نسوان کے مسائل سے لے کر مذہب و ملت میں ان مغرب کی پریشیاں ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور گھریلو خوش نصیبی جس نصیب ہی نہیں ہے۔

تاریخی جبر

کچھ لوگ سمجھتے ہیں، گھریلو زندگی میں بدظمی و کمزوری اور اندرونی زندگی و دو تباہی کا باعث عورت کی آزادی ہے، اور خواتین کی آزادی نتیجہ ہے، علم و تمدن کے فروغ، اور صنعتی ترقی کا۔ یہ ایک تاریخی جبر ہے جسے برداشت کرنا پڑے گا۔ بد نظمی اور پرانے زمانے کی خاندانی خوش حالی سے رخ موڑنے پر تیار ہونا چاہیے۔ اگر ہماری یہ سوچ ہے تو بڑی سطحی اور گھٹیا سوچ ہے۔ ٹھیک ہے، صنعتی زندگی ہر گھریلو تعلقات پر اثر انداز ہوئی ہے اور یہ اثر پڑتا رہے گا۔ لیکن یورپ کے اندر خاندانی روابط کی ٹوٹ پھوٹ میں دو اور چیزوں کا دخل ہے۔

ایک وہ رسم و رواج جو ظالمانہ قانون اور جاہلانہ ضابطوں کے طور پر اس صدی سے پہلے ان کے یہاں رائج تھے، اور انھیں بالادستی حاصل تھی، حد یہ ہے کہ عورت ہی مندرجہ مالکیت کے حق سے انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل میں بہرہ مند نہیں ہوئی۔ اور یہی اسے مالک ماننے کا زمانہ اب آیا۔

دوسری بات اصلاح احوال کی ہے۔ جو لوگ خواتین کے مسائل میں بہتری کے لئے کوشش کر رہے ہیں وہ ایسی راہ چلے جو آج کل ہمارے روشن خیالوں نے اختیار کر رکھی ہے۔ ورنہ اس کا نمونہ چائیس نکاتی قانونی منشور یا مسودہ ہے۔ یہ لوگ خاتون کی

بھویں بنانے سنوارنے اٹھے اور اس کی آنکھیں پھوڑ بیٹھے۔

مشیخی زندگی کی ذمہ داری سے زیادہ ذمہ داری اور اس تباہی بربادی کا بوجھ یورپ کے پرانے قوانین اور پھر جدیدیت پرست لوگوں پر ہے جنہوں نے نئے اصلاحات کا ڈھونگ رچا یا لہذا ہم مشرق کے رہنے والوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم بھی اسی راستے پر چلیں جو راہ وہ چل چکے ہیں اور جس دلدل میں وہ پھنسے ہم بھی پھنسیں۔ ہمیں یورپی زندگی کا مطالعہ بری ہوشیاری سے کرنا چاہیے۔ علوم صنعت تکنیک اور معاشرتی ضابطے جو بھی قابل آسائش ہوں، انہیں فوراً دیکھیں۔ انہیں قبول کرنے، ان کی تقلید کرنے اور ان کے رسم و رواج اور قانون قاعدوں کو اپنانے میں ان ہزاروں بد نصیبوں پر بھی نظر رکھیں جس سے اہل یورپ دوچار ہیں۔ خود قانون مدنی ایران، اور گھریلو تعلقات پر یورپ کے قوانین کا انطباق بھی قابل امتیاط ہے، ہم کو اہل یورپ کی تقلید سے بہت احتیاط کرنا چاہیے۔

اساسی قانون اور ہم :

۲۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تجاویز فائدہ مند نہیں، اور نفسیاتی، طبیعی و معاشرتی تقاضوں سے ان کا جوڑ بھی نہیں۔ تفصیل آگے لکھیں گے۔ خود اساسی قانون کے ان کی تطبیق کیسے ہوگی؟ دستور میں تو یہ ہے کہ۔ جو قانون شریعتِ اسلام کے خلاف ہوگا اسے "قانونیت" ہی حاصل نہ ہوگی۔ وہ اسمبلی میں پیش ہی نہیں ہو سکتا اور ان تجاویز کے اکثر دفعات، واضح طور پر مخالف قانونِ اسلام ہیں کیا مغرب کے باشندے اسی طرح اپنے آئین سے کھیلنے میں جیسے ہمارے مغرب زدہ ان کی مذہبی تقلید میں ان کے پیچھے دوڑ لگانا چاہتے ہیں؟

مذہب سے قطع نظر ہر ملک کا قانون اساسی اس ملک والوں کے لیے مقدس ہوتا ہے۔ ایران کا قانون اساسی بھی ہم ملت ایران کے لیے قابل احترام ہے۔

کون سا مذہب دینیار، سواناموں کی اشاعت، اور اسمبلی کے ممبروں کی اٹھک بیٹھک سے
توکلن اسامی کو رونداجا سکتا ہے؟

ایرانی معاشرے کے مذہبی رجحانات

۳۔ تجویزوں کے غیوب اور ان کی قانون اسامی
کے خلاف ہونے کو نظر انداز کرنے کے بعد،

ہر چیز کا انکار ممکن ہے مگر یہ بات جھٹلانی نہیں جاسکتی کہ ملت ایران پر جس حجاب
و ساس کا غلبہ و حکومت ہے ان میں سے سب سے بڑا جذبہ مذہبیت اسلامی ہے۔ ان
مردود سے چند کو چھوڑیے جنہوں نے سب کچھ چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چیز کی پابندی
سے آزاد اور ہر شور و شر کے طرفدار ہیں۔ ہمارے عوام کی اکثریت مذہبی اصولوں
کی پابند ہے۔

بیش بند کی کے باوجود، تعلیم اور تعلیم یافتگی سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ عوام اور
سلام کو الگ الگ کر دے۔ اس کے برعکس، جمیع قسم کی مذہبی تبلیغ کمزور ہونے
کے باوجود کابھوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ جوان مذہب کی طرف دن بہ
دن زیادہ مائل ہو رہے ہیں۔ حالانکہ استعماری طاقتیں مذہب کے خلاف زیادہ بڑا
پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے نفسیاتی ماحول میں۔ جو بہر حال بن چکا ہے۔ کیے
مردود ہوگا کہ رائج الوقت قانون ایسا بنایا جائے جو عوام کے نزدیک شریعت
سے مطابقت نہ رکھتا ہو؟ ایسے سوال نامے سے کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟
فرش کریں، غصے اور اختلاف کے نتیجے میں ایک عورت عدالت سے رجوع
کے شوہر کی رضا کے برعکس طلاق حاصل کر لیتی ہے۔ اور کسی دوسرے کے عقد
میں چلی جاتی ہے۔ رائج قانون کے مطابق وہ میاں بیوی کہلاتے ہیں، مگر ان کے

مذہبی وجدان کی گہرائی کو بھی دیکھیے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو غیر سمجھتے، وہ جنسی عمل کو غیر شرعی جانتے اور اپنی اولاد کو زنا زادہ اور مذہبی نقطہ نظر سے گردن زنی فرض کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں ذرا غور تو کریں کس قدر سنگین اور نفسیاتی لحاظ سے پریشان کن مشکل میں وہ گرفتار ہوں گے۔ ان کے مذہبی دوست اور رشتے دار، انھیں کس نظر سے دیکھیں گے؟ ہم وضع و قانون سازی کے ذریعہ لوگوں کے مذہبی احساسات کو نہیں بدل سکتے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے کثیریت بلکہ قریب قریب سب ہی لوگ مذہبی احساسات سے شہر و دیہات میں بندھے ہوئے ہیں۔

اگر آپ بیرون ملک سے کسی ماہر کو بلا کر مشورہ کریں، ان سے پوچھیں کہ ہم اس قسم کے قوانین وضع کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے عوام کا مذہبی ماحول یہ ہے، اور ان کے نفیث یہ ہیں۔ پھر دیکھیے وہ ایسے ماحول میں آپ کے حق میں رائے دیتا ہے؟ وہ یہ نہ کہے گا کہ یہ اقدام ہزاروں روحانی اور سماجی پریشانیاں پیدا کرنے کا سبب ہوگا؟

اس قسم کے قوانین کو، قوانین سزا سے مقابلہ غلط ہے۔ اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قوانین سزا کی ترمیم تین سو سال کا ایک حصہ متاثر ہوتا ہے اور اسی پر چوٹ پڑتی ہے۔ منحرف گروہ جبری ہو جاتا ہے۔ لیکن "میاں بیوی کے رشتے" اور اولاد کی نجی زندگی سے متعلق قوانین کی نوعیت یہ نہیں۔ اس سے فرد اور فرد کی نجی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بات براہ راست آدمی کے شخصی مذہبی جذبے سے جنگ ہے۔ اس طرح کے قانون یا اس لیے بے اثر ہو جائیں گے کہ مذہب مذہبی رجحانات کا غلبہ ہے۔ یا خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ان قوانین سے بدامنی پیدا ہوگی۔ پھر یا تو یہ قانون عملاً بے کار ہو جائیں گے، یا اندرونی وجدانی و نفسیاتی کانٹا کے بعد مذہبی طاقت کو کمزور بنادیں گے۔

آغازِ کتاب

پہلا حصہ:

نواستگاری

- — کیا مرد کی طرف سے نواستگاری، عورت کی توہین ہے؟
 - — مرد کی فطرت، طلب و نیاز۔ عورت کی فطرت جلوہ و ناز ہے۔
 - — مرد خریدار و سال ہے۔ عورت کا خریدار نہیں ہے۔
 - — حیثیت و احترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ اور نفسِ طریقیہ منگنی ہے۔
 - — قانون مدنی کے چالیس نکات کے مصنف کی غلط فہمی۔
- خلاصہ از مولف —

خواستگاری

ہم اپنی گفتگو کا آغاز ”چالیس“ نکات میں اسی نقطے سے کر رہے ہیں جو اس پیش بہاد میں حرفِ آغاز ہے، ”قانونِ مدنی“ کی ترتیب کے مطابق پہلی بات سے منگنی اور نام زدگی۔

باوجودیکہ قانونِ مدنی میں خواستگاری (منگنی) اور نام زدگی کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق براہِ راست اسلام سے نہیں ہے، یعنی ”نص“ اور صریح حکمِ اسلام اس سے مربوط تک نہیں پہنچا ہے اور قانونِ مدنی نے اس بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ اسلام کے قواعد کلیہ سے ایک استنباط و نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش ہے۔ اس بنا پر ہم ”قانونِ مدنی“ کے دفاع کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم تجویزیں پیش کرنے والے کے جزئیاتِ نظر سے بحث میں حصہ نہیں لیں گے حالانکہ تجویز کنندہ اس بارے میں بڑی بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ موصوف چند سادہ دفعات کے صحیح مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔

ہاں، دو مقصد ایسے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

کیا مرد کی طرف سے خواستگاری عورت کی توہین ہے؟

۱۔ تجاویز پیش کرنے والے کا بیان ہے :

”ہمارے قانون ساز نے موجودہ دفعاتِ درخواستگاری و نامزدگی میں بھی اپنے رجعت و غیر انسانی نکتے کو نہیں بھولا کہ مردِ اصل ہے اور عورت اس کی ضمن۔ اسی خیال کے زیر اثر دفعہ نمبر ۱۰۳۲ کو کتابِ نکاح و طلاق میں ”پہلی دفعہ قرار دیا اور یوں لکھا ہے۔“ دفعہ ۱۰۳۲ موانعِ نکاح سے خالی عورت کی خواستگاری ہو سکتی ہے۔“ آپ نے ملاحظہ فرمایا بموجب

دفعہ مذکور باوجودیکہ کوئی پابندی بیان نہیں کی گئی ہے۔ لیکن ”ازدواج“ کے معنی ہوتے ہیں، مرد کا ”عورت لینا“ مرد خریدار و مشتری تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے مقابل عورت کو ایک ”سودا“ ظاہر کیا ہے۔ ”معاشرتی قوانین“ میں ایسی تعبیر انتہائی ناگوار اور برے تاثرات پیدا کرتی ہے۔ قانونِ زوجہ میں زن و مرد کے تعلقات پر خاص طور سے برا اثر ڈالتی ہے۔ اس میں مرد کو ”آقای“ اور مالکیت، عورت کو مملوک یا کنیز کا درجہ دیا گیا ہے۔

اس گہری نفسیاتی نظر کے بعد! تجاویز کے مرتبہ سے ”خواستگاری کے ذیل“ میں جو دفعات لکھے ہیں۔ ان میں ”خواستگاری“ کو خواتین اور مردوں کے لیے یکساں قرار دیا ہے۔ تاکہ ”عورت لینا“ جو ایک طرفہ بات ہے اسے ختم کر دیں۔ ”زن گرفتار“ کے مقابلے میں ”مرد گرفتار“ بھی ہونا چاہیے۔ یا پھر نہ ”عورت لینا“ کہا جائے نہ ”مرد لینا“۔ اچھا، اگر ”عورت لینا“ کہیں، یا لڑکی کا رشتہ مانگنا مرد کا فریضہ قرار دیں تو گویا عورت کی حیثیت گرا دی، اور اسے قابل خرید سودا بنا دیا۔

مرد کی فطرت طلب و نیاز عورت کی فطرت جلو و ناز

اتفاقاً بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ زیرِ نظر

تجاویز میں ”مہر و نفقہ“ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ مہر و نفقہ پر ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔ عہدِ قدیم سے مرد، عورت کے گھر جاتے اور لڑکی کا رشتہ مانگتے ہیں۔ یہ رسم حیثیت و احترام عورت کا بہت بڑا سبب ہے۔ فطرت نے مرد کو طلب و عشق و تقاضا کا منظر بنایا اور عورت کو مظلوم و مدعا، اور معشوق۔ عورت کو فطرت نے گل۔، مرد کو بلبل، عورت کو شمع، مرد کو پروانہ پیدا کیا۔ یہ حکیمانہ تدبیر و خفقت کا شاہکار ہے۔ یہ مرد کی طبیعت (غریزے) میں طلب و نیاز، اور عورت کے غریزے میں جلو و ناز

قرار دیا۔ عورت کی جسمانی کمزوری، مرد کی قوت جسمانی کے اس پہلو سے ہموار کر دی۔ عورت کا مرد کے پیچھے دوڑنا اس کے وقار و شخصیت کے خلاف ہے۔ مرد کسی عورت کے بارے میں منگنی کو جائے اور لڑکی والے رشتہ ٹھکرا دیں تو مرد برداشت کر سکتا ہے وہ دوسرے گھر اور وہاں سے تیسرے گھر جا کر درخواست کر سکتا ہے تا آن کہ اس کی درخواست قبول ہو۔ اور کوئی خاتون اس کی رفیق زندگی بننے پر تیار ہو۔ عورت جو محبوب و معنوی بن کر رہی ہو جا کر تھی، اور مرد کے دل میں جگہ حاصل کر کے مرد کے پورے وجود پر حکومت کرنا چاہتی ہے اس عورت کی فطرت میں یہ نہیں ہے کہ ایک مرد سے شادی کی درخواست کرے اور اتفاقاً نفی میں جواب سن کر دوسرے مرد کے سرخ میں نکلے۔

مشہور امریکی فلسفی 'وینیم جیمز' کے خیال میں: حیا اور حسین خود داری عورت کی فطرت میں نہیں ہے۔ حق کی بیباں پوری تاریخ سے یہ سیکھتی رہی ہیں کہ مردوں کے پیچھے نہ دوڑنے میں ان کی عزت و احترام ہے، وہ اپنے نہیں نہ گرائیں اور مردوں کی دسترس سے دور رہیں۔ عورتیں نے تاریخ سے یہ سبق سیکھا اور اپنی بیٹیوں کو یاد کرایا۔ جنس انسان ہی کی خصوصیت نہیں، دوسرے جانوروں کا رویہ بھی یہی ہے۔ نر کی جنس یا بندہ ہے کہ وہ جنس مادہ کے لیے نیاز و دیوانگی کا اظہار کرے۔ جنس مادہ کو فطرت نے پابند پیدا کیا ہے وہ اپنے حسن، دل کشی، لطف اور خود داری اور پر لطف بے نیازی کا اظہار کرے، اور سخت دل ہم جنس کو جتنا زیادہ ہو سکے، اپنے قابو میں لے، تاکہ وہ قلبی جذبات اور اپنے ارادہ و اختیار سے خدمت گزاری کے لیے تیار ہو۔

**مرد خریدار وصال ہے
عورت کا خریدار نہیں**

تعجب ہے۔ فرماتے ہیں:۔ قانون مدنی نے ایسا لہجہ کیوں اختیار کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ مرد عورت کا خریدار ہے؟۔ پہلے تو اس کا تعلق قانون مدنی سے ہے نہیں۔ یہ تو قانون تخلیق

سے متعلق بات ہے۔ دوسرے ہر خریداری، چیزوں کی مالکیت و ملکیت ہی کے لیے ہوتی ہے۔ ہنر دوست، ہنرور کا خریدار ہوتا ہے۔ کیا اس کی تعبیر ملکیت سے ہو سکتی ہے؟ اصل کا نام مالکیت رکھا جائے؟ اور عالم و صاحب فن کی حیثیت کے خلاف قرار دیں؟ یہ وہاں زن کا خریدار ہے۔ اس کی ذات کا کابک نہیں ہے۔ کیا سچ میچ آپ حافظہ شیریں شخص، حافظہ کو، اہانت جنس خواتین کا مجرم سمجھتے ہیں؟ وہ کہتا ہے:

شیراز معدن لب لعل است و کان حسن

من جوہری مفلس از آں روششم
شہریت پر کرشمہ و خوبان ز شش بہت

چیز نیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم
شیراز خزانہ لب لعلیں اور مرکز حسن ہے، وہ خود شیراز کا جوہری ہے، مگر مفلسی لے بنا پر تشویش ہے کہ شہر کی شش بہت میں حسین ہیں اور ناز و انداز۔ ہائے، اس کے پاس کچھ نہیں ورنہ وہ چھ کی چھ ستمیں خرید لیتا۔ حافظہ کو حسرت ہے، اس کے ہاتھ خالی ہیں ورنہ وہ سب کچھ مینوں پر قربان کر دیتا، ان کی نگاہ التفات حاصل کر لیتا۔ یہ مرتبہ شوش کی تو میں ہے؟ یا زندہ و جذبات دل میں عورت کے بندی مرتبہ کا اہلکار؟ کہ مردانگی و دیاری کے باوجود بارگاہ حسن و جمال خاتون میں عاجزی و انکساری کا اہلکار کر رہا ہے۔ خود نیاز مند اور اسے بے نیاز بنا رہا ہے۔

عورت کی ہنرمندی کی انتہا یہ ہے کہ وہ جہاں اور جس جگہ بھی ہے، مرد کو اپنے مستانے پر بندھے۔

عورت کو اپنے حقوق خواتین کے نام سے عورت کے کتنے بڑے اعزاز و شرف دے اس کی حیثیت کو دغا دے کیا جاتا ہے؟

یہی بات میں نے کہی تھی کہ محترم حضرات بے چاری عورت کی بھوؤں کو

آراستہ کرنے کے بہانے اندھا بنانا چاہتے ہیں۔

خشیت و احترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ و نفیس طریقہ منگنی ہے۔

میں نے عرض کیا، قانون تخلیق میں مرد کو منظر نیاز و طلب قرار دیا گیا ہے

عورت منظر مطلوبیت و جواب بنائی گئی ہے۔ یہی نکتہ، عورت کی شخصیت و احترام کی ضمانت مہیا کرتا ہے جو مرد کی قوت جسمانی کے مقابلے میں اس کی کمزور تخلیق کو متوازن کرتا ہے۔ اسی سے مشترک زندگی میں توازن و برابری پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ ایک قسم کا طبعی امتیاز ہے جو عورت کو عطا ہوا ہے اور ایک قسم کا تقاضا ہے خیمہ ہے جو مرد کے حوالے کیا گیا ہے۔

جب انسان قانون بنانا چاہیں۔ دوسری لفظوں میں جب قانونی انتظامات کی ضرورت ہو تو عورت کے اس امتیاز کو عورت کے لیے اور مرد کی اس ذمہ داری کو مرد کے لیے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ زن و مرد کی یکسانیت پر مبنی قوانین میں، ذمہ داری و ادب کے زاویے خواستگاری کا دستور۔ عورت کے نفع اور احترام کو نقصان نہ پہنچائے اور دونوں میں برابری کے معنی یہ ہیں کہ دونوں میں توازن رہے، چاہے دیکھنے میں مرد کی رعایت ہو لیکن درحقیقت طریقہ کی بھلائی پائی جائے۔

اس بنیاد پر چالیس نکات پیش کرنے والے نے جو دفعہ، عورت کو خواستگاری کا پابند کرتی ہے، بے وزن ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں اس سے انسانی معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔

اس پیرا گراف میں جس دوسرے نکتے پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ جناب مہدی

چالیس قانونی نکات مرتب کرنے والے کو قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی!

کی ایک غلط فہمی ہے۔ مومنوف نے، زن روز کے شمارہ نمبر ۸۶، صفحہ ۷۲ پر لکھا ہے:

”دفعہ نمبر ۱۰۳ کے بموجب جن دو کے درمیان رشتہ طے ہو جائے۔ اس بعد معقول سب کے بغیر اسے توڑ دیا جائے تو فرقی متقابل یا اس کے والدین یا تیسرے افراد نے رشتے کی بنیاد پر جو تحفے اور سوغاتیں دی تھیں، واپس کرنا ہوں گی۔ اور اگر اصل تحفے یا ہدیے اتفاقاً ضائع ہو گئے ہوں تو ان کی قیمت ادا کریں۔ مذکورہ دفعہ کی توضیح کے بعد۔ ہمارے قانون بنانے والے کی نظر میں۔ نامزدگی بھی وعدہ نکاح کی طرح قانونی طور پر مؤثر نہیں، نہ اسے اجراء کی ضمانت حاصل ہے۔ اور طرفین میں اس سے کوئی معاہدہ کی شکل نہیں دی جاسکتی۔ صرف اتنا اثر پڑتا ہے۔ انکار کرنے والا فریق۔ بقول قانون ساز۔ ”معقول وجہ“ کے بغیر رشتے کو توڑنے پر اصل قیمت اس فریق کو واپس کرے جس نے بہ امید نکاح وہ چیزیں دی تھیں۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تحفوں کی لین دین میں نکاح ہونے کا خیال پیش نظر نہیں ہوتا۔ ان غیر معمولی اخراجات کا سبب تو براہ راست ”نامزدگی“ کی تقریب ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔“

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ جناب مہدوی کا اس ”دفعہ“ پر اعتراض یہ ہے کہ دفعہ نامزدگی کے کوئی قانونی اثر نہیں مرتب کرتی، اور اس کے اجراء کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس کا اثر صرف اتنا ہے کہ رشتہ توڑنے والا اصل تحفے یا ان کی قیمت دوسرے فریق کو واپس کرے۔ نہ کہ نامزدگی کے سلسلے میں اس شخص کے نقصانات اس کے علاوہ ہیں، مثلاً جشن و ہرج و مرج، نامزد کو لے کر پھرنا اور سلسلے میں بھاری اخراجات۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس دفعہ کے ایک اور اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ قانون کہتا ہے کہ ”رشتہ توڑنے والا“ اگر معقول وجہ کے بغیر رشتہ توڑ دے تو حاصل کردہ اصل تحفے یا ان کی قیمت دوسرے فریق کو دے۔“

اعتراض یہ ہے کہ قاعدے کے مطابق اگر رشتہ توڑنے والا معقول وجہ کی بنا پر بھی رشتہ توڑے جب بھی اسے حکم از کم فریق ثانی کے مطالبے پر تنخواے تو واپس کرنا ہی چاہیے۔

حقیقت میں دونوں اعتراض ٹھیک نہیں ہیں۔ قانون مدنی کی دفعہ ۱۰۳۶ ہے: ”دنام زد افراد میں رشتے کی منظوری کے بعد کوئی فرد ”علت موجبہ“ معقول سبب کے بغیر رشتہ توڑ دے حالانکہ فریق مقابل یا اس کے والدین یا دوسرے افراد نکاح ہونے کی خیال میں (مغفور) ہوں انھوں نے اخراجات بھی کئے تھے۔ تو جس فریق نے رشتہ توڑا ہے وہ نقصان کی تلافی کرے گا مگر یہ تلافی نام دستور کے اخراجات کی بنیاد پر ہوگی۔“

اس دفعہ نے اسی بات کی پیش بندی کر رکھی ہے جس کے بارے میں جناب مہدوی کے بقول ”قانونی پیش بندی نہیں کی گئی“ دفعہ میں ”بدون علت موجبہ“ کی شرط ہے۔ معقول وجہ کے بغیر۔ اس دفعہ کی رو سے رشتہ توڑنے والا فریق ثانی کے اخراجات بضمن نامزدگی ہی کا دیں دار نہیں بلکہ والدین یا دوسرے افراد کے اخراجات کا بھی دین قرار پاتا ہے۔

اس دفعہ میں ”مغور شدہ“ (فریب میں مبتلا) کا جملہ قانونی کلیہ ”غور“۔ فریب۔ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قانون مدنی میں ”تسبیب“۔ ایک ہے فریب دینا، نقصان پہنچانا۔ دوسرے فریب یا نقصان کے اسباب فراہم کرنا۔ یعنی اسباب نقصان مہیا کرنے پر بھی جبری ضمانت مہیا کی گئی ہے۔ دفعہ نمبر ۳۳۲، تسبیب متعلق ہے، یہ دفعہ بھی منحرف فریق کے خلاف قابل استفادہ ہے۔

بنا بریں قانون مدنی یہی نہیں کہ ”خسارت“ بے نامزدگی و نامی زدگی کے ضمن میں ہونے والے نقصانات کے بارے میں خاموش ہے بلکہ اس نے اس بات کو دو دفعات

سا تھا ہے۔

”نسارت اسے نامزدی“ کو منظور کھنے والے نے ”خود نامزدی“ سمجھ لیا۔ ؟

ہاں ہون مدنی کی دفعہ ۱۰۳ سے :

”بریک نام زد کو حق ہے کہ منظور شدہ رشتے کو توڑ دینے والے (ڑکے یا ٹرکی) سے منظوری رشتہ کے موقع پر اپنی طرف سے یا اپنے والدین کی طرف سے دیے جانے والے تحفے واپس مانگے اگر اصل تحفے موجود نہ ہوں تو مطالبہ کرنے والا قیمت کا حق دار ہوگا مگر بطور رسم ایسے تحفے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ چیزیں کسی کو باہمی کے بغیر فریق ثانی سے تلف ہو گئی ہوں“ یہ دفعہ ان چیزوں سے متعلق ہے جو فریقین ایک دوسرے کو دیتے ہیں یا اپنے

دیکھ کر اس دفعہ میں کسی قسم کی قید نہیں ہے کہ ایک فریق بغیر علت موجبہ (مقولہ سبب) سے رشتے کو توڑ دے۔ ”بدون علت موجبہ“ ایک بے جا استہزاء ہے جس کے مرکب مہدی صا ہوئے۔ ”تجربے، جو لوگ قانونی سادہ فقرات (دفعات) سمجھنے سے معذور ہیں۔ ان میں یہ دیکھ کیسے پیدا ہو گیا کہ وہ ان آسمانی قوانین کو بدل دیں جن میں ہزاروں باریکیاں اور تعزیرات کام میں لائی گئی ہیں۔ یہ صاحب وہ ہیں جن کی زندگی انھیں قانونی نکات کو سمجھنے کے لئے گزری ان کا کام ہی یہ رہا۔ اسی فنی مہارت کے نام سے موصوف نے ملک کے ایک بحث صاف کیا ہے۔

”کتے بھی واضح رہے کہ جناب مہدوی پانچ سال پہلے تک کہ جب ”پیمان مقدس“ میں شاق و دواج کی تالیف میں مصروف تھے۔ اس جیسے ”بدون علت موجبہ“ کو ”بدون علت موجبہ“ پر تھتے رہے۔ چنانچہ مذکور کتاب میں ایک طویل فصل سی داد و فریاد رکھ گئی۔ ہائے کیا دنیا میں کوئی کام بے علت و سبب کے بھی ہوا ہے۔ لیکن بہت حد تک یہاں ایک برسوں یہ جملہ غلط پڑھا کیے۔ اصل عبارت ”بدون علت موجبہ“ تھی۔

فواستگاری کے ضمن جو مزید اعتراضات "منشور" نگار نے کیے ہیں ہم سرِ دست
ان سے قطع نظر کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ :

نکاح موقت (متعہ)

- _____ متعہ اور آج کی زندگی۔
- _____ آیا نکاح موقت رہبانیتِ عملی ہے؟
- _____ کونسا طریقہ؟ موقت رہبانیت، جنسی کیونزوم یا نکاح موقت؟
- _____ آج کے جوان کم عمری میں شادی نہیں کر سکتے، لہذا بلوغ اور جنسی پہچان میں کیا کریں؟
- _____ اگر متعہ کا منصوبہ یورپ آیا ہوتا تو جدت پسند اسے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قانون سمجھتے۔
- _____ آج کی زندگی میں کل سے زیادہ متعہ ضروری ہو چکا ہے۔
- _____ آزمائشی شادی۔
- _____ متعہ کے بارے میں رسل کا نظریہ۔
- _____ عواتین کی راہ میں بیسویں صدی کے مرد کے جاں
- _____ بیسویں صدی کی عورت کی شہرت یورپ امریکہ کی سٹریڈاری کی خدمت میں۔

- — کوئی عورت کرایے کی عورت یا اس کی اس کی؟
- — قرآن، عورت کا پچا حامی اور حق گو ہے۔
- — متعہ پر اغتراش اور جواب ۔
- — متعہ اور مسئلہ آبادی حرم سرا ۔
- — بیویں مدی کے مردوں نے خواتین سے لذت اندوزی کے متعلیٰ ہارون رشید و فضل بر مکی سے سیکھے ہیں ۔
- — بیویں مدی کے مردوں نے صرف بے بہادری لٹائی ہے ۔
- — "لذت پرست" مرد، اسلام میں ملعون سمجھا گیا ہے ۔

خدا سے مؤلف مرحوم

نکاح موقت

(۱)

بہت سے افراد کے برعکس، اسلامی مسائل میں لوگوں کے شکوک و شبہات بجا کرنے کے کبھی تکلف محسوس نہیں کرتا۔ باوجودیکہ میر تمام تر رابطہ و اعتقاد صرف اسلام سے ہے۔ میں اپنے دل سے خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے، اور زندگی میں تجربہ و مشاہدہ کیا ہے کہ یہ آسمانی مقدس آئین، وہ ہے جس کے محاذ پر بہ شدت حملہ آور سے مضبوط تر بنا دیتے ہیں۔ جس رنج پر حملہ کیا جائے، اس رنج پر زیادہ طاقت، سرزندگی و جلوہ نمائی اور زیادہ آب و تاب آجاتی ہے۔

حقیقت کی خوبی یہی ہے کہ شک اور تردد اس سے روشن کرنے اور چمکانے میں زیادہ مدد دیتا ہے۔ شک یقین کی تمہید اور تردید تحقیق کی سیڑھی ہے۔ ”زندہ بیدار“ نامی رسالے میں، غزالی کی ”میزان العمل“ سے نقل ہے کہ:

”جو ری گفتگو کو یہی فائدہ بہت ہے کہ تمہیں تمہارے موروثی اور پرانے عقائد کے بارے میں مبتلائے شک کر دیا، کیونکہ شک تحقیق کی اساس ہے۔ جو شک نہیں کرتا وہ صحیح طور پر توجہ نہیں دے رہا ہے، جو شخص باریک بین نہیں ہے وہ اچھی طرح دیکھتا ہے۔ ایسا آدمی اندھے پن اور سرگردانی میں گمراہ نہ رہے گا۔“

آزادی دیجیے، لوگ بولیں، لکھیں، سینار کریں، اعتراض کریں، نتیجہ میں ان کی خوشی و غم اسلام کے منظور ہونے کا وسیلہ بنیں۔

اسلام کے تابناک قوانین میں سے، نگاہ فقہ جعفری میں شادی دو طرح کی ہے۔

دائمی اور موقت -

مذہبِ جعفری ہی ہمارے ملک کا رسمی مذہب ہے۔ نکاحِ موقت و نکاحِ دائمی چند باتوں میں یکساں اور چند معاملات میں علیحدہ ہیں۔ سب سے پہلی جگہ جہاں یہ دونوں الگ ہوتے ہیں وہ زن و مرد کا معین وقت کے لیے نکاح کرنا، جب مدت معین ختم ہو جائے اور دونوں متفق ہوں تو مدت بڑھ سکتے ہیں اور اگر دونوں مائل نہ ہوں تو الگ ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات شرائط کی ہے، متعہ میں دونوں کو زیادہ آزادی ہے، جو شرائط و معاہدہ چاہیں کر لیں، مثلاً نکاحِ دائمی میں مرد بہر حال روزانہ کے اخراجات پوشاک، مکان کا ذمہ دار ہے، اس کے علاوہ بیوی کے دوسرے ضروریات، جیسے دوا، علاج، معالج و غیرہ کا انتظام بھی شوہر کرے گا۔ لیکن نکاحِ موقت - متعہ - ان ذمہ داریوں اور آزادیوں کا تعلق معاہدہ پر ہے ممکن ہے مرد نہ چاہے یا اخراجات ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔ یا عورت اپنے شوہر کی دلت سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے۔

نکاحِ دائمی میں، بیوی بہر حال شوہر کو سردارِ خاندان ماننے کی پابند ہے۔ اور گھریلو بھلائی کی حد تک مرد کے احکام کی تعمیل کرے گی۔ لیکن نکاحِ منقطع میں باہمی معاہدے کے مطابق عمل ہوگا۔

نکاحِ دائمی میں میاں بیوی بہر حال ایک دوسرے کا ترکہ پائیں گے۔ نکاحِ منقطع میں یہ نہیں ہے۔

دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نکاحِ منقطع، حدود اور پابندیوں سے آزاد ہے، ہر قسم کی قید طرہن کے معاہدے سے وابستہ ہے، فریقین جس قرار واد پر راضی ہوں گے وہی عمل میں آئے گی حتیٰ کہ زمانے کی پابندی میں دونوں کو آزادی ہے اور مدت نکاح بھی طرہن کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

نکاح دائمی میں، میاں بیوی ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر مانعِ حمل کوئی کام نہیں کر سکتے، لیکن نکاح منقطع میں ایک دوسری کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی زن و شوہر کو آزادی دی گئی ہے۔

اس شادی کے نتیجے۔ یعنی اولاد۔ اور نکاح دائمی کے نتیجے میں کوئی فرق نہیں۔ مہر، نکاح دائمی میں بھی ضروری ہے اور نکاح منقطع میں بھی لازم ہے۔ فرق یہ ہے کہ نکاح منقطع میں اگر مہر کا ذکر نہ ہو تو عقد باطل ہوگا۔ اور نکاح دائم میں مہر کا ذکر نہ کرنے سے نکاح باطل نہیں ہوتا مگر ”مہر منہل“ یعنی ہوگا (مہر منہل سے مراد وہ مہر ہے جو بیوی کی قربت دار خواتین کا مہر تھا وہی مہر اس نون قراباں کی جس طرح عقد دائم میں، شوہر پر بیوی کی ماں اور بیٹی اور بیوی پر شوہر کے باپ اور بیٹے حرام ہیں، اسی طرح عقد منقطع میں بھی یہی صورت ہے۔ جیسے دائمی زوجہ سے دوسری درخواستِ نکاح حرام ہے اسی طرح متاعی بیوی سے رشتہ کی درخواست ہر شخص پر حرام ہے۔ یا دائمی زوجہ سے زنا کرنے والے پر وہ عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ یہی حکم متاعی زوجہ کے لیے ہے۔ طلاق کے بعد دائمی نکاح والی عورت عدہ رکھنے کی پابند ہے۔ متاعی بیوی بھی مدت نکاح معاف یا ختم ہونے کے بعد عدہ کی پابند ہے۔ البتہ عدہ کی مدت میں اختلا ہے: نکاح دائمی والی بیوی تین ماہ واری تک اور متاعی بیوی دو ماہ واریاں یا پانچالیس دن کا عدہ رکھے گی۔ نکاح دائمی میں دو بہنوں کو بیک وقت بیوی نہیں بنایا جاسکتا، متاعی میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ”ازدواج موقت“ یا ”نکاح منقطع“ کے نام سے شیعہ فقہ میں مذکور ہے۔ یہی ان کے قانون مدنی میں بعینہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اس قانون کے ان خصوصیات کے ساتھ حامی ہیں۔ رہا یہ کہ ہمارے افراد نے اس قانون سے ناجائز فائدے اٹھائے اور اٹھاتے ہیں۔ اس کا قانون سے کیا تعلق ہے؟ اس قانون کے بدلنے سے ناجائز فائدے نہ اٹھائے جانے کی ضمانت کون دے سکتا ہے؟ صرف مشکل بدل جائے گی۔ بلکہ قانون کے مسترد کرنے سے سینکڑوں فساد اور پیدا ہوں گے۔

اگر عوام کی اصلاح اور انکو آگاہ نہ کر سکیں تو اپنی ناتوانی اور عوام کی اصلاح نہ کرنے کی پراقت کو ہمیشہ قانون کی خرابی پر ڈالنا غرض انسان کو بری الذمہ قرار دینا اور قوانین کو ذمہ دار ٹھہرنا مناسب ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ نکاح دائمی کے ہوتے ہوئے ”ازدواج موقت کے نام قانون بنا کی ضرورت کیا ہے۔ آیا بقول مضمون نگاران رسالہ ”زن روز“ متعہ عوامین کی نسوانی تھیت اور اعلامیہ حقوق بشکے خلاف ہے؟ کیا متعہ کی ضرورت تھی بھی تو پرانے زمانے میں تھی، آج کی زندگی اور آج کے جدید معاوضے اس سے ہم آئنگ نہیں ہیں؟ ہم اس موضوع کو دو عنوانوں سے زیر بحث لائیں گے:

الف۔ متعہ اور آج کی زندگی۔

ب۔ متعہ کے نقصانات و عیوب۔

متعہ اور آج کی زندگی

ہم مذکورہ بالا گفت گو سے یہ سمجھ چکے ہیں کہ نکاح دائمی میاں بیوی کے لیے بہت سی

ذمہ داریاں اور فرائض پیدا کرتا ہے۔ اسی دلیل کی بنیاد پر لڑکی یا لڑکا، طبعی بلوغ کو پہنچتے ہی جنسی جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود نکاح دائمی پر تیار نہیں ہوتا۔ عہد جدید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طبعی بلوغ اور معاشرتی بلوغ دفاندان کی تشکیل کے امکان میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ اگر گزشتہ سیدھے سادھے زمانے میں ایک کم سن لڑکا اوائل بلوغیت میں کسی کام میں لگا دیا جاتا تھا تو زندگی بھر سے انجام دیتا تھا۔

مگر آج کی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک کامیاب لڑکا، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کرتا ہے، کبھی اسے اعلیٰ ترین سند کے لیے کچھ مدت یونیورسٹی میں گزارنا پڑتی ہے پچیس سال میں دانگاہ سے فراغت ہوئی، یقینی طور سے تین چار سال اس فکر میں گزارنا ہیں کہ تھوڑی بہت آمدنی اور کچھ سروسامان ہو تو نکاح دائمی کی سوچے

نی حال اس لڑکی کا ہے جو تعلیمی دور مکمل کرنا چاہتی ہو۔

آج کا جوان اور بلوغ
بچران جنسی کا عہد:
جنسی پہچان میں آئے۔ آج کے کسی اٹھارہ سالہ لڑکے سے شادی کی بات کر کے دیکھے۔ وہ آپ پر سننے لگا۔ وہ اپنی روزانہ سولہ برس کی لڑکی دکھائے گی۔ عملاً ممکن نہیں، اس طبقے کے لوگ اس سن والے میں نکاح دائمی کر کے اس بوجھ تلے نہیں آسکتے جس میں ایک دوست کی ذمہ داریاں اٹھانا پڑتی ہیں اور کچھ دن بعد ہونے والی اولاد کا مسئلہ اس پر مستزاد بن جاتا ہے۔

وقتی رہبانیت، آزمائشی شادی
نکاح موقت (متعہ) کون بہتر ہے؟
ہم آپ سے پوچھتے ہیں، اس صورت حال میں اس منہج اور اس خمیر کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟ آج کی دنیا میں، زندگی کے حالات ہیں سولہ اور اٹھارہ برس کی عمر میں ہی اجازت نہیں دیتے، کیا فطرت بلوغ کا دور آگے بڑھا سکتی ہے؟ اور جب تک تعلیمی زمانہ مکمل نہ ہو جنسی جذبات ہم سے دست بردار ہو سکتے ہیں؟

”وقتی رہبانیت“۔ ترک دنیا، ترک لذات۔ کاچلہ کھینچنے کے لیے آج کے جوان کیا ہیں؟ کچھ نغمہ ریاضت کریں اور شادی کے امکانات حاصل ہونے تک ذرا سختی حاصل لیں؟ فرض کر لیا کہ ”وقتی“ رہبانیت کے لیے کچھ ہواں تیار ہو گئے۔ کیا ان کا خمیر بھی نئی ہے؟ کیا ان میں خطرناک نفسیاتی بیماریاں پیدا نہ ہوں گی؟ یہ بیماریاں ان کی جنسی وابستہات کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا سراغ آج کے ماہرین نفسیات لگا چکے اور ان کی تحقیق بتا چکے ہیں۔ کیا اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے؟

اب دورا ستے ہیں، جوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے معاملے کو سامنے نہیں ہی نہیں۔ ایک لڑکے کو چھوٹ دے دیں کہ سولہ لڑکیوں سے کام نہ کالے۔ ایک

لڑکی کو ڈھیل دے دیں وہ جائے اور دس لڑکوں سے ناجائز طریقے پر تعلقات قائم کرے اور کئی مرتبہ استغاثہ کر لے۔ یعنی عملی طور پر جنسی کیونزیم قبول کر لیں ہم لڑکے لڑکی کو برا بری دے ہی چکے ہیں، ”منشور حقوق انسانی“ کی روح سے خوشی ہو چکی ہے۔ آخر بہت سے کوتاہ خیال افراد کی نظر میں ”اعلامیہ حقوق بشر“ کی روح یہ ہے کہ اگر مرد و زن جہنم کے کسی درجے میں داخل ہونا چاہیں تو دوش بدوش اور ہاتھ میں ہاتھ ملا کر، خلاصہ یہ کہ برابر برابر گریں۔

سوچئے، ایسے لڑکے لڑکیاں جنہیں طالب علمی میں اتنے زیادہ تعلقات حاصل ہو چکے ہوں مستقل شادی کے بعد مرد زندگی اور خاتون خانہ بننے کے قابل رہیں گے؟ کیا متعہ بہتر ہے؟

دوسرا راستہ ہے، ازدواجِ موقت و آزاد۔ متعہ پہلے مرحلے میں عورت کو پابند کرتا ہے کہ بیک وقت دو مردوں کی بیوی نہ بنے۔ صاف سی بات ہے، جب عورت ایک مرد کی پابند ہوگی تو مرد کو بھی خواہ مخواہ ایک عورت کا پابند رہنا پڑے گا۔ جب ایک عورت ایک معین مرد کی پابند ہوتی ہو تو مرد بھی مجبوراً اسی ایک عورت کا ہو رہے گا۔ سوائے اس کے کہ عورتیں دل لڑکیاں (فراواں ہو) اور ان کی طرف سے لڑکوں پر دباؤ زیادہ ہو۔

یہی ایک راستہ ہے جس میں وقتی رہبانیت اور اس کے نقصان دہ اثرات سے بچا و موتا ہے اور جنسی کیونزیم میں بھی نہیں پھنسا پڑتا۔

آزمائشی شادی: زمانہ طالب علمی ہی نہیں، دوسرے حالات میں بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، اصولاً ممکن بھی ہے کہ ”زن و مرد نکاح دائمی کرنا چاہیں مگر باہمی اعتماد اور مکمل محرومی کے واسطے آزمائشی طور پر کچھ دنوں کے لیے عقد کر لیں، اس مدت میں اعتماد حاصل ہو جائے تو نکاح دائمی سے منسلک ورنہ مدت ختم ہو جائے اور دونوں جدا ہو جائیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں: اہل مغرب کا ر عورتوں کی معین تعداد کو ہر شہر میں حکومت کی نگرانی میں رکھنے کو لازم اور ضروری سمجھتے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ بے شادی شدہ افراد جو دائمی شادی نہیں کر سکتے، کو خاندانی اور گھریلو زندگی بسر کرنے والوں کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔^{۷۵}

رسل اور نظریہ ازدواج موقت: ”برٹنڈرسل“ مشہور انگریز فلسفی نے، اخلاق اور خانگی تعلقات زن و شوہر میں لکھا ہے:

”... سنجیدگی سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ فاحشہ عورتیں، ہماری گھریلو زندگی، ہماری خواتین اور عصمت و خیر کی حفاظت کرتی ہیں۔ ”ملکہ وکٹوریا“ کے زمانے میں ”لکی“ نے یہ بات کہی تو اخلاق کے طرفدار بہت ناراض ہوئے، وہ اس کی علت سمجھنے اور ”لکی“ کے نقطہ نظر کی غلطی ثابت کرنے میں ناکام رہے، اخلاق پرست طبقے کی زبان حال اور استدلال تھا۔ ”اگر عوام ہمارے تعلیمات کو قبول کرتے تو فحاشی ناپید ہو جاتی۔ لیکن وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انکی بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔“^{۷۶}

فرنگیوں کا یہ فارمولا، ان مردوں، عورتوں کے لیے ہے جو نکاح دائمی نہیں کر سکتے، اور وہ تھا فارمولا جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، اگر فرنگی فارمولے پر عمل کیا جائے اور کچھ بد نصیب عورتیں اس معاشرتی ذمہ داری کے لیے مخصوص کر دی جائیں، تو کیا عورت کا حقیقی رتبہ اور اس کی انسانی حیثیت برقرار، اور علامہ حقوق انسانی کی روح

۷۵۔ بیسویں صدی میں حکومت کی طرف سے لائسنس دار فاحشہ عورتوں کے اڈے مغرب کے ایران میں آئے اور پہلوی حکومت نے اس کی بڑے پیمانے پر سرپرستی و ہمت افزائی کی۔

۷۶۔ رسل کی کتاب کا نام ہے: ”MARRAGE AND MORALS“

خوش ہو جائے گی؟

برنڈرسل نے اپنی کتاب میں "آزمائشی شادی" کے عنوان سے ایک باب الگ لکھا

ہے اس کی رائے ہے:

"جسٹس لینڈرے جوڈینور کے طویل الیعاد جج تھے موصوف نے اپنے مشاہدات اور مطالعہ تعاق کے بعد تجویز رکھی تھی کہ "فرنڈشپ میسرئج"۔ ازدواج رفاقتی، کا پروگرام شروع کیا جائے۔ افسوس، انھیں اپنی سرکاری ملازمت "امریکہ" میں چھوڑنا پڑی۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ جو جوانوں کی خوش حالی اور سعادت کی فکر کو ان میں سیادہ کاری کی حس کو بیدار کرنے سے زیادہ حامی تھے کیتھولک اور کالوں کے مخالف گروپوں نے جج صاحب کو برطرف کرنے کی مہم چلا دی۔

فرنڈشپ میسرئج کی مقصدل تجویز ایک دانشمند نے کی ہے۔ وہ جنسی روابط میں استحکام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لینڈرے سمجھ گیا کہ شادی کی راہ میں بنیادی رکاوٹ مفلسی ہے، پیسے کی ضرورت صرف اولاد کے ہونے پر ہی نہیں، اصل بات بیوی کا معاشی سہارا نہ دینا ہے۔ لہذا، رفاقتی شادی جوانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ اس میں عام شادی سے تین اختلاف ہیں:

۱۔ شادی سے بچے پیدا کرنا مطلوب نہ ہوں گے۔

۲۔ ہواں عورت جب تک مان نہ بنے گی، حاملہ نہ ہوگی، طرفین پر طلاق پر رضامندی آسان ہوگی۔

۳۔ طلاق کی صورت میں عورت کو اپنے آذوقے کے لیے کچھ امداد کی ضرورت ہوگی۔

..... میں لینڈرے کی تجویز کے مفید و مؤثر ہونے میں کوئی

شک نہیں رکھتا۔ اگر قانون اسے منظور کر لیتا تو اخلاقی فلاح و بہبود میں اچھا

اضافہ ہوتا۔“

لینڈزے اور رسل جے ”ازدواج رفاقتی“ کہتے ہیں اگرچہ اسلامی ”ازدواجِ مؤقت“
سے اس میں کچھ فرق تو ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مفکرین اس نکتہ کو دریافت
کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ تنہا ”ازدواجِ دائمی“ تمام معاشرتی ضرورتوں کو پورا
کرنے کے لیے کافی نہیں۔

نکاحِ موقت

(۱۲)

قانونِ متعہ کے خصوصیات اس کے وجود کی ضرورت اور فقط نکاحِ دائمی تمام انسانوں کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ خاص کر موجودہ زمانے میں۔ یہ تھے وہ نکات جن پر بحث و تحقیق کی گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ متعہ کے ممکنہ نقصان کیا ہو سکتے ہیں۔ تمہید میں ایک بات یاد دلاتے چلیں :

تاریخ عقائد نویسی : انسان جن موضوعات و مسائل و مباحث پر اظہارِ رائے کرتا چلا آ رہا ہے، ان میں تاریخِ علوم و عقائد اور رسم و رواج

اور انسانی آداب (جیسے موضوعات سب سے زیادہ نامفہوم اور مشکل ہیں) چنانچہ کسی موضوع پر انسان نے اس موضوع سے زیادہ بے معنی باتیں کی ہیں رافق کے کسی اور موضوع پر اظہارِ رائے کا اتنا شوق بھی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر، اگر کسی کو اسلامی فلسفہ و تصوف و عرفان و علمِ کلام سے واقفیت ہے اور اس نے آج کے مصنفین کی تحریریں پڑھی ہیں۔ یہ تحریریں عموماً یا بیرونی مصنفین سے ماخوذ یا اصل گفتگو کی نقل ہیں۔ بہر حال ان سے باخبر حضرات میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے، یعنی اورینٹلسٹ ان کے پیروکار اور دم چھلے ان مسائل پر گفتگو فرماتے جانتے ہیں لیکن براہِ راست موضوع کو شاید ہی گہرائی کے ساتھ جانتے پہچانتے ہیں۔

اسلامی تصوف کے ایک مسئلہ کو لیجئے ”وحدت وجود“ اب یہ مسئلہ زبان زدِ ہجے کیا کیا باتیں نہیں کہی گئی ہیں۔ بس ایک بات تشوہ گفتگو ہے اور وہ ہے ”وحدت وجود“ کیا ہے اور اسلامی تصوف و عرفان کے بڑے بڑے مفکر جیسے محی الدین ابن عربی اور

سہرے تالیفیں شیرازی کا تصور وحدت وجود کیا ہے؟

رسالہ ”زن روز“ میں چھپنے والے مضامین، جن میں نکاح منقطع پر اظہار رائے کی گئی ہے، تھے وقت مجھے ”مسئلہ وحدت وجود“ یاد آتا رہا۔ یہ محسوس ہوا کہ سب باتیں زیر بحث آئیں لیکن اصل روح مسئلہ جو یہ قانون بناتی ہے اور قانون ساز نے اس کو پیش نظر رکھا ہے تیشہ بحث ہے۔

در اصل یہ قانون چونکہ ”مشرقی ترکہ“ ہے لہذا بے توجہی کا متحتی ہے اور اگر یہی مغربی تحفہ ”ہو تو بحث یوں نہ ہوتی۔

یہ قانون سرزمین مغرب کے آیا ہوتا تو آج اس پر کافر نسوں اور سیناروں کا سلسلہ جاری ہوتا، قراردادیں پاس ہوتیں کہ بیسویں صدی کے آخری پچاس سال میں ماعول انابل گیا ہے کہ فقط نکاح دائمی کو شادی قرار دینا مطابق حالات نہیں ہے۔ موجودہ نسل نکاح دائمی کے فرائض برداشت کرنے کی قوت سے محروم ہے۔ آج کا جوان ان ذمہ داریوں کو نہیں اٹھا سکتا سے آزادی چاہیے۔ آزاد زندگی میں آزاد نکاح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ آزاد نکاح میں آج کا جوان لڑکا اور لڑکی آزادی سے شریطیں طے کرتی ہے..... اور اسی دلیل کی بنیاد پر مغرب کے ایک زمزمہ اٹھا کہ ”دوستانہ شادی“ وقت کی ضرورت ہے۔ نوٹر بریٹنڈرسل ”جیسے مفکر اس میں شریک ہو گئے۔ حالات بتاتے ہیں کہ مستقبل اسلام کی صوابدید کو مغرب نے پسند کریں گے اور ہم ازدواج دائم کے خلاف ہمہ کد دفاع اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اعتراضات و جوابات متعہ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کی نوعیت

یہ ہے: ۱۔ شادی کی بنیاد دوام پر ہونا چاہیے۔ میاں بیوی جب یہ بندھن قبول کریں تو

ہمیشہ کے لیے پابند رہیں اور جدائی کا خیال ذہن میں نہ آنے دیں، اور متعہ میاں بیوی میں دومی قول و قرار ہی نہیں لہذا وہ نکاح بھی نہیں۔

ازدواج کو مستحکم بنیاد قائم ہونے کی بات بہت صحیح بات ہے لیکن متعہ پر اعتراض اس وقت ہو سکتا ہے جب نکاح دائم کو منسوخ کر کے متعہ کو اس کی جگہ رکھ دیا جائے۔ بے شک فریقین دائمی نکاح پر متفق ہو، دونوں کو مکمل طہنہ ہو، دونوں پکا ارادہ کریں تو نکاح دائمی کا قانون ہو۔

ازدواج موقت کا قانون تو بنا ہی اس لیے ہے کہ فقط ازدواج دائم ہر حالت یا ہر صورت حال اور ہر وقت ممکن نہیں نہ انسانی ضرورت یا کمپوز کرنا نکاح دائمی کے دائرہ کار میں ہے۔ ایک دائمی نکاح کی مدت نے افراد کو جزوقتی رہبانیت یا جنسی کمپوزیم قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سلسلے کی بات، جیسے کی اور لڑکے میں دائمی نکاح کی زمین ہمارے ہو تو وہ ہرگز نکاح منقطع پر تیار نہ ہوں گے۔

۲۔ ایرانی عورتوں اور لڑکیوں نے نکاح منقطع کو پسند نہیں کیا، حالانکہ وہ شیعہ ہیں، ان کے خیال میں یہ توہین کی بات ہے۔ اسی بنیاد پر شیعہ مرد بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔ جو جواب یہ ہے کہ عورتوں میں متعہ کی ناپسندیدگی ہوس پیشہ مردوں کے غلط رویہ سے ہے، قانون کو اس رویے پر بند باندھنا چاہیے۔ ہم اس قانون کے غلط استعمال آرگے بحث کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ متعہ کے بارے میں اس پسندیدگی کی توقع جو نکاح دائمی کے بارے میں ہے۔ غلط ہے، کیونکہ قانون متعہ ہی اس موقع کے لیے جب فریقین نکاح دائم کے لیے تیار و متفق نہ ہوں۔

۳۔ نکاح منقطع، عورت کی شخصیت و احترام کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں انسان کو کریم پر لینا، یا جسم فروشی کا شرعی جواز، عورت کی شخصیت اور انسانی حیثیت سے گری ہوئی بات ہے کہ مرد سے کچھ پیسے لے کر اپنا وجود اپنا جسم اس کے حوالے کر دے۔ یہ اعتراض سب سے زیادہ تعجب خیز ہے۔

۱۔ ازدواج موقت کے بارے میں جو امتیازات ہم گزشتہ سطور میں لکھ چکے،

یہ کہے ہوتے ہوئے اجارے اور کرایے کا ربط کیا ہے، آیات ازدواج کی محدودیت نے
نکاح ازدواج کی صورت سے خارج کر دیا اور کرایہ و اجارہ کی ہیئت دے دی؟
مہر کے قطعی تعین کی وجہ سے کرایہ و اجارہ کی شکل بن گئی ہے؛ یعنی اگر مہر کے بغیر ہو اور
مرد کوئی چیز عورت پر بیچا اور نہ کرے تو عورت اپنی انسانی حیثیت واپس لے لیتی ہے۔
مہر کے بارے میں آگے گفتگو کریں گے۔

اتفاقاً، علماء فقہ نے تصریح کر دی اور قوانین مدنی نے اسی بنیاد پر اپنے دفعات
مربط کیے ہیں کہ ازدواج موقت و ازدواج دائم دونوں میں معاہدے کی حیثیت ایک
ہی ہے ان میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے نہ کوئی فرق کرنا چاہیے۔ دونوں ازدواج
میں، دونوں مخصوص الفاظ CODE WORDS سے ازدواج کی صورت حاصل کرتے
ہیں۔ اگر نکاح منقطع اجارہ و کرایہ کے مخصوص صیغوں سے پڑھا جائے تو باطل ہے۔

۲۔ انسان کا اجارہ و کرایہ کب اور کس تاریخ سے کنسل ہوا ہے؟ درزی، حجام، ڈاکٹر
اور تمام ماہرین اور ملازمین سکر۔ وزیراعظم سے لے کر چیرا سی تک تمام کاری گرا کا خا
کے سب کارکن کرائے کے انسان ہیں۔

جو عورت اپنے ارادہ و اختیار سے کسی معین مرد سے عقد ازدواج موقت کرتی ہے
کرایہ کی آدم زاد نہیں بنتی۔ نہ اس نے انسانی حیثیت و شرافت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا
ہے۔ اگر آپ کو کرائے کی عورت دیکھنا، اور اگر آپ عورت کی فروخت اور کنیزی کا جائزہ لینا
چاہیں تو یورپ اور امریکہ چلے جائیں۔ وہاں ایک مرتبہ فلم کمپنیوں کو دیکھ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا
کرائے کی عورت کیا ہوتی ہے؟ کمپنیاں، عورت کی ایک ایک جسمانی حرکت، اس کی نسوانی
ساخت نسوانی عادتیں، اس کے جنسی آرٹ، کس کس طرح نیچے جاتے ہیں، سینما اور ٹھیٹر کے
ٹکٹ آپ خریدتے ہیں دراصل وہ عورتوں کے اجارے اور کرائے کے پیسے ہیں۔ غور تو
فرمائیے، بد نصیب عورت صرف دولت کے لیے اپنا جسم کیونکر پیش کرتی ہے؟ تجربہ کار سفر

سے "ZAST" حصول لذت کی ٹرپ، جنسی متک تھڑک سیکھتی ہے، اپنا جسم روح اور شخصیت ایک سرمایہ دار کمپنی کے حوالے کرتی ہے، مقصد ہے اس کمپنی کے خریدار زیادہ بنائے اور اس کے لیے پیسے زیادہ فراہم کرائے۔

یکبرے اور ہوٹل بھی دیکھیے، عورت نے کیا شرافت و عزت حاصل کی ہے۔ تھوڑی سی مزدوری، تھوڑا سا معاوضہ، اور وہ بھی (مالک) سرمایہ دار کی جیب میں مزید سرمایہ انڈیلنے کے لیے اپنی شخصیت و شرافت کا ہمانوں سے سودا کرتی ہے۔

کرائے کی عورتیں وہ مانگن۔ تنخواہ دار خواتین دیکھیے جو "شاپنگ سنٹروں" کے اقامتی کمپنیوں میں خریداروں کا دل موہنے اور گاہکوں کی بھیڑ جمع کرنے کے لیے، ٹیلوٹرن پر رنگا رنگ چہرے بناتی ہیں۔ ان کا کام کسی تجارتی سامان (مصنوعات) کی شہرت کا باعث بن کر سرمایہ دار کی جیب بھریں۔

کون نہیں جانتا، آج امریکہ اور یورپ میں عورت کا حسن، عورت کی دل کشی، عورت کی جنسی کشش، عورت کی آواز، امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داروں کی خدمت گزاری کا عام اور حقیر وسیلہ ہے؟ افسوس ہے کہ اپنے استہیانا دانستہ طور پر ایران کی شریف و معزز خواتین کو مذکورہ بندھوں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عورت آزادانہ و شریفانہ شرائط کے ساتھ ازدواج موقت کرنے کے بعد اسے کرائے کی عورت کہا جائے اور ایک گلوکارہ، کسی کی شادی، یا محفل شب میں ہزاروں لاپچی مردوزن کی آنکھوں کے سامنے فقط ان کی جنسی حس کو آسودہ کرنے کے لیے اپنا گلا پھاڑتی اور ایک ہزار ایک نغمے لاپچی اور طے شدہ مزدوری لیتی ہے۔ کرائے کی عورت، شمار نہیں ہوتی؟

وہ اسلام، جو عورت سے مرد کو اس قسم کے فوائد حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو عورت کو اس جال میں پھنسنے سے روکتا اور اس اسیری اور اس روزی سے روکتا ہے، کیا وہ اسلام عورت کا مقام گراتا ہے، یا بیسویں صدی کا نصف دوم کا یورپ؟

جس دن عورتوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئیں، اور انھیں یہ نظر آنا کہ بیسویں صدی کے مردوں نے ان کے راستے میں کیسے کیسے جان بچھائے ہیں، اسی دن وہ انقلاب کا نعرہ بلند کریں گی اور یہ بھی مانیں گی کہ فقط قرآن ان کی پناہ گاہ، ان کا واقعی حامی اور ان کے نظام میں حق گو ہے۔ یقیناً وہ دن دور نہیں، انقلاب اسلامی آیا اور وہ دن لایا خواتین نے آقائے مہتری کی پیش گوئی سچ کر دکھائی۔

رسالہ "زن روز" شمارہ ۷۷ صفحہ ۸ میں ایک رپورٹ مارچپی ہے، عنوان ہے "کلیاتی" مرضیہ و رضانا می دو کردار ہیں۔ مرضیہ نے عورتوں میں محرومیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ رضا کا بیان ایک لڑکی سے منگنی پر شروع ہوتا ہے۔ فارمولا نمبر ۴۰ کے مطابق پہلا قدم ہوا، اور لڑکی، لڑکے سے شادی کی خواہش ظاہر کرنے لگی۔ واضح ہے، جب خواہش لڑکی لڑکی سے شروع ہوگی تو انجام داستان اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔

مرضیہ کے انہماق کے مطابق، ایک ہوس دان، سنگ دل مرد نے نکاح دائمی کا نام لے کر بات کی، اس کے بچوں کی نگہداشت اور سرپرستی کا وعدہ کیا، پھر ان باتوں کے برخلاف نصیب عورت کی اطلاع میں لائے بغیر اس سے متعہ کیا اور اپنا مطلب نکلانے کے بعد اس سے لاپرواہی شروع کر دی۔

اگر اس عورت کا انہماق دعویٰ صحیح ہے، تو نکاح باطل تھا جس سنگ دل مرد نے ایک عورت کو شرعی و عرفی قانون سے بے خبری کی بنا پر دست درازی کا نشانہ بنایا، لہذا اس کے سزا ملنا چاہیے۔

"رضا" جیسوں کو سزا ملنے سے پہلے، تربیت ملنا چاہیے اور رضا جیسوں کی سزا تربیت سے پہلے "مرضیہ" جیسی خواتین کو باخبر بنانا چاہیے۔

مرد کی سنگ دلی اور عورت کی بے خبری و غفلت کے ہاتھوں رونما ہونے والا جرم، قانون سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ جو رسالہ "زن روز" میں رضا کو حق پر تبتا اور اپنی تلوار

قانون پر سیدھی کرتا ہے۔ کیا اگر قانون ازدواجِ موقت نہ ہوتا تو، سنگ دل رضا، بے خبر غافل مرضیہ کو غاموش چھوڑ دیتا؟

عورتوں کی تربیت اور ان کو باخبر بنانے کی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کیوں ہے، مرد وزن کے حقوق و فرائض شری کو چھپاتے ہیں۔ عورتوں کو غافل بنا کر اس قانون کا بطور دشمن تعارف کراتے ہیں جو تنہا، عورت کے بارے میں حق گو اور ان کا حامی ہے۔ کیوں اس قانون کو خواتین کے ہاتھوں کچلوانا چاہتے ہیں جو ان کی پناہ گاہ ہے؟

۴۔ نکاحِ منقطع، چوں کہ تعددِ زوجات کی قسم ہے اور تعددِ زوجات غلط ہے، لہذا نکاحِ منقطع غلط چیز ہے۔

نکاحِ منقطع کس قسم کے افراد کے لیے ہے؟ ہم اسی موقع پر اور تعددِ ازدواج بات - ہا امداد خدا - الگ اور تفصیل لکھیں گے۔

۵۔ نکاحِ منقطع، چونکہ ناپائدار ہے، لہذا ان بچوں کے لیے ناموزوں اشیاء ہے جو اس نکاح کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، یہ بچے، حمایتِ پدری اور سرپرست سے محروم، اور ماوری سرگرمیوں سے بے نصیب رہتے ہیں۔

یہ اعتراض، رسالہ ”زنِ روز“ کا وہ نکتہ ہے جس پر پورا زور صرف کیا گیا ہے۔ ہم نے جو توضیحات پیش کیے ہیں، ان کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہوگی، ہم گزشتہ مقالے میں ازدواجِ دائم و ازدواجِ موقت کے فرق بتائے ہیں اور کہا ہے کہ ایک فرق تولیدِ نسل سے متعلق ازدواجِ دائمی میں زن و شوہر باہمی رضا مندی کے بغیر ضبط تولید نہیں کر سکتے۔ ازدواجِ موقت اس کے برخلاف ہے، یہاں میاں بیوی دونوں اس معاملے میں آزاد ہیں۔ متعہ میں عورت، مرد کو استمتاع سے تو نہیں روک سکتی مگر مرد کے اس حق میں رکاوٹ ڈالے بغیر مانعِ حمل عمل ضرور بجا لا سکتی ہے۔ اس دور کے مانعِ حمل و ضبط تولید کے منصوبوں سے نکاحِ منقطع ہم آہنگ ہے۔

اس بنا پر، متعہ میں، میاں بیوی دونوں چاہیں تو بچہ پیدا کریں اور ہونے والے بچے کی نگہداشت و تربیت کی ذمہ داری اٹھائیں تو بچہ پیدا کریں۔ ظاہر ہے جذباتی و فطری لحاظ سے، نکاحی اور متاعی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔ بالفرض اگر ایسا عمل کیا جائے تو قانون پابند و مجبور کرے گا، اور حقوق اولاد تلف کرنے سے روکے گا۔ ہاں، اگر تولیدِ فرزند چاہیں اور ان کا مقصد نکاح منقطع جنسی تسکین حاصل کرنا ہو تو ضبط تولید کریں۔

ہمیں معلوم ہے، بھلیا، مانع حمل عمل کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں اگر زین و ثوبہ پہلے ہی سے ضبط تولید کی بات کر لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر نطفہ قائم ہو جائے اور بچہ کی پہلی تخلیقی منزل شروع ہو جائے تو اسلام اسے ضایع ہونے کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

شیعہ فقہاء جو کہتے ہیں کہ ازدواج دائم کا مقصد تولیدِ نسل اور ازدواج موقت کا مقصد استماع اور جنسی تسکین کا حصول ہے اس سے اسی قانونی نکتے کی تشریح ہوتی ہے۔

اشتقاقِ چالیس نکات پر

چالیس نکاتی منشورِ درجہ دین کے مصنف نے ”زنِ روزہ کے شمارہ ۸۷ میں نکاح منقطع کو نشانِ نقد و نظر قرار دیا ہے؛ پہلے فرماتے ہیں: ”موضوع قانونِ نکاح یا ازدواج منقطع اس قدر تکلیف دہ ہے کہ خود قانون کے واضعین بھی اس کی شرح و تفصیل نہ لکھ سکے۔ جیسے وہ اپنے کام سے خوش نہیں تھے، جو کچھ کیا ظاہر داری کے لیے تھا۔ دفعات ۱۰۷۵ و ۱۰۷۶ و ۱۰۷۷ کی بغیر لکھ کر قعرے جوڑ کر چھوڑ دیے۔“

قانونی دفعات مرتب کرنے والے ”نکاح منقطع (متعہ) سے متعلق کام سے خوش نہ تھے، نتیجہ یہ کہ انھوں نے بنیادی بات — مذکورہ عقد کی تعریف کی تعریف ہی نہیں کی۔ نہ ان کے لوازم و شرائط کی توضیح دی۔۔۔۔۔۔“

محترم مقالہ نگار اس کے بعد قانون مدنی کے اس نقص کو خود دور فرماتے ہیں اور نکاح منقطع کی تعریف کرتے اور لکھتے ہیں: ”نکاح مذکور کے معنی ہیں۔ بے شوہر عورت بمعین اجرت و مزدوری۔ معلوم معین اور محدود وقت کے ساتھ۔ خواہ چند لمحوں یا گھنٹوں کے لیے ہو۔ جنسی خواہش اور تمتع اور جنسی عمل کے لیے مرد کے حوالے کر دے۔“

پھر فرماتے ہیں: نکاح مذکور میں ایجاب و قبول کے خاص عربی الفاظ ہیں، جو بیعہ کتب فقہ میں درج ہیں۔ قانون نے مدتوں سے ادھر توجہ نہیں کی، جیسے قانون ساز کی نظر میں جو لفظ بھی مدعا مذکور پر دلالت کرے (یعنی مفہوم و معنی) کرایہ و مزدوری کے معنی دے، چاہے وہ عربی نہ بھی۔ نکاح منقطع واقع ہو جاتا ہے۔

مضمون نگار کی نظیریں: الف۔ قانون مدنی، نکاح منقطع کی تعریف نہیں کرتا، اور شرائط کی توضیح نہیں دیتا۔

ب۔ نکاح منقطع کی مابیت یہ ہے کہ عورت اپنے تئیں، معین مزدوری کے لیے مرد کو کرایہ پر دے۔

ج۔ قانون مدنی کی روشنی میں، عورت کے لیے کرایہ (اجارے) کے معنی دینے والے الفاظ، ایجاب و قبول، نکاح منقطع کے لیے کافی ہیں۔

میں مصنف کو دوسری مرتبہ ”قانون مدنی“ پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ مگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ رسالہ ”زن روز“ کے محترم مطالعہ کرنے والوں سے بھی درخواست ہے، ذرا زحمت کر کے ”قانون مدنی“ کی ایک کاپی حاصل کر کے مطلوبہ حصوں پر نظر ڈالیں۔ قانون مدنی، چھٹی فصل، کتاب نکاح، نکاح منقطع کے بارے میں مخصوص ہے۔ اس میں صرف تین سادہ جملے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ نکاح وقتی ”منقطع“ ہے، یہ معین مدت کے لیے واقع ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ نکاح منقطع کی مکمل طور پر مدت معین ہونا چاہیے۔
تیسرا حبلہ یہ ہے کہ مہر و میراث میں نکاح منقطع کا وہی قانون ہے جو مہر و میراث سے
مربوط فصلوں میں بیان ہوا ہے۔
چالیس نکاحات کے محترم مصنف کا خیال ہے کہ کتاب نکاح کی پانچ فصلوں میں جو کچھ
میں لکھتا ہوں وہ نکاح دائم سے مربوط ہے اور فقط یہ نہیں دفعات نکاح منقطع کے بار میں
ہیں۔ اور یہ بھول گئے کہ پانچوں فصلوں کے تمام قانونی دفعات بجز تصریح شدہ مقامات
کے جیسے دفعہ ۱۰۶۹ یا طلاق سے متعلق بات۔ نکاح دائم و نکاح منقطع میں مشترک ہے
مثلاً دفعہ ۱۰۶۲ ہے :-

”نکاح واقع ہوتا ہے ان الفاظ کے ذریعے ایجاب و قبول سے جو صاف صاف
”ادۃ ازدواج کے معنی بتائیں“

یہ دفعہ نکاح دائم سے مختص نہیں ہے، دونوں نکاح اس کے ضمن میں ہیں۔ عقد کرنے
والے، عقد یا میاں بیوی کے بارے میں جو شرائط مذکور ہیں، ان کا تعلق بھی دونوں نکاحوں
سے ہے۔ اگر قانون مدنی میں نکاح موت کی تعریف نہیں تو اس کی وجہ تعریف کی ضرورت
نہ نہ ہونا ہے۔ نکاح دائم کی تعریف بھی اسی بنا پر موجود نہیں ہے۔ اسے تعریفیے
سے نیاز سمجھا گیا ہے۔ ”قانون مدنی“ میں ہر اس لفظ کو موثر مانا گیا ہے جو نکاح دائمی اور
نکاح منقطع کے معنی وضاحت سے ادا کر دے۔ لیکن اگر زوجیت کے لیے کسی لفظ کا مفہوم
نہ نہ ہے کہ علاوہ دوسرے معنی دے، جیسے معاوضہ، لین دین، اجارہ اور کرایہ تو وہ لفظ
نکاح دائم اور نکاح منقطع دونوں کے لیے کافی نہیں۔

میں اس مضمون میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چند فاضل جج صاحبان اور واقعی تجربہ کار قانون دان
مستند و خوش قسمتی سے ایسے حضرات عدالتوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ کہہ دین کہ مذکورہ، ”عشر ضابطہ قانون مدنی“
اور ”قواعد“ کے جاسکتے ہیں تو میں آج ہی سے ”زین روز“ میں اپنے تمام امتقادی مضامین روک لوں گا۔

نکاح موقت اور حرم سرا

(۲)

مشرق کے خلاف، مغرب کے پاس ایک شوٹ ہے جسے بار بار دکھاتا، فلم بناتا اور تھیٹر کرتا ہے وہ بات ہے حرم سرا۔ افوس ناک بات یہ ہے کہ مشرق کی سرزمین پر حرم سراؤں کے نمونے کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

مشرقی خلفا و سلاطین میں کچھ لوگوں کی زندگی ان داستانوں کا بھرپور نمونہ تھی۔ ان کی حرم سرا سازی، ان کی ہوس رانی و ہوس پرستی کی تصویر تیار کرتی ہے۔

کہتے ہیں۔ متعہ کو جائز سمجھنا، حرم سرا بنانے کی اجازت ہے۔ یورپ کے مقابلے میں ایشیا کا پکھنور پوائنٹ ہے۔ متعہ کا جواز، ہوس رانی کا جواز، ہوس رانی کا جواز، اور ہوس پرستی و ہوس رانی جس شکل و صورت میں، خلاف اخلاق و ترقی ہے۔ ذلت و تباہی کا باعث۔ تعدد ازواج کے بارے میں بھی یہی بات دہرائی جاتی ہے۔ یہ تو ایوانِ عشرت و حرم سرا بنانے کا جواز ہے۔

تعدد ازواج کی بحث ہم آگے کریں گے۔ درست تو ازدواجِ موقت ہی سے بحث کرنا اس موضوع کا دو طرح سے جائزہ لینا چاہیے، ایک اس زاویے سے کہ حرم سرا کی تشکیل کا عامل معاشرتی لحاظ سے کیا تھا؟ کیا قانونِ ازدواجِ موقت تشکیل حرم سرا و مشرق میں کوئی موثر ہے، یا نہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ ”قانونِ ازدواجِ موقت“ کے بنانے کا مقصد ضمنی طور پر ہوس رانی، اور چند افراد کے لیے حرم سرا بنانے کا جواز مہیا کرنا تھا، یا نہیں؟

حرم سرا سازی کے معاشرتی اسباب | پہلا حصہ۔ حرم سرا کی ایجاد دو عوامل کا نتیجہ ہے؛

۱. حرم سرا سازی کا پہلا عامل، خواتین کی پاکدامنی و تقویٰ ہے۔ یعنی ماحول کے اخلاقی ضابطے اور معاشرتی اصول ایسے ہوں جہاں عورت کو اجازت نہ دی جائے کہ جب کسی مرد سے جنسی رابطہ پیدا کر لے تو دوسرے مردوں سے تعلقات قائم کریں۔ معاشرے کے اس دبائے کی بنیاد پر عیاش آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عورتوں کا ایک ٹولہ جمع کرے اور حرم سرا تعمیر کرے۔

سادہ سی بات ہے۔ اگر اخلاقی و معاشرتی نقطہ نظر سے عورتوں پر پاکدامنی و تقویٰ کی پابندی نہ ہوتی اور عورت مفت یا بلا زحمت اپنے تئیں مرد کے سپرد کر سکتی اور مرد بھی ہر وقت ہر عورت سے ہوس رانی کر سکتے، تو مردوں کی مذکورہ صنف لمبی چوڑی حرم سرا میں نہ بناتے اور ان کے بھاری اخراجات اور انتظامات نہ کرتے۔

دوسرا عامل۔ اجتماعی عدالت کا فقدان۔ جب اجتماعی عدالت معدوم ہو۔ ایک سمندر میں ڈوب رہا ہو، نعمت و دولت کے سمندر میں۔ دوسرا کشتی میں پھنسا ہو۔ فقر و افلاس، معذوری و بے چارگی کی کشتی۔ مردوں کی وافر تعداد خاندان سازی و شادی سے محروم رہتے ہیں، اس سے غیر شادی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں حرم سرا کی تعمیر کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔

اگر اجتماعی عدالت ہو، خاندان کی تشکیل ممکن ہو، وسائل موجود ہوں اور ہر شخص شادی کر سکتا ہو تو لازمی طور پر ہر عورت کے لیے ایک مرد ہوتا اور عیاشی و ہوس رانی و حرم سرا کی تعمیر کا ماحول نہ بنتے پاتا۔

عورتوں کی تعداد مردوں سے کتنی زیادہ ہوگی، یعنی اگر تکمیل بالغ مرد شادی کر لیں تو اس کا امکان کہاں رہتا ہے کہ ہر آدمی حرم سرا بنواسکے یا ہر دولت مند آدمی ایک حرم سرا مالک ہو؟

تاریخ اپنی عادت کے مطابق درباروں اور خلفاء و سلاطین کی حرم سراؤں

کا تذکرہ کرتی ہے، ان کی کامرانیوں، عیش و عشرت کی تفصیل لکھتی ہے۔ اور محلوں کی دیوار تلے ناکامیوں، محرومیوں، مردہ حسرتوں اور آرزوں کے ساتھ مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی۔ ان کے بارے میں چپ رتبی ہے جن کو معاشے کے تقاضوں نے رفیق حیات ڈھونڈنے کی مہلت نہیں دی۔ بیسیوں اور سینکڑوں عورتیں حرم سرا میں زندگی بسر کر چکی ہیں۔ مگر ایسی عورتوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کو فطری حق سے محروم رکھا گیا اور انہیں ایک سوہر بھی نصیب نہ ہوا۔ وہ بیچاریاں تنہا زندگی کے دن کاٹ کر گذر گئیں۔

طے شدہ بات ہے، اگر معاشے پر پاک مہنی کار آج ہو۔ عورت کے لیے نقوے کی پابندی لگ جائے، جنسی کامیابی کا کیڈر نکاح بنا دیا جائے (دائم ہو یا منقطع) اور کوئی عورت ممکن نہ رکھی جائے۔ اقتصادی عدم توازن اور معاشرتی ناہمواری ختم کر دی جائے، مزایع شخص، انسانی طبیعی تقویٰ یعنی رفیق حیات حاصل کرنے کا اہتمام ہو تو حرم سرا کی تشکیل محال و ناممکن بن جائے۔

تاریخ پر سری نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قانون ازدواج موقت کا ذرہ برابر بھی دخل حرم سرا کی تعمیر و تشکیل میں نہیں تھا۔ عباسی خلفاء عثمانی سلاطین جو اس ضمن میں سب سے زیادہ بدنام ہیں۔ کبھی شیعہ مذہب کے وابستہ نہ تھے کہ قانون ازدواج منقطع سے استفادہ کرتے۔ شیعہ سلاطین باوجودیکہ اس قانون سے فائدہ اٹھا سکے اور نکاح موقت کر سکتے تھے، مگر وہ ہمیشہ عثمانی سرکشی اور تعداد و حالات کے برابر نہیں پہنچ سکے۔ یہ قصہ بھی خاص حالات اور خاص معاشے کی رجحان کی بنا پر ہے۔ صاحبان دانش اس کی تحقیق سمجھ سکتے ہیں۔

بحث کا دوسرا حصہ۔ آدمی ہر چیز میں شک کر سکتا ہے مگر اس بات میں کوئی شک و تردید نہیں کہ آسمانی مذاہب ہوس رانی کے لیے جواز مہیا کرتا ہے؟

خلاف ہیں، مذاہب نے خواہش پرستی کے خلاف محاذ لگایا ہے۔ اکثر ادیان و مذاہب کے لوگ

ترک ہو س و ترک خواہش کے لیے بڑی بڑی ریاضتیں چھیلتے ہیں۔

اسلام کے واضح اور مسلم اصول میں ایک بنیاد خواہشات کی پرستش سے مقابلہ ہے، قرآن مجید نے خواہش پرستی کو بت پرستی کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اسلام میں وہ شخص ملعون اور خدا کا قاتل نفرت انسان سمجھا گیا ہے جس کا مقصد ہی رنگارنگ عورتوں سے لذت حاصل کرنا ہو۔ ”ذواق“۔ طلاق پر بحث کے ضمن میں اس موضوع پر کچھ اسلامی مصادر و مدارک نقل کریں گے۔ متعدد شریعتوں کے مقابلے میں اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اسلام، ریاضت و ربانیت کو سترو کرتا ہے۔ ہو س رات کو جائز قرار دینے کے لیے نہیں، بلکہ اسلام کی نظر میں تمام انسانی جبلتیں، طبعی تقاضے، جنسی ہوں یا غیر جنسی۔ تقاضے کی حد میں رہیں اور طبیعت کی ضرورت بڑی حد تک پوری ہو جائے، ہاں، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ غرائز و جبلتوں کو ہوا دے اور انہیں نہ سمجھنے والی روحانی پیاس بنالے۔ لہذا، جو چیز بھی عیاشی، حرم سرا سازی اور ہو س ران افراد کی ہو س پرستی کا وسیلہ ہو، جس سے ایک عورت در بدر اور بچے لاوارث بنیں وہ غیر اسلامی ہے۔

اُمّ عیہم السلام کی طرف سے ازدواجِ مؤقت کی تشویق و ترغیب پر احادیث کی ثبوت کا ایک فلسفہ ہے جس پر عن قریب گفتگو ہوگی۔

آج کی دنیا میں حرم سرا | یہ بھی دیکھیے کہ آج دنیا میں حرم سرا کے لیے کیا ہوا ہے؟ آج کی دنیا حرم سرا کو منسوخ

چکی ہے۔ آج کل حرم سرا کو منسوخ کیا جا چکا ہے۔ ان دنوں حرم سرا کو ناپسندیدہ دم جانتے ہیں۔ اس کے سبب، عامل، وجود کو ختم کر دیا گیا ہے۔ مگر کون سا عامل و سبب؟ یا معاشرتی ناہمواریوں کو اٹھا دیا ہے اور اب تمام نوجوان شادیاں کرنے لگے، اس سبب سے حرم سرا بنانے کا عمل ختم ہو گیا؟

نہیں، ایک اور کام ہوا ہے۔ پہلا عامل و سبب یعنی عورت کی پاک و امنی و تقویٰ

نے مقابلہ کیا، اور مرد کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دی۔ تقویٰ اور پاک دامن جس قدر عورت کو قدر و قیمت بخشی ہے اس قدر مرد کے لیے رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ آج کی دنیا نے ایک کام کیا ہے، اس صدی کا خیال مرد، بڑے بڑے اخراجات برداشت کر کے حرم سرانہ کے متقاضی نہیں ہے۔ اس صدی کے مرد کو مغربی تمدن کی برکت سے ہر جگہ حرم سرانہ سے اس صدی کا مرد ضروری نہیں سمجھتا کہ ہارون رشید کو بھی برہمنی جیسی دولت کا مالک ہو پھر وہ اس تعداد میں رنگا رنگ عورتوں سے لذت اٹھائے۔

اس صدی کے مرد کو ایک موٹر کار اور ماہانہ دو تین ہزار روپے دنہی دس بیس ہزار روپے درکار ہیں۔ وہ جنس خواتین سے ایسی عیاشی اور لطف اندوزی کر سکتا ہے جو ہارون رشید نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ ہوٹل، رستورانٹ اور کافی، حرم کے عوض اپنے یہاں مردوں کو بلارہے ہیں۔

”عادل کو تولی جیسے بہت سے مرد اس صدی میں سینہ تان کر کہتا ہے۔ وہ بیک وقت بائیس حینائیں، مختلف شکل و صورت کی عورتیں، میرے پاس ہیں۔ اس صدی کے مرد کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ اس قرن کا مرد مغربی تمدن کی برکت سے اگر کچھ کھو کا ہے تو وہ وسیع اخراجات اور زحمت و درد کے ساتھ حرم سرانہ ہے۔

اگر الف لیلا کا میر و قہر نے نکل آئے اور عیش و عشرت کے وسیع امکانات اور سستی یا بلا قیمت ملنے والی ماڈرن عورت کو دیکھ لے، تو کسی صورت میں اتنے زیادہ اخراجات اور مصیبتوں کے ساتھ حرم سرانہ کی جرأت نہ کرے۔ یورپ والوں نے حرم سرانہ کے انتظامات اور زحمتوں سے اسے معاف کر رکھا ہے۔ وہ اس بات پر ان کا شکر گزار ہوتا۔ تعداد اور دلچسپی اور نکاح مؤقت ختم ہے، کیونکہ یہ سب عورتوں کی ذمہ داری اور جواب دہی کا بوجھ ڈالنے والے کام ہیں۔

اگر آپ پوچھیں کہ آج اور کل اس کمیل میں بازی جیتنے اور کھیل ہارنے والا کون ہے؟

سوس کے ساتھ اس کا جواب یہ ہے کہ آج اور گزشتہ زمانے میں بھی جو بازی ہاری ہے۔ وہ
 اہم اور سادہ دل۔ جنس خاتون۔ ہے۔

ازدواج موقت سے خلیفہ کی ممانعت

ازدواج موقت، فقہ جعفری کے خصوصیات میں ہے
 دوسرے فقہی سلسلے اسے جائز نہیں جانتے۔ میں کسی
 انداز سے بھی شیعہ سنی بحث و جس نے اسلام کو کمزور کیا ہے، میں حصہ لینے کو تیار نہیں ہوں
 صرف مسئلہ کی مختصر تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ضروری جانتا ہوں۔

مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے کہ صدر اسلام میں متعہ جائز تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں ان مسلمانوں کو متعہ کی اجازت دی تھی جن کی بیویاں دور تھیں
 ان پر بھی اتفاق ہے کہ دوسرے خلیفہ نے اپنی خلافت میں متعہ کو حرام کر دیا تھا۔ انھوں نے
 ایک مشہور جملہ فرمایا: ”دو چیزیں زمانہ پیغمبر میں جائز تھیں میں ان دونوں کو حرام قرار
 دیتا ہوں، جو بھی وہ دونوں کام کرے گا میں سزا دوں گا۔ متعہ زن۔ اور متعہ حج۔“
 اہل سنت کے ایک گروہ کے خیال میں، رسول اکرمؐ نے آخر عمر میں خود، متعہ کو ممنوع
 کر دیا تھا اور دوسرے خلیفہ کی ممانعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تھی۔
 لیکن یہ عبارت جناب خلیفہ کی طرف سے نقل ہے وہ اس مدعا کے خلاف ہے۔

اس مفہوم کی صحیح تعبیر وہی ہے جسے علامہ کاشف الغطاء نے پیش کیا ہے خلیفہ نبیال
 مرید حق رکھتے تھے کہ وہ اس بارے میں پابندی لگا سکیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں
 کے ولی امر کے دائرہ اختیار میں تھا اور جو حاکم و ولی چاہے وہ قاضائے وقت کے مطابق
 رسم کے اختیارات سے فائدہ اٹھائے۔

دوسری لفظوں میں خلیفہ دوم کی ممانعت سیاسی تھی شرعی و قانونی نہیں تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اپنی قیادت کے زمانے میں صحابہ کے دور دراز علاقوں میں منتشر ہونے کو پسند نہ کرتے تھے، وہ تازہ مفتوحہ علاقوں میں پھیلنے اور نو مسلم قوموں سے میل ملاپ کے بارے میں اپنی پریشانی نہ چھپاتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے انھیں مدینے سے باہر پھیلنے سے روکتے رہے۔ لہذا وہ اس بات کو بہت برا جانتے تھے کہ نو مسلم جو بھی اسلامی تعلیمات کی گہری تربیت سے آراستہ نہیں، ان کے خون سے ان مسلمانوں کے خون کی آمیزش ہو۔ وہ آئندہ نسل کے لیے اسے خطرہ سمجھتے تھے۔ کھلی سی بات ہے کہ یہ مصلحت وقتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمان ان کی ممانعت کو ایک سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت سمجھ کر حکم مان گئے۔ نہ کہ دائمی قانون۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ خلیفہ وقت یہ کہے کہ پیغمبر نے یوں حکم دیا ہے اور میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں، پھر مسلمان بھی اسے مان لیتے۔

لیکن بعد میں خصوصی واقعات کی وجہ سے "سیرت خلفاء ماسبق" خصوصاً پہلے دو خلیفہ۔ یہ اصول بن گیا اور تعصب اس درجہ پر پہنچ گیا، کہ اس نے قانون کی شکل حاصل کر لی۔ اس صورت حال میں خود ہمارے سنی بھائیوں پر جو اعتراض ہے وہ خود جناب خلیفہ سے زیادہ ہے خلیفہ نے بطور سیاسی اور وقتی ضرورت کے — جیسے ہماری صدی میں سیکرٹیرز آف شیرازی نے تمباکو نوشی حرام کی تھی — نکاح منقطع کو حرام کیا، دوسرے کو یہ حق نہ تھا کہ اسے دائمی قانون بنا لیتے۔

۱۔ ناصر الدین شاہ قاجار نے برطانوی کمپنی سے ایران میں تمباکو کی پیداوار اور فروخت کے ٹیکے کا معاہدہ کر لیا جو ایرانی عوام و مردم کے لیے انتہائی خطرناک تھا اس وقت مرزا محمد حسن شیرازی نے تمباکو نوشی کی حرمت کا فتویٰ دے دیا جو انقباض اور برطانوی تواضع کے خلاف اس نتیجہ انقلاب پر منتج ہوا جس کے مشرور قائم ہوئی۔

ظاہر ہے کہ علامہ کا شرف الخطا شیخ محمد حسین کی نظر میں یہ بحث نہیں ہے کہ خلیفہ کا یہ مسئلہ اصلاً صحیح تھا یا نہیں؟ یہ بھی زیر نظر نہیں کہ آیا مسئلہ متعوان مسائل میں ہے بھی جن پر خواہ سواری ہی دیر کے لیے کیوں نہ ہو، مسلمانوں کا شرعی ولی قدغن لگا سکتا ہے یا نہیں؟ زاویہ نظر فریب ہے کہ شرع میں جو بات ہوئی ہے، اس کا عنوان یہ تھا، اور یہی سبب کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔

خلیفہ کی شخصیت اور اثر، عوام کا ان کی سیرت و رویہ کو اپنا حکمرانی کے معاملے میں ان کے طور و طریقوں کا انداز سبب تھا کہ یہ قانون بھول کی نذر ہو گیا اور یہ دستور جو نکاح دائمی کی تکمیل کا ذریعہ تھا، ہمیشہ کے لیے متروک ہو گیا، نتیجہ میں متعدد مشکلات پیدا ہوئے۔

ائمہ معصومینؑ کو دین مبین اسلام کا محافظ سمجھا جاتا ہے اسی بنا پر ان حضرات نے اسلام کے اس دستور کو فراموشی اور گم نامی سے بچانے کے لیے بڑھ چڑھ کر تشویق کی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک بات جسے بیان کرنے میں کبھی تقیہ نہ کروں گا، وہ مسئلہ "متعہ" ہے۔ اسی نکتہ پر "تشریع متعہ" کی مصلحت و حکمت ثانوی حکمت اولی سے مل جاتی ہے۔ اور وہ ہے "متروک شدہ دستور" کا احیا۔ میرے نقطہ نظر سے، جہاں جہاں ائمہ اہل بیتؑ نے شادی شدہ مردوں کو متعہ سے منع کیا ہے وہاں، "قانون کی حکمت اولیہ" کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مطلب یہ تھا کہ قانون متعہ ان لوگوں کے لیے وضع نہیں کیا گیا جن کو ضرورت نہیں ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے علی بن قیطن سے فرمایا: تمہیں متعہ کرنے کی ضرورت کیا ہے، خدا نے تمہیں بے نیاز کیا ہے۔

دوسرے شخص سے فرمایا: متعہ اس کے لیے ہے جسے اللہ نے بیوی کے ہوتے ہوئے اس کے لیے بے نیاز نہ کیا ہو جس کی بیوی ہو وہ صرف اس صورت میں متعہ کر سکتا ہے جب اپنی بیوی پر دسترس

نہ رکھتا ہو۔“

جہاں عمومی طور پر ترغیب و تشویق کی بات ہے وہاں اس قانون کی دوسری جہت سامنے رکھی گئی ہے، یعنی ”متروک ستور کی بحالی“ ورنہ فقط ضرورت مند افراد کو ترغیب و تشویق سے مقصد کا حصول کافی نہ تھا۔

شیعہ روایات سے یہ مطلب بخوبی واضح ہے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ قانون ساز کے پیش نظر اورائمہ طاہرین کے سامنے ترغیب و تشویق کا مدعا جانور صفت انسانوں کے لیے ہوس رانی و حرم سراسازی کا بہانہ مہیا کرنا نہ تھا، یہی نہیں کہ چند ناواقفِ حال خواتین اور بے سرپرست بچوں کو جبر و مشکلات میں مبتلا کیا جائے۔

حضرت علی علیہ السلام
کی ایک حدیث۔

زن روز شمارہ ۸۷ میں جناب مہدوی لکھتے ہیں:
بو زہرہ کی ”کتاب الاحوال الشخیہ“ میں امیر المؤمنینؑ

سے منقول ہے:

”لا اعلم لحداً اتمتع وهو محصن الا رجمته بالجحارة“

جناب مہدوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نا اہل آدمی نے متع کیا ہے میں اس پر ”زنا محصن“ کی

حد، سنگری کی سزا جاری کروں گا۔“

پہلی بات۔ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ حضرت علیؑ کی حدیث کے سامنے ہمیں سرسبزِ خم

کرنا ہی چاہیے تو، حضرت کی اتنی حدیثیں جو شیعہ و غیر شیعہ کتابوں میں درج ہیں اور

متع کی تائید و تاکید کرتی ہیں انھیں کیوں چھوڑا جائے اور ایک ایسی روایت جس کے راوی

علماء اہل سنت کے ایک عالم ہیں۔ قبول کر لی جائے، پھر اس کی بھی سند معلوم نہیں۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کے قیمتی ارشادات میں سے ایک یہ ہے:

”اگر آپ کے نہ بڑھتے اور متعہ کو حرام نہ کرتے، تو بد نصیب افراد کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔“

یعنی اگر متعہ حرام نہ کیا جاتا تو غیر بڑھ کے جبر سے متاثر ہو کر کوئی شخص زنا پر آمادہ نہ ہوتا۔ یہ وہی لوگ کرتے جو قانون شکنی کو ترجیح دینے کے عادی ہیں۔

دوسری بات — مذکورہ بالا عبارت کے معنی ہیں :

”جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نا اہل آدمی نے متعہ کیا ہے اسے سنگسار کروں گا۔“
مجھے نہیں معلوم جناب مہدوی نے محسن کے معنی ”نا اہل“ کہاں سے لکھ دیے جبکہ اس کے معنی ہیں ”وہ شخص جس کی بیوی ہو“۔

بنا بریں روایت کا مطلب ہے کہ جن کی شادی ہو چکی، بیوی موجود ہے، انھیں متعہ کرنے کا حق نہیں۔ اگر مقصد یہ ہوتا کہ متعہ کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، تو ”وہو شخص“ کی قید بے معنی ٹھہری گی۔ خیر۔ اگر اس روایت کی کوئی بنیاد ہے تو اس سے تائید ہوتی ہے اس نظریے کی جو کہتے ہیں :

”قانون متعہ ان لوگوں کے لیے وضع ہوا ہے جو عورت کے محتاج ہے

مجرد ہیں، یا ان کی بیویاں ان کے پاس نہیں ہیں۔“

یعنی یہ روایت ”متعہ“ کے جواز کی دلیل ہے نہ کہ حرمت متعہ کی۔

تیسرا حصہ :

عورت اور معاشرتی آزادی

- — پیدا ہونے سے پہلے شوہر۔
- — لڑکیوں کا تباہی۔
- — حضرت علیؑ کی خواستگاری کے جواب میں آنحضرتؐ کا جواب
”میں فاطمہؑ کے سامنے بات رکھوں گا۔“
- — خواتین کا اسلامی انقلاب — سفید — تھا۔
- — اسلام کے نزدیک باپ مختار مطلق نہیں ہے.....
- — مرد بندہ خواہشات، عورت اسیر محبت۔
- — اسلام نے عورت کو بے اختیار نہیں کیا۔ اس کو مردوں کی سکا دوستی
سے بچایا ہے۔
- — بیٹی پر باپ ولایت — ایک بحث۔

سرنوشت کے انتخاب میں آزادی

پریشاں و ہراساں لڑکی رسول اکرمؐ کے حضور میں پہنچی :
 یا رسول اللہ! اس باپ کے ہاتھوں
 آخر تمہارے باپ نے کیا کیا ہے تجھ سے ؟
 — ایک بھتیجے سے، میرے مشورے کے بغیر میری شادی کر دی !
 — اب تو وہ کر چکا، تم ٹپ ہو جاؤ مخالفت نہ کرو۔ تائید کرو اور چچا زاد کی بیوی
 بن کر رہو۔
 — یا رسول اللہ! چچا زاد سے مجھے محبت نہیں، ایسے شخص کی بیوی کیسے بنوں جس سے
 محبت نہیں کرتی ؟
 — اگر اس سے محبت نہیں، کوئی بات نہیں۔ تمہیں اختیار ہے، جاؤ جس سے تمہیں
 محبت ہے اسے اپنا شوہر بن لو !
 — اتفاقاً میں اس کو بہت چاہتی ہوں۔ اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتی۔
 اس کے سوا کسی کی بیوی نہیں بن سکتی۔ بات تو اتنی ہے کہ میرے والد نے مجھ سے رائے
 کیوں نہ لی۔ میں جان کر حاضر ہوئی ہوں کہ آپ سے سوال جواب کروں اور یہ جملہ سن لوں،
 خواتین جہاں کو تبادلوں کہ باپ بطور خود حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اپنی بیٹیاں جس کو ان کا
 دل چاہے اس کے حوالے کر دیں۔

شہید ثانیؒ نے ”مسالك“ اور شیخ حسنؒ نے ”جواہر الکلام“ میں اور دوسرے فقہاء اہل سنتؒ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ جاہلیت عرب میں غیر عربوں کی طرح باپ اپنی بیٹیوں، اپنی بہنوں کو بھی تو اپنی ماں کے بارے میں اپنا حق یہی سمجھتے تھے کہ جس سے چاہیں بیاد دیں۔ اور خواتین بے اختیار تھیں۔ وہ اپنی پسند اور اپنے اختیار سے شوہر کا انتخاب نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ اختیار ان کے خیال میں باپ کو پھر بھائی اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں چچا کو حاصل تھا۔

اختیار کے استعمال کی حد یہاں تک پہنچی کہ لڑکیاں پیدا ہونے سے پہلے، مرد کے رشتے میں دے دی جاتی ہیں، لڑکی کے پیدا ہونے اور بڑی ہونے کے بعد اس مرد کو حق تھا کہ وہ لڑکی کو اپنے لیے لے جائے۔

جنم سے پہلے نکاح | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری حج تھا، ایک روز آپؐ ہاتھ میں کوڑا لیے سوار جا رہے تھے، ایک آدمی راستہ

روک کر کہا:

— ایک شکایت ہے!

— بیان کرو!

— چند برس پہلے، جاہلیت کے دنوں میں، میں اور طارق ابن مر قع ایک جنگ میں شریک ہوئے، مصروفیات جنگ میں میرے کی ضرورت پڑی۔ اس نے پکار کر کہا: کوئی ہے جو مجھے نینرہ پہنچا کر مزدوری لے! میں آگے بڑھا اور پوچھا کیا مسئلہ دو گے؟ اس نے کہا: میرے یہاں

۱۔ شہید ثانی، زین الدین ابن علی ابن احمد العالی (۹۱۱ - ۹۶۶ھ) کی کتاب فقہ مفصل کا نام ہے سالک۔

شرح مع بھی انھیں کی تالیف ہے۔

۲۔ جواہر الکلام، شریعت الاسلام کی مفصل شرح کے مصنف تھے شیخ محمد حسن نجفی متوفی ۱۲۶۶ھ۔

۳۔ سنی کتابوں میں دیکھیے السنن، ابن ماجہ، ص ۵۷۸

شیعہ کتابوں میں دیکھیے جواہر الکلام، چاپ بیروت ج ۲ ص ۱۷۷

بولٹکی پیدا ہوگی وہ تمھاری، اسے پال پوس کر جواں کروں گا۔ میں نے عملہ منظور کر لیا اور اپنا
نیزہ اسے دے دیا۔ قصہ ختم ہوا، جنگ کو کئی برس گزر گئے۔ ایک دن خیال آیا، خبر لو چھی،
معلوم ہوا اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اب وہ شادی کے قابل ہے۔ میں طارق کے پاس
گیا اور وہ بات یاد دلانی اور اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ اس نے جیلے حوالے اور بہانے کرنے
شروع کر دیے۔ وہ مجھ سے دوبارہ مہر لینے کی فکر میں ہے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا
ہوں، یہ فرمائیے میں تہی پر ہوں یا وہ؟

— لڑکی کا سن کیا ہے؟

— لڑکی بڑی ہو چکی ہے، سکے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔

— اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو حق پر تم ہو، نہ طارق۔ غریب عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دو،
اور تم اپنا کام کرو۔

وہ آدمی حیران ہوا، پیغمبر علیہ السلام کو دیکھتا رہا۔ سوچ رہا تھا، یہ کیسا فیصلہ ہے۔ باپ کو
اپنی بیٹی پر اختیار نہیں۔ میں لڑکی کو نیا مہر، باپ کو دے دوں اور وہ اپنی خوشی و رضامندی
سے اپنی لڑکی میرے حوالے کر دے تو غلط کام ہوگا۔؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی بھٹی بھٹی نگاہوں کو دیکھ کر سمجھ گئے، اس
پریشانی خیال کو مدحوظ فرما کر کہا:

— ”پریشان نہ ہو، میں نے جو بات کہی ہے اس سے نہ تم گنہگار ہو گے نہ تمھارا دوست
طارق۔“

”لڑکیوں کا اولہ بدلہ :“ لڑکیوں پر باپ کے مکمل اختیار کا ایک منظر نکاحِ شغار
تھا۔ نکاحِ شغار یعنی لڑکیوں کا عوض معاوضہ۔ دو

آدمیوں کی دو لڑکیاں شادی کے قابل ہوں۔ لوگ ان کا ادل بدل کرتے تھے۔ یعنی
ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر بنتی تھی۔ اسلام نے یہ دستور منسوخ کر دیا۔

حضرت علی علیہ السلام طلب گاری حضرت
زہراؓ رضیہ کے لیے حاضر ہوئے۔ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت
علیؓ کو جواب دیا، اب تک کئی آدمی طلب

رسول اللہ نے اپنی صاحب زادی
حضرت زہراؓ کو انتخاب ہر س آزاد رکھا

کے لیے آئے، میں نے خود ان کی بات زہراؓ سے کہی، انہوں نے چہرے کے آثار سے اظہار
نامنظوری کیا۔ اب میں تمہاری بات بھی کہوں گا۔

پیغمبرؐ، فاطمہؓ زہراءؓ کے پاس گئے اور پیاری بیٹی کو رشتے کا آیا بوا پیام سنایا۔ پیدہ عالمیا
نے، منہ نہ پھیرا اور خاموش بیٹھی رہیں، سکوت سے رضا مندی کا اظہار دیکھ کر آنحضرتؐ
تجیر کہتے ہوئے فاطمہؓ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے۔

خواتین کے لیے اسلام نے بہت بڑی خدمتیں انجام
دی ہیں۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ بیٹی پر باپ کے
تمام تر اور مکمل اختیارات واپس لے لیے۔ بلکہ اسلام

اسلامی تحریک میں
خواتین کا اعلیٰ سفید

نے عورت کو مکمل آزادی اور شخصیت عطا کی۔ فکر و نظر کو آزادی بخشی، عورت کے طبعی
حقوق کو قانونی حیثیت دی۔ حقوق خواتین کے بارے میں اسلام نے جو اقدامات کیے ہیں
اور یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے، دوسرے ممالک جو اس کی لہ میں بہہ رہے ہیں۔ ان کا جائزہ
لیا جائے تو اسی طور پر دو فرق ملیں گے۔

ایک تو زن و مرد کے نفسیات کے زاویہ نظر سے فرق ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں
مبغضہ دکھایا۔ ہم آئندہ اوراق میں اس پر گفتگو کریں گے اور کچھ مثالیں سامنے رکھیں گے۔
دوسرا فرق یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ وہ خواتین کو ان کے انسانی حقوق، ان کی
شخصیت و حیثیت و آزادی و خود مختاری دے رہا تھا۔ اس لمحہ جنس مرد سے انھیں بے جا و
کشی و نافرمانی پر نہیں ابھارا اس نے کبھی بھی مردوں سے بدبینی اور ان کے بارے

میں غلط اندیشی کی تحریک نہیں کی۔

خواتین کا انقلاب سفید تھا، سیاہ، سرخ، نیلا اور بنفشی نہ تھا۔ یہ انقلاب بیٹوں سے باپ کا احترام اور بیٹوں سے شوہروں کا احترام چھیننے نہیں آیا۔ اسلام کے انقلاب نے گھریلو زندگی کی بنیاد نہیں ہٹائی، بیویوں کو شوہروں کی خبر گیری اور ماں کو تربیت اولاد سے بدظن نہیں بنایا، بے شادی شدہ لڑکوں کے لیے ایسے وسائل نہیں پیدا کیے جن کے ہمارے وہ معاصر میں مفت کے نکار کھیل سکیں، خواتین کو شوہروں کی پاکٹ غوش اور بیٹیوں کو ماں باپ کے سایہ مہر و محبت سے نکال کر افسروں اور سرمایہ داروں کے حوالے نہیں کیا۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ اُسوؤں کے سمندر میں طوفان اٹھے۔ ہائے، گھر کا امن و سکون تباہ ہو گیا، باپ کے دل سے اطمینان چھن گیا۔ اس افراتفری میں آدمی کیا کرے؟ نومو لوڈ بچوں کا قتل، اسقاط، کا علاج کیا ہے؟ چالیس فی صد ناجائز بچوں کی پیدائش کا حل کیا ہے؟ نومو لوڈ بچے، جن کا باپ نہیں ملتا، ماؤں نے یہ بچے اپنے گھروں میں جنے ہیں۔ چاہئے والے باپ کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے۔ ان کا اس بچے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بچہ ”پرورش گاہ“ کے حوالے کر دیا جاتا ہے، وہاں کوئی ان کی خبر لینے نہیں آتا۔ ہمارے ملک میں ”خواتین کے انقلاب“ کی ضرورت ہے۔ لیکن سفید اسلامی انقلاب مغربی کالی کلوٹی انقلابی تحریک درکار نہیں۔

ایسا انقلاب جس میں شہوت پرست جوانوں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ وہ انقلاب جو براہ راست اسلام کے اعلیٰ تعلیمات سے مستفید ہو۔ یہ نہیں کہ اس کا مدعا صرف ”قانون مدنی“ بدانا ہو۔ یعنی اسلام کے مسلم قوانین ہوں وہ جس کا نشانہ بنائے جائیں۔ وہ انقلاب جس کی پہلی منزل عمتی اور گہرا مطالعہ ہو تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آئے کہ جس معاشرے کا نام اسلام سے وابستہ کیا گیا ہے، وہ کس حد تک اسلام کو نافذ کرتا ہے۔

فدا کی توفیق سے اگر یہ سلسلہ مضامین باقی رہا تو اہم مسائل کو مکمل کرنے کے بعد خواتین

اسلامی انقلاب کا ایک پروگرام شائع کروں گا جس کا نفع ہو گا کہ ایسی نواتین واقعاً ایک ایسا انقلاب لاسکتی ہیں، جو نیا اور دنیا پسند بھی ہو اور منطقی و بادلیل ہونے کے ساتھ ساتھ چودہ سو سالہ اسلامی تعلیمات کے سرچشمے سے سرب بھی ہو جس میں مغرب کی طرف بھیک کا ہاتھ نہ پھیلا یا گیا ہو۔

باپ کی اجازت : باپ، لڑکی کا ولی ہے۔ یعنی، کیا دوشیزہ لڑکیاں جو پہلی مرتبہ شادی کرنا چاہیں انھیں باپ کی اجازت لینے

کی شرط ہے یا نہیں؟

اسلام کی نظر میں
چند باتیں طے شدہ ہیں :
لڑکا اور لڑکی اگر اقتصادی طور پر خود کفیل ہوں بالغ و عاقل، "نیز رشید" بھی ہوں۔ یعنی معاشرتی لحاظ سے ان کا فکری معیار اس قدر ہو جس کی بنیاد پر وہ اپنے مال کا تحفظ و نگہداشت کر سکیں، ان کا سرمایہ ان کے ہاتھ میں رہ سکے۔ تو ماں یا باپ، ماں یا شوہر، بھائی یا کسی دوسرے آدمی کو ان پر نظارت و دخل اندازی کا حق نہیں ہو سکتا۔

دوسری طے شدہ بات شادی کے بارے میں ہے۔ اولاد، بالغ ہونے کی عمر پہنچ جائے، عقل و رشد بھی ہو۔ تو اپنے بارے میں وہ خود مختار ہیں، کسی کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں۔ لڑکیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی ایک مرتبہ شوہر کرچکی ہے اور اب بیوہ ہے تو وہ بھی لڑکے کی طرح خود مختار ہے اور کسی کو اس کے معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ ہاں اگر دوشیزہ ہے اور اس کا پہلا نکاح ہے تو...؟
باپ کو مکمل اختیار نہیں، لڑکی کا عذریہ اور اس کی رضامندی کے بغیر جس کے ساتھ یہ نہا جائے نہیں بیاہ سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہم نے دیکھا ہے بچے بچگی کی رائے کے بغیر نکاح کر دیا تو آپ نے فرمایا: "پسند نہیں تو دوسرے کے ساتھ

شادی کر سکتی ہو۔ فقہاء میں اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے کہ آیا دوشیزہ لڑکیاں، باپ کی رضامندی حاصل کیے بغیر شادی کا حق نہیں رکھتیں؟ یا باپ کا اتفاق رائے کسی طرح شرط صحت نکاح نہیں ہے؟

البتہ ایک مسلمہ قطعی و مسلمہ ہے کہ اگر باپ کسی سبب کے بغیر لڑکی کے نکاح کو منع کریں تو ان کا حق (ولایت) ساقط ہو جاتا ہے۔ اور بالفاق تمام فقہاء لڑکی انتخاب شوہر میں مکمل آزادی کی مالک ہیں۔

یاد رکھ لیں کہ باپ کی رضامندی شرط ہے یا نہیں؟ ہم نے بتایا کہ فقہاء میں اختلاف ہے۔ شاید اکثر فقہاء خصوصاً متاخرین علما (آخری دور کے فقہاء) باپ کی رضامندی کو شرط نہیں جانتے، مگر بعض علما متاخر شرط جانتے ہیں۔ ہمارے ”قانون مدنی“ نے دوسرے گروہ کے فتوے کو قانون بنایا ہے کیونکہ احتیاط کا راستہ یہی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے کیونکہ مسلمہ مورد اتفاق نہیں اس لیے ہم اسلامی نقطہ نظر سے بحث بھی نہیں کرتے۔ البتہ معاشرتی لحاظ سے بحث ضروری سمجھتا ہوں اس کے علاوہ میری رائے میں ”قانون مدنی“ نے صحیح راہ اختیار کی ہے۔

بن بیہی لڑکیوں پر لازم — حکم از کم ان کے لیے اچھا ضرور ہے۔ کہ باپ کی ہم خیالی کے بغیر کسی مرد سے شادی نہ کریں۔ اس کا فلسفہ یہ نہیں ہے کہ لڑکی کو ناقص

مرد بندہ شہوت اور عورت اس پر محبت ہے

اور معاشرتی لحاظ سے اس کا شعور مرد سے کمتر سمجھا گیا ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو سولہ برس کی بیوہ اور اٹھارہ برس کی بن بیہی میں فرق کیا ہوگا، سولہ برس کی عروسی بیوہ ہو باپ کی رضامندی کی پابند نہ ہو اور اٹھارہ برس کی بن بیہی رضاد پدر کی پابند ہو۔ پھر یہ بات بھی دیکھیے، اگر لڑکی اسلام کی نظر میں اپنے معاملات میں ناقص سمجھی جاتی تو بالغہ و رشیدہ لڑکی اپنے مالی امور اور ملینوں، بلینوں سرمایے کے معاملے میں، باپ بھائی

اور شوہر کے راضی ہونے یا اجازت لینے کی پابندیوں نہیں؟ اور انھیں دینے کا حق کیوں نہیں؟ اس کے اقدامات صحیح اور وہ سب سے زیادہ کیوں ہے؟ دراصل یہاں ایک دوسرا فلسفہ ہے۔ فقہی دلائل سے قطع نظر۔ اس فلسفے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور ”قانون مدنی“ تیار کرنے والوں کی اس بنیاد پر داد دینا چاہیے۔

بات، عورت میں کمی یا عقلی و فکری نقص ہی کی نہیں۔ اس کا تعلق مرد و عورت کے نفسیات سے ہے۔ اس کا ربط ایک طرف مرد کی فطرت، شکار پسندی اور دوسری طرف عورت کے حسن ظن سے ہے وہ مرد کی وفا، سچائی اور محبت پر جلدی سے ایمان لے آتی ہے۔ مرد، خواہشات کا غلام اور عورت اس پر محبت ہے، مرد کے پیر شہوت سے لڑکھڑا جاتی ہیں مگر باہرین نفسیات کے بقول عورت، جنسی خواہشات کے بارے میں مرد سے زیادہ صابر و پابدار ہے۔ ہاں، عورت کو حبت کرنے والی چیز انہماں محبت و خلوص، وفا و خلوص ہے وہ مرد سے یہ باتیں سن کر لڑکھڑا جاتی ہے۔ عورت کی خوش فہمی یہاں کھل جاتی ہے۔ عورت جب تک بن بیاتی ہے، جب تک اس کے لباس نے مرد کا صابن مس نہیں کیا، اس وقت تک وہ مرد کے زمزمہ محبت کو جلدی سنتی اور ماننے لگتی ہے۔

معلوم نہیں آپ نے ”زن روز“ کے شمارہ نمبر ۹۰ میں، ”مرکبی ماہر نفستیا کا مضمون پڑھا یا نہیں؟ پروفیسر ”ریگ“ کے مضمون کا عنوان تھا ”عورت و مرد کے لیے دنیا ایک جیسی نہیں ہے۔“ پروفیسر لکھتا ہے کہ بہترین فقرہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ ہے ”پیاری! میں تمھیں چاہتا ہوں۔“ روزمرہ و محاورہ۔ پھر ”ریگ“ نے لکھا۔ ایک عورت کے وسطے سب سے بڑی خوش نصیبی، ایک مرد کا دل موہنا، اس کی زندگی بھر دیکھ بھال ہے۔“ رسول اکرمؐ، وہ نفستیا کے خدائی ماہر اس حقیقت کو چودہ سو برس پہلے بیان کر چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”میں تمھیں چاہتا ہوں۔“ ایسا جملہ ہے جو عورت کے دل سے نہیں نکلتا۔ ”شکاری مرد و عورت کی اس نفسیاتی کمزوری سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔“ ”پیاری“

ہم تو تمہارے عشق میں مر رہے ہیں۔ مردوں کے تھکھنڈوں سے ناواقف لڑکیوں کیلئے یہ بہترین جال ہے۔

”زن روز“ کے تازہ شماروں میں، افسر نامی خاتون کی داستان چھپ رہی ہے۔ یہ خاتون خودکشی کرنا چاہتی ہے۔ جو اپنے اس کو فریب دے رکھا تھا، بات کچھری تک پہنچی اور زبان زد عام ہو گئی۔ جو اپنے افسر کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے، مذکورہ فارمولے سے فائدہ اٹھایا، بقول رسالہ زن روز، افسر کہتی ہے:

”میں نے اس بات کو نہیں کی، مگر ہر ساعت اور ہر لمحے اسے دیکھنے کو سڑتی تھی“ میں تو عاشق نہ تھی، مگر جس عشق کا اظہار وہ کرتا تھا اس سے میری روح کو نیاز ضرور تھی۔ ساری عورتوں کا حال یہی ہے ”عشق“ کو پسند کرنے سے پہلے ”عاشق“ پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ لڑکیوں اور خواتین کی پیدائش سے پہلے، عاشق ان کے بعد عشق پیدا ہوتا ہے۔ اس قانون میں بھی مستثنیٰ نہ تھی۔“

تجربہ کار، بیوہ پر یہ تازہ واردات بیت گئی تو نا تجربہ کار لڑکیوں کا حال کیا ہوگا۔ یوں لازم قرار پایا کہ ”مرد ناموزدہ“ لڑکی باپ کی رضا مندی بہر حال حاصل کرے۔ باپ مرد کے احساسات، جذبات و نفسیات سے بہتر آگاہ ہوتے ہیں۔ چند افراد وحالاً کو چھوڑ کر، باپ اپنی بیٹی کی خیر خواہی کے طلب کار ہوتے ہیں۔ لہذا ان سے مشورہ مفید و لازم ہے۔

قانون، اس نکتے پر کسی انداز سے بھی عورت کی توہین نہیں کرتا۔ اس نے تو حمایت کا ہاتھ کا ندھے پر رکھا ہے۔ اگر لڑکا دعویٰ کرے کہ قانون نے انھیں باپ یا ماں کی رضا حاصل کرنے کا پابندیوں نہیں کیا۔ تو ان کا دعویٰ منطق کے خلاف نہ ہوگا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو لڑکیوں کی ہم آہنگی پر پر معترض ہیں۔

”عجب کرتا ہوں، لوگ روزانہ“ بیوک و نہرہ“ عادل و نسرین“ کے افسانے

ورڈ رے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ پھر لڑکیوں کو اولیا کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ ان کے کردار میں تضاد محسوس کرتا ہوں۔ عورت کے بارے میں ان کی ہمدردی و غم خواری دیکھے، پھر سکاریوں کے لیے سکاڑیا کر کے، گولیاں دیتے اور لڑکیوں کے گتے کو ہنگامہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔



”زن روز“ شمارہ ۸۸ میں چالیس نکاتی قرارداد کے مصنف نے کہا ہے: ”دفعہ ۱۰۴۳۔ بلوغ و رشد سے متعلق تمام دفعات، کی مخالف اور ان کو توڑنے والی دفعہ ہے۔ نیز آزادی انسان اور منشور اقوام متحدہ کے خلاف.....“

معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے سوچ رکھا ہے کہ مذکورہ دفعہ باپ کو حق دیتی ہے کہ جسے چاہیں اپنی بیٹی دے دیں اور انھیں بلاوجہ شادی روکنے کا بھی حق ہے۔

باپ غلط اندیش اور بدنیت نہ ہو، جو لڑکی کو شادی ہی نہ کرنے دے۔ اس صورت میں لڑکیوں کو با اختیار مان کر شادی کے صحیح ہونے کی شرط باپ کی رضامندی مان لی جائے تو کیا خرابی ہے، اور انسانی آزادی کے منشور کی کیا خلاف ورزی ہے؟ یہ تو ایک احتیاطی اقدام اور پیش بندی ہے۔ ان خواتین کے لیے جن کا سابقہ تجربہ کچھ نہیں ہے۔ اور مرد کی جبلت و طبیعت کے بارے میں بے اطمینانی کی وجہ سے یہ احتیاطی تدبیر کی گئی ہے۔

مضمون نگار کہتے ہیں :

”ہمارے قانون ساز نے تیسرے برس کی لڑکی کو شادی کے قابل قرار دیا ہے۔ ابھی اس کی فکری نشوونما پوری نہیں ہوئی۔ اصولاً اسے شادی کے معنی اور بیوی بننے اور شوہر بنانے کا مطلب بھی نہیں آتا۔ ایسی مخلوق جو دو چار سیر ترکاری بھی نہیں خرید سکتی، تیسرے کہ شادی کرے اور زندگی بھر کا ساتھ قبول کرے۔ اس کے متعلق مین پیمیں یا چالیس سالہ خاتون، تعلیم یافتہ، یونیورسٹی کی ہوا کھلے، اعلیٰ درجے کی دانش ور کو شادی کا حق نہیں،

بلکہ ضروری ہے۔ وہ بے پڑھے باپ یا دادا سے اجازت اور رائے حاصل کرے ...“
پہلے تو قانون کے کس جزے اپنے یہ دریافت کیا کہ تیس برس کی لڑکی باپ کی اجازت سے
بغیر شادی کر سکتی ہے اور چھیس یا چالیس برس کی لڑکی ”دانش گاہ دیدہ“ قانون شادی نہیں
کر سکتی۔ دوسرے بے کربا پ کی اجازت انھیں حدود میں ہے جہاں وہ جذبہ پدری اور مرد
کے ان احساسات کا اندازہ کر سکے جو عورتوں کے بارے میں ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اگر رکاوٹ
بننے کا روپ دھارے تو اس کی اجازت بے قیمت ہے۔

تیس برس میں نہیں سمجھا کہ عہد قدیم سے آج تک کوئی ایسا جج پیدا ہوا اور دکھائی دیا
ہوا جس نے ”قانون مدنی“ کی رو سے کہا ہو کہ فکر و عقل کی پختگی (رشد عقلی) شادی میں
شرط نہیں ہے۔ اور بقول مضمون لگا۔ تیس سالہ لڑکی جسے شادی اور انتخاب شوہر کے معنی معلوم
نہ ہوں وہ شادی کر سکتی ہے۔

قانون مدنی، دفعہ ۱۱۲ میں ہے :

”دو معاملہ کرنے والے اہل سمجھے جائیں، اس کے لیے بالغ و عاقل و رشید

ہونا چاہیے۔“

قانون کے اس فقرہ میں اگرچہ ”معاملہ کرنے والے“ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے
اور باب نکاح۔ معاملہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک مجموعی عنوان ہے۔ ”عقود، معاملات،
پابندیاں“ یہ پیرا گراف دفعہ ۱۸۱ سے شروع ہوتا ہے۔ قانون مدنی کے ماہرین نے دفعہ
۱۱۲ کو ”اہلیت عام“۔ عمومی صلاحیت۔ کے طور پر مانا ہے۔ یہ اہلیت تمام ”عقود“ میں
دجہاں جہاں صیغہ ”معینہ جاری کیا جائے“ لازمی قرار دی ہے۔

تمام پرانی دستاویزوں اور نکاح ناموں میں ”بالغ و عاقل و رشید“ کے بعد شوہر کا
نام اور ”بالغ و عاقل و رشیدہ“ کے بعد بیوی کا نام لکھا ہوا موجود ہے۔ ”قانون مدنی“ کے مرتب
کرنے والے اس نکتے سے کیونکر غافل رہ سکتے تھے۔

”قانون مدنی“ کے مرتبین باور نہیں کر سکتے تھے کہ فکری گراوٹ یہاں تک پہنچے گی کہ غوی بہت بیان کرنے دینے کے باوجود باب نکاح میں دوبارہ ”بلوغ و عقل و رشد“ کے لیے ایک دفعہ لکھنا چاہیے۔

دفعہ ۱۰۶۴ پر قانون مدنی کے ایک شارح جناب ڈاکٹر سید علی شاہ گان فرماتے ہیں۔ ”عاقق کو بالغ و عاقل و بارادہ ہونا چاہیے“۔ موصوف نے سوچا کہ اس کا تعلق میاں بویا سے ہے اور آن نکاح کی اہلیت کا بیان ہے۔ رشد کا تذکرہ موجود نہیں لہذا فیصلہ کر دیا کہ مذکورہ دفعہ ۱۰۶۴ کے خلاف ہے جس میں عام اہلیت کا تذکرہ ہے۔ یہ کہنے کے بعد توجیہ کرتے ہیں کہ دفعہ ۱۰۶۴ اگر ”عاقق کے بارے میں ہے اور وہاں ضروری نہیں کہ رشد ہو۔“

یہاں محل اعتراض ایرانی عوام کا طریق کار ہے، نہ قانون مدنی پر اعتراض ہو سکتا ہے نہ قانون اسلام پر۔ ہمارے عوام کی اکثریت میں اب بھی دور جاہلیت کی طرح باپ اپنے تئیں مکمل اختیار کا مالک سمجھتے ہیں۔ اور انتخاب شوہر و شریک زندگی اور نسل آئندہ کے باپ کے بارے میں لڑکی کی رائے کا اظہار بے حیائی و تہذیب کے خلاف جانتے ہیں۔ فکری پختگی (رشد فکری) جسے لڑکی کے بارے میں اسلام مسلم جانتا ہے۔ توجہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ کتنے ہی نکاح ہیں جو لڑکیوں کے رشد سے پہلے ہو چکے، حالانکہ وہ غیر منوثر اور شرعاً باطل تھے۔ عقد کرنے والے، لڑکی کے رشد کے بارے میں چھان بین کرتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک لڑکی کا بالغ ہونا کافی ہے۔ دریاں حالیکہ بڑے بڑے علما کے بہت سے واقعات ہمارے علم میں ہیں، انھوں نے لڑکیوں کے عقلی و فکری پختگی کے تجربے کیے ہیں۔ کچھ علما، لڑکی میں شد دینی دینی پختگی کو شرط مانتے ہیں۔ یہ علما صرف انھیں لڑکیوں کا عقد پڑھتے تھے جن کو سوال دین پر استدلال کرنا آتا تھا۔ افسوس، آج کل بچوں کے اکثر ولی اور نکاح کرنے والے ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔

عوام کے رویوں پر گفتگو چونکہ مطلوب نہیں، لہذا سارے پیالے پیالیاں "قانونِ مدنی" کے سر پر توڑنا چاہیے، عوام کے ذہن اس "قانونِ مدنی" کے خلاف کرنا چاہیے جو قوانینِ اسلام سے پیدا ہوا ہے۔

میری نظر میں "قانونِ مدنی" پر جو اعتراض ہوتا ہے وہ دفعہ ۱۰۴۲ سے مربوط ہے یہ دفعہ کہتی ہے۔

"پندرہ برس پورے کرنے کے بعد بھی لڑکیاں جب تک اٹھارہ سال کی نہ ہو جائیں اس وقت تک ولی کی اجازت کے بغیر شوہر نہیں کر سکتیں۔"

اس دفعہ کی رو سے، پندرہ اور اٹھارہ برس کے درمیانی عمر کی بیوہ بھی بلا اجازت ولی، شادی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ فقہِ شیعہ اور عقلی بنیاد پر، جو عورت شرائط کے مطابق بالغ و رشیدہ ہے۔ ایک مرتبہ شادی کر چکی ہے تو اسے باپ کی اجازت و رضا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھا حصہ :

اسلام اور بدلتی زندگی

- — وقت کے تقاضے۔
- — دین اور وقت کے تقاضے نہرو کی نظریں۔
- — اسلام زندگی کی ترقیوں سے الطباق، غیروں کے لیے تعجب آفرین ہے۔
- — اسلام نے مستقل ضروریات کے مستقل ضابطے اور ادلتی بدلتی ضرورتوں کے لیے غیر مستقل ضابطوں کو پیش نظر رکھا ہے۔
- — اگر سچیز کو زمانے سے منطبق رہم آہنگ کریں تو خود زمانے کو کس سے ہم آہنگ بنائیں؟
- — زمانے سے اسدم کی ناہم آہنگی، ایک گروہ کے جمود اور ایک گروہ کی جہالت کا نتیجہ ہے۔
- — قرآن نے، اسلامی معاشرے کی تشبیہ اس سبزے سے دی ہے جو پھلک رہا ہو۔
- — ”صدی کی پیداوار“ ایسی اصطلاح ہے جس نے بہت سے خاندان تباہ کر دیے۔

- — جامد (غیر متحرک) ہمیشہ پرانی چیز سے جوڑ کھاتی ہے اور جاہل ہر تباہی کا سبب تقاضائے زمانہ بتاتے ہیں۔
- — قوانین اسلام کی تکنیک میں ایسے جوڑ اور موڑ ہیں جن کی بدولت اس میں حرکت اور مڑنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔
- — ہیٹ پہننا حرام نہیں، دم چھلنا بنا حرام ہے۔
- — اسلام ”قاعدہ ضرر“ و ”قاعدہ حرج“ کے لئے ”ویٹو“ کا قائل ہے۔

(خلاصہ از مؤلف)

اسلام اور بدلتی زندگی

①

زمانے کے تقاضے : | مقدمہ کتاب ”انسان و سرنوشت“ میں، مسلمانوں کے عروج و زوال کے مسئلے پر بحث کر چکا ہوں۔ وہاں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں موضوع کے تین حصے کر کے بحث و تحقیق کی ہے۔ اسلام کا حصہ۔ مسلمانوں کا حصہ۔ اجنبی عوامل کا حصہ۔

اس مقدمہ میں جن ستائیس نکات پر تحقیق کی ضرورت پر زور دیا ہے، ایک موضوع یہ بھی ہے۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے کہ ”اسلام اور مقتضیاتِ زمان“ پر ایک کتابچہ لکھو گا چنانچہ کچھ نوٹ بہت دنوں سے تیار کر رہا تھا۔

مقالات کے اس سلسلے میں، سب باتیں تو لکھنا مشکل ہیں، تفصیل کے لیے تو مستقل کتاب ہی ہونا چاہیے۔ ہاں، اس موضوع پر یہاں اتنا ضرور لکھوں گا جو مختصر طور پر قاری کے ذہن کو منور کر دے۔

مذہب و ترقی۔ ایسا موضوع ہے، ہم مسلمانوں سے پہلے، اور ہم سے زیادہ دوسرے مذاہب و اہل مذاہب کے سامنے آتا رہا ہے۔ دنیا کے بہت سے روشن دماغ اس لیے مذہب چھوڑ بیٹھے کہ ان کے خیال میں مذہب اور آئے دن بدلتی ہوئی زندگی میں جوڑ نہیں بیٹھتا۔ دونوں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ان کی سوچ میں دینداری، ٹھہراؤ اور سکون کا نام ہے۔ مذہب حرکت اور تبدیلی سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ دوسری عبارت میں، وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ثبات، یک رخ، اور شکل و صورت کی یکسانیت چاہتا ہے۔

انجمنانی نہرو، ہندوستان کے وزیر اعظم، مذہب کے خلاف تھے۔ اور (بقول خود) کسی دین و مذہب کے قائل نہ تھے۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے نبود اور اس کے منفرد رویے سے بیزار ہو گئے تھے۔ نہرو، زندگی کے آخری دور میں اپنے اندر اور پوری دنیا میں ایک خلا محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے خیال میں یہ خلا روحانی طاقت ہی سے پر ہو سکتا تھا اس کے باوجود، مذہب کے منفرد رویے اور اس کے جمود کی بنا پر۔۔۔ بحیال خود۔۔۔ ہر مذہب سے گھبراتے تھے۔

”کرنجیو“ ایک ہندی نامہ نگار نے ان کی آخری عمر میں ایک نشر ویڈیو جو فارسی میں چھپ چکا ہے۔ غالباً یہ ان کے آخری نظریات تھے جو دنیا کے مجموعی حالات پر انھوں نے ظاہر کیے، ”کرنجیو“ گاندھی کے بارے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے:

چند روشن خیال و ترقی پسندوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی نے آپ کے نفسیاتی اور روحانی احساسات میں تبدیلی پیدا کی اور آپ کے فکری سوشلزم کو متاثر اور کمزور کر دیا؛

نہرو نے کہا:

..... روحانی اور باطنی رویوں سے فائدہ اٹھانا ضروری اور اچھا ہے۔

میں اس بارے میں گاندھی کے عقیدے سے متفق تھا، اور اب ان وسائل سے فائدہ اٹھانے کو زیادہ ضروری سمجھتا ہوں، اس دور میں روحانی خلا کی وجہ سے نئے تمدن نے فروغ حاصل کر لیا ہے۔ ہمیں کل کے مقابلے میں آج روحانیت سے جواب لینے کی ضرورت زیادہ ہے۔

کرنجیو، مارکسزم کے بارے میں سوالات کرتا ہے اور نہرو مارکسزم کی نارسائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دوبارہ اسی روحانی راہوں کی بات کرنے لگے۔ کرنجیو نے سوال کیا: مسٹر نہرو! اس وقت آپ کے تاثرات جن میں اخلاقی و روحانی طریقوں سے

مسائل کا حل ممکن سمجھتے ہیں، تو کیا جناب والا، اور کل کے جواہر لال میں۔ نہرو کی جوانی۔ کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر نہرو عمر کے سورج ڈھلنے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

نہرو:

جی ہاں، تبدیلی تو محسوس کرتا ہوں، مشکلات حل کرنے کے بارے میں جن اخلاقی و روحانی معیاروں کی بات کر رہا ہوں وہ بے فکری و نادانستہ حالت میں نہیں ہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ اخلاق و روحانیت کو بلند سطح پر لایا کیسے جائے۔

اس کا جواب خود ہی دیا۔ سامنے کی بات ہے اس مقصد کے لیے مذہب موجود ہے۔ افسوس، مذہب کو تاہ نظری، اور خشک رسم و رواج اور جسم بے روح بن چکا ہے۔ کچھ کلفا ہیں اور ظاہری شکل و صورت اور اوپری خول رہ گیا ہے۔ اس کی روح اور حقیقی مقصد ختم ہو چکا ہے۔

اسلام اور وقت کے تقاضے: | دنیا بھر کے مذاہب و ادیان میں کسی مذہب نے انسان کی زندگی میں اتنا دخل

نہیں دیا جس قدر اسلام کا عمل دخل ہے۔ اسلام نے اپنے پروگرام میں، چند عبادتوں اور کچھ ذکر و اذکار، پھر اخلاقی نصیحتوں ہی کو نہیں رکھا ہے۔ وہ تو جس طرح، اللہ اور بندے کے روابط پر روشنی ڈالتا ہے اسی طرح بندگانِ خدا کے تعلقات، انسانوں کے رشتے، ان کے حقوق، فرائض اور ایک فرد کے دوسرے فرد، ایک فرد کے معاشرے سے رنگارنگ تعلقات بھی دکھاتا اور بتاتا ہے۔ اسی وجہ سے "زمانے" کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کے مقامات زیادہ موجود ہیں۔

اتفاقاً، بیرونی دنیا کے بہت سے مفکروں اور منصفوں نے معاشرتی و ٹہری قانون سازی

کے زاوے سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے قوانین اسلامی کو ترقی پسند مانا ہے ان کے خیال میں اسی بنیاد پر اسلام زندہ جاوید ہے، اس کے قوانین میں اتنی صلاحیت ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ان کا انطباق کیا جاسکے، اسی لیے قابل توجہ اور لائق تعریف ہیں۔ ”بڑا ڈشادہ“ انگلستان کا آزاد خیال، مشہور مصنف نے کہا ہے:

”میں ہمیشہ دین محمدؐ کا احترام اس لیے کرتا ہوں کہ اس میں زندہ رہنے کی نکتہ خاصیت ہے۔ میری نظر میں فقط اسلام ہی ایک ایسا راستہ ہے جو زندگی کے حالات و تغیر پذیر زندگی میں ہم آہنگی اور اقتدار پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل صدیوں کے لیے ہے۔“

میں پیشین گوئی کرتا ہوں۔ اس کے آثار اب بھی نمایاں ہو رہے ہیں کہ ”محمدؐ کے عقائد“ نے والے یورپ کے واسطے قابل قبول قرار پائیں گے۔“

”قرون وسطیٰ“ کے عمامہ جہالت یا تعصب کی بنا پر آئین محمدؐ کی سیاہ خدیو خال بناتے رہے۔ انھوں نے عوام کو کینہ و دشمنی سے متاثر ہو کر آپ کو ضد مسیح بتایا۔ میں اس شخصیت کے بارے میں۔ فرد بلند از سطح عوام و خواص۔ مطالعہ کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف یہی نہیں کہ وہ ضد مسیح نہ تھے بلکہ ان کو نجات دہندہ بشر کا لقب دینا چاہیے۔ میرا عقیدہ ہے، اگر ان جیسا صاحب اختیار آج کی دنیا میں آجائے تو مشکلات و مسائل دنیا کا حل یوں کر دے کہ دنیا صلح و سعادت انسانی کا گہوارہ بن جائے۔

ڈاکٹر شبلی شمل، مادہ پرست، لبنانی عرب نے پہلی مرتبہ ڈارون کے فلسفے کو بوخمر جرمنی کی شرح کا ضخیمہ ملا کر عربی میں ترجمہ کیا اور مذہبی عقائد پر حملے کی صورت میں عربی زبان جاننے والوں کے سامنے پیش کیا۔

میٹر یا سٹ ہونے کے باوجود، اسلام کی حیرت انگیزی اور خوبوں کی تعریف کیے بغیر نہ رد سکا اس نے اسلام پیش کرنے والے (رسول) کی تعریف کی اور اسلام

کو دوا می طور پر زندہ آئین اور زمانے کے مطابق قرار دیتے ہوئے ستائش کی۔
 "فلسفۃ النشوء والارتقاء" کی جلد دوم میں انہوں نے ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ "القرآن
 والعمران"۔ مقالے میں ایک سیاح کے خیالات کی تردید کی ہے۔ وہ سیاح اسلامی
 ملکوں میں آیا تھا اور وہاں کی زبانوں حالی کا سبب اس نے اسلام بتایا تھا۔

شبلی شمل نے اپنے مقالے میں مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کے تعلیمات اسلامی
 سے انحراف کو قرار دیا ہے اور کوشش کر کے ثابت کیا ہے کہ اسلام کے معاشرتی اصول چھوڑنے
 کے نتیجے میں زوال رونما ہوا ہے، اسلام سے نہیں۔ اس نے کہا۔ مغرب کے لوگ جو اسلام پر
 حملہ کرتے ہیں وہ یا تو اسلام کو نہیں جانتے یا نیت اچھی نہیں۔ وہ مشرقی لوگوں کے دلوں
 سے ان قوانین سے دل چسپی ختم کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کی زمین سے ابھرے ہیں۔ وہ اپنی
 غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں یہ سوال عام ہے کہ آیا اسلام تقاضائے وقت کے مطابق ہے یا نہیں؟
 مجھے مختلف طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ و تجربہ کار حضرات کے ساتھ
 بروقت کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میرے حلقے میں سب سے زیادہ یہی سوال گردش کرتا ہے۔

کبھی اپنے اس اشکال کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے
 اعتراضات : دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ انسانی معاشرہ بھی اسی طرح تغیر

پذیر ہے۔ لہذا بدلتے معاشرے کے قوانین ناقابل تغیر کیسے ہو سکتے ہیں؟

سوال کو اگر صرف فلسفی انداز سے دیکھیں تو جواب بہت صاف ہے۔ جو کچھ مسلسل
 حالت تغیر میں ہے، نیا ہے پرانا ہوگا، نشوونما کے بعد زوال پذیر ہوگا۔ ترقی و ارتقاء میں
 ہے۔۔۔۔۔ یہ سب کائنات کا مادی اور ترکیبات مادی کا حال ہے۔ لیکن جہاں تک قوانین
 کائنات کا تعلق ہے، وہ بہر حال ثابت و قائم ہیں۔ زندہ مخلوق و موجودات اپنے مخصوص
 قانون کے مطابق، تکامل پیدا کرتے ہیں۔ یہ قوانین اہل دانش بیان کر چکے ہیں۔ خود زندہ

موجود کے اندر ہمیشہ ٹوٹ پھوٹ اور ترقی جاری رہتی ہے۔ مگر ان کے قوانین میں تغیر و ارتقا نہیں ہے اور ہماری گفتگو قوانین ہی کے بارے میں ہے۔ اب اس میں کوئی فرق نہیں۔ قانون زیر بحث طبعی ہو یا وضعی و موجداتی، سب کا حکم ایک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وضعی قوانین ممکن ہے طبیعت و فطرت سے ماخوذ ہوں اور ان سے افراد یا انسانی معاشروں کا وہ راستہ بننا جو جس پر وہ اپنا ارتقائی سفر کرتے ہیں۔

رہے وہ سوالات جن میں اسلام اور تقاضائے وقت کے ہم آہنگ ہونے نہ ہونے کی بات کی جاتی ہے۔ ان میں نقطہ فلسفیانہ یا کلیاتی بات نہیں ہوتی۔

ایک سوال ہر سوال سے زیادہ دھرایا جاتا ہے۔ ”قوانین ضرورت کے پیش نظر بنائے جاتے ہیں اور انسان کے مجموعی ضروریات پائدار و یکساں نہیں ہیں۔ لہذا اجتماعی قوانین بھی پائدار و یکساں نہیں ہو سکتے۔“

سوال اچھا اور بہت قیمتی ہے۔ اتفاق کی بات، دینِ مبین اسلام کے معجزانہ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ایسا ہے جس پر سمجھ دار اور دانشمند مسلمان فخر محسوس کرتا ہے۔ یعنی اسلام، فرد یا معاشک کے پائدار ضروریات کے لیے پائدار قانون رکھتا ہے اور ضروریات انسانی کی بدلتی صورتوں میں اس کے قوانین میں لوح اور لچک بھی ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے جہاں تک مناسب ہوا، تفصیلی بات کریں گے۔

خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے؟
دلاتے ہیں؛ بحث شروع کرنے سے پہلے دو باتیں یاد

پہلی بات یہ ہے کہ ترقی پسندی اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کا دم بھرنے والے، معاشرے کی ہر تبدیلی کو ترقی سمجھ لیتے ہیں۔ خصوصاً اگر وہ تبدیلی یورپ سے آئی ہو وہ اسے ارتقائی عمل ضرور مانتے ہیں۔ آج کے عوام میں سب سے زیادہ گمراہ کن یہی فکری رجحان دامنگیر ہے۔

اس گروہ کے خیال میں چونکہ زندگی کا ساز و سامان روزانہ بدل رہا ہے، ناقص کی جگہ کامل آ رہا ہے۔ علم اور ٹیکنک میں ترقی ہے۔ لہذا انسانی زندگی میں جو تبدیلیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں وہ ایک قسم کی ترقی و پیش رفت ہیں، اور ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ وقت کا جبر ہے وہ اپنا راستہ خود صاف کر لے گا۔

حالانکہ نہ تو ہر تبدیلی براہ راست علم و صنعت کا نتیجہ ہے اور نہ ضرورت و جبر حاصل دخل ہے عین اس حالت میں کہ علم ترقی کر رہا ہے ہوس پیشہ طبیعت، درندہ مزاج بشریت بھی خالی نہیں بیٹھی ہے۔ علم و نقل انسان کو کھماں کی طرف بڑھاتی ہے اور طبیعت کی ہونانی، و بشری درندہ مزاجی خود آگے بڑھ کر انسان کو فساد و انحراف کی راہ پر کھینچتی ہے۔ طبیعت کی ہوسناک و درندہ مزاجی کوشش کرتی رہتی ہے کہ علم کو اپنے لیے حربہ بنائے اور اپنی شہوانی و حیوانی ہوس کے لیے استعمال کرے۔ جس طرح زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے اسی طرح اس سے مقابلہ بھی کرنا ضروری ہے۔ دنیا کے اصلاح پسند اور رجعت پرست دنیا کی ترقی کے خلاف نبرد آزما رہا کیے ہیں۔

اگر زمانے کی تبدیلیوں اور تغیرات کو تمام اچھائیوں اور برائیوں کا پیمانہ مان لیں، تو خود زمانے اور اس کی تبدیلیوں کا علم حاصل کرنے کے واسطے کون سا ذریعہ استعمال ہوگا، اگر سرچینہ کا انطباق اور ہر بات کی تطبیق زمانے سے کرنا ہے تو خود زمانے کی تطبیق کس سے کریں؟ اگر انسان دست بستہ ہو کر زمانہ اور تبدیلیوں کا تابع ہو جائے تو خود انسان کی خلافت، فعالیت اور اس کے ارادے کی صناعی کہاں جائے گی؟

انسان، وقت کی سواری پر بیٹھا ہے، اور سفر کر رہا ہے۔ اسے لمحہ بھر کے لیے بھی اس کی راہنمائی سے غفلت نہ رہنا چاہیے۔ جو حضرات فقط زمانے کی تبدیلیوں کے گیت گاتے رہتے ہیں، اور اس کی رہبری سے غافل ہیں، وہ انسان کے تعمیری عمل کو بھلا رہے ہیں۔ وہ اس گھوڑے سوار کے مانند ہیں جو گھوڑے کی باگ ڈور

اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اپنے من میں اس کے حوالے کر دے۔

الطباقی یا نسخ؟ دوسری بات۔ ”اسلام اور تقاضائے وقت“ کا حل بعض حضرات نے ایک فارمولے کے ذریعے نکالا، یہ فارمولا بہت

سادہ اور آسان ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اسلام جاودانی دین ہے۔ ہر زمانے کے مطابق ڈھل سکتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کیسے؟ اس کے الطباقی کا فارمولا کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں: جب دیکھیں کہ زمانہ بدلیں گیا، فوراً اس کے قوانین منسوخ کر دیں، اس کی جگہ دوسرے قوانین لے آئیں!

چالیس نکات کے مصنف نے شکل کا یہی حل پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں، دنیا کے بارے میں ادیان کے قوانین کو نرم اور مڑے جھکنے کے قابل ہونا چاہیے۔ تقاضائے وقت پر منطبق ہو سکیں، یہ بات اسلام کے تعلیمات کے برخلاف نہیں بلکہ اس کی روح بالکل مطابق ہے۔ (رسالہ زین روز شمار، نوے، صفحہ ۷۵)

مقالہ نگار موصوف نہ کورڈ ہالاجیل کے آگے پیچھے فرماتے ہیں۔ چونکہ زمانے کے تقاضے بدل رہے ہیں اور ہر وقت نئے قانون کی ضرورت ہے۔ اسلام کے مدنی و معاشرتی قوانین جاہلیت کے عرب رسم و رواج کے مطابق اور ان کی سادہ زندگی سے ہم آہنگ تھے لہذا اس وقت ٹھیک تھے۔ آج کے زمانے سے وہ ہم آہنگ نہیں ہیں، لہذا آج کے لیے آج کا قانون بنا ضروری ہے۔

اس قسم کے خیریت سے پوچھا جائے۔ گزر زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوانین منسوخ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر کون سا قانون ہے جس میں یہ لوچ نہیں ہے؟ کون سا قانون ہے جو اس معنی میں زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہے؟

اسلام کی زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی بیاں کردہ پچک اور ہم آہنگی کی مثال تو وہی

ہے کہ ایک شخص کہے: کتاب و کتاب خانہ عمر سے مزے لوٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس سے پوچھیے اس کا مطلب؟ وہ جواب دے۔ یعنی جب آدمی لطف و لذت کا خیال کرے فوراً اسے بچ کر اس کی قیمت عیش و نوش میں خرچ کر دے۔

مضمون نگار موصوف فرماتے ہیں: اسلامی تعلیمات کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم اصول عقائد، جیسے توحید و نبوت و قیامت وغیرہ۔ قسم دوم، عبادات۔ جیسے مقدمات و متعلقات نماز و روزہ و وضو و طہارت و حج وغیرہ۔ تیسری قسم، وہ قوانین جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں۔

پہلی دوسری قسم تو دین کا جز ہیں، انسان کو ذاتی طور پر ہمیشہ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ رہی تیسری قسم، تو وہ دین کا جز نہیں۔ کیونکہ دین کو عوامی زندگی سے سروکار نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان چیزوں کو جز دین کے طور پر نہیں لائے تھے۔ ان کا تعلق فریضہ رسالت سے نہ تھا۔ اتفاق کی بات ہے، آپ حکمراں بھی تھے لہذا یہ کام بھی کرتے رہے۔ ورنہ دین کی شان تو فقط اسی میں ہے کہ آدمی کو نماز، روزے کے لیے تیار کرے دین کا انسانوں کی دنیاوی زندگی سے کیا تعلق؟

میں یقین نہیں کر سکتا کہ جو شخص ایک اسلامی ملک میں زندگی بسر کرتا ہو وہ اسلام کی منطق سے اتنا بھی ناواقف ہو سکتا ہے۔

کیا قرآن مجید نے انبیاء و مرسلین کا نصب العین نہیں بتایا ہے؟ کیا قرآن مجید نے پوری وضاحت سے یہ نہیں کہا؟

لَقَدْ آتَيْنَاكَ سُلْطٰنًا بِالْبَيِّنٰتِ وَآتَيْنَاكَ مَعَهُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ
ليقوم الناس بالقسط۔

ہم نے اپنے تمام رسولوں کو روشن دلائل اور کتاب اور ترازو کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ عوام میں انصاف قائم کریں۔

قرآن نے ”اجتماعی عدالت“ کے قیام کو پیغمبروں کا اصل نصب العین بتایا ہے۔ اگر آپ قرآن پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو آگے بڑھ کر اس سے بڑا جرم کیوں کرتے ہیں، اسلام اور قرآن پر تہمت لگاتے ہیں؟ آج انسان کے سر پر جو مصیبتیں آرہی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ دین؟ جو سب کا پشتیبان اور بہار ہے اسے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہی تو منہ خدا و اخلاق و قانون کا حشریہ ہے۔

”اسلام بہت اچھا ہے، بشرطیکہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں رہے، معاشرے سے سروکار نہ رکھے۔ ہم یہ ترانہ، آدھی صدی سے سن رہے ہیں۔ یہ نغمہ، اسلامی سرحدوں کے پاؤں اٹھا تھا وہاں سے اسلامی دنیا میں آیا اور اس کا خوب پروپیگنڈا ہوا۔ چھوڑیے، ہم اس کا عام فہم زبان میں مطلب بتائیں اور سادہ لفظوں میں لکھیں۔ اس طرح ان دعوے داروں کی بات زیادہ وضاحت سے بیاں ہو سکے گی۔

خلاصہ مدعا یہ ہے۔ ”اسلام جہاں تک کیونززم کے مقابلے کے لیے، اسے آگے رکھو اسے باقی رہنا چاہیے۔ مگر جہاں، مغربی منافع سے ٹکرائے اسے راستے سے ہٹ جانا چاہیے۔ یورپ کے نزدیک، اسلام کے عبادتی طور طریقے باقی رہیں کوئی حرج نہیں۔ کیونززم کے خلاف اسے ایک اسکاوی تحریک اور دشمن خدا فلسفہ کہہ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کے سماجی ضابطے، جو مسلمانوں کی زندگی کا فلسفہ ہیں۔ مسلمان جب تک اسے مانتے رہیں اس وقت تک وہ یورپ کے مقابلے میں آزادی اور انفرادیت کا احساس بیدار رکھیں گے۔ یہ بات مغرب کے لیے ان کے ہضم کرنے میں رکاوٹ بنے گی۔ اسے درمیاں سے ہٹانا ضروری ہے۔

افسوس ہے کہ یہ نکتہ ایجاد کرنے والے، یہ تھیوری پیش کرنے والے غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں۔

لے شہید کی نہایت خوبصورت و معنی خیز عبارت ہے (تبدیل شدہ)

پہلے آ رہا ہے :

”ثو من بعض و تکف ببعض“

”ہم کچھ مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے“ ایسا ”اصول“ ہے جسے قرآن مجید نے پندرہ سو برس پہلے ہی مسترد کر دیا ہے۔

دوسرا یہ ہے :

میرے خیال میں، وقت آپکا ہے کہ مسلمان اب ان شعبہ بازیوں کا سکار نہ ہوں، علوم کی انتقادی قوت کھم و بیش بیدار ہو چکی ہے۔ وہ امتیاز کرنے لگے ہیں کہ انسانی علم و فکر کی طاقت کہاں کہاں سگوفہ بہار کا سبب ہے اور کہاں کہاں فساد و انحراف کا باعث ہے۔ چاہے وہ یورپ سے متعلق کیوں نہ ہو۔

اسلامی دنیا کے عوام پہلے سے زیادہ اسلامی تعلیمات کی قوت و قیمت کو سمجھ چکے ہیں، وہ نصب العین بنا چکے ہیں کہ زندگی کا مستقل مخلص اسلام اور اسلامی ضوابط ہیں وہ کسی قیمت پر یہ حقیقت ضائع کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔

مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کے خلاف پروپیگنڈا، استعمار اور سامراج کی ایکٹ چال ہے۔

تیسرا یہ ہے :

یہ تھیوری دریافت کرنے والے سمجھیں کہ اسلام میں اگر اسلحہ کے مقابلے کی قوت ہے تو اس میں غیر اسلحہ کی نظام سے بھی فکری لینے کی صلاحیت ہے۔ یہ اسی وقت ہے جب وہ

نہجہ ما شیعہ از مہ

ترجمہ: ”اپنا کنگڈوم این تھو گورنوائڈ“ — ”تھو تھریسیس میں“ — ”تھیس“ ہے انگریزی میں — ”THESES“

”DISSERTATION“ کہتے ہیں۔

ایک فلسفے کے طور پر معاشرے میں بالادستی و حاکمیت پیدا کرے، مساجد اور عبادت خانوں میں محدود نہ رہے۔ جو اسلام عبادت گاہوں میں ٹھہاتا ہے وہ افکار اہل یورپ کے لیے میدان خالی چھوڑ دیتا ہے، بلکہ وہ تو مغربی افکار کی مخالفت کا محاذ بھی چھوڑ دیتا ہے۔ اسلامی ممالک پر یورپے جو غضب ڈھایا ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

اسلام اور بدلتی زندگی

(۲)

انسان، معاشرہ اور عقل | انسان فقط ایسا جاندار نہیں جو اجتماعی زندگی کا عادی ہے۔ بہت سے حیوانات، خصوصاً حشرات، اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا ایک حکیمانہ نظام و دستور ہے جس کے پابند ہیں۔ اصول تعاون، تقسیم کار، تولید و تقسیم، حکمرانی، فرماں برداری، ان کی زندگی میں حکم و اطاعت کا عمل موجود ہے۔

شہد کی مکھی، چیونٹی کی بعض قسمیں اور دیکھ جا زندگی، تمدن (ان کا خاص تمدن) نظام اور انتظامات سے فیضیاب ہیں۔ برس برس بلکہ صدیاں گزر جائیں تب جا کر انسان، اشرف مخلوقات ان تک پہنچے۔

ان کا تمدن، انسانی تمدن کے برخلاف عہد بہ عہد تقسیم نہیں ہوتا۔ پہلے جنگل پھر پتھر اس کے بعد لوہے کا دور اور اب ایٹم کے زمانے تک پہنچا، انہوں نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی یہ تمدن یہ انتظامات اور یہ دنیا بنی بنائی دیکھی، آج بھی وہی اسلوب ہے اور کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہ انسان ہے۔ "اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ (قرآن) اس کی زندگی زبردستی سے شروع ہو کر لا انتہا کی طرف جا رہی ہے۔

جانوروں کے لیے وقت کے تقاضے یکساں ہیں۔ دنیا کے تقاضے ان کی زندگی کو دگرگوں نہیں کرتے، جدت پسندی اور نو پرستی ان کے لیے بے معنی ہے۔ ان کے

یہاں نئی پرانی دنیا کا فرق نہیں ہے۔ علم ان کے لیے روزانہ نئے انکشافات نہیں کرتا بلکہ بھاری صنعتیں جدید سے جدید تر، کامل سے کامل تر ان کے بازاروں کو انقلاب نہیں لاتیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جہلی (غریزہ کی) زندگی گزارتے ہیں عقل سے دور ہیں۔

انسان کی زندگی اجتماعی اور ہمیشہ تغیر پذیر بلکہ تبدیلیوں کی زد پر ہے۔ ہر صدی میں اس کے لیے دنیا بدل جاتی ہے۔ اس کے اشرف مخلوقات ہونے کی بنیاد بھی یہی ہے انسان، طبیعت کا فرزند بالغ و رشید ہے۔ وہ ایسی منزل پر فائز ہے، جہاں اسے براہ راست طبیعت کی نگہداشت و سرپرستی کی ضرورت نہیں۔ غریزہ (شرست) نامی چیز اپنی مرموز (اندرونی و اشاراتی) ہدایت کرے۔ انسان اس سے آزاد ہے وہ غریزہ کے بجائے عقل کی زندگی گزارتا ہے۔

طبیعت نے انسان کو بالغ سمجھ کر آزاد کر دیا ہے۔ اپنی سرپرستی سے دست کش ہو گئی ہے۔ حیوان جو کچھ اپنے غریزے اور قانون طبیعت کے ماتحت بے چون چڑا کرتا ہے، انسان وہی کام اپنے علم اور وضع شدہ قانون و شریع سے کرتا ہے جس سے سربا بی بھی ممکن ہے۔

تباہی و بربادی، انحرافات اور روگردانی جو کچھ بھی وہ ترقی و کسب کمال کی راہ میں دکھاتا ہے، ٹھہراؤ اور پستیاں، گراؤٹ اور ہلاکت انہی مقام سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے لیے جس طرح ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اسی طرح فساد و انحراف اور گراؤٹ کی راہیں بھی بند نہیں ہیں۔

انسان اس منزل میں ہے، جہاں بتبع قرآن کریم۔ جس امانت کا بوجھ آسمان وزمین اور پہاڑ اٹھا کے اسے اپنے کاندھوں پر لے کھڑا ہوا۔ یعنی آزاد زندگی قبول کر لی۔ پابندیوں، ذمے داریوں اور قانون کے بندھن بھی منظور کر لیے۔ اسی بنیاد پر ظلم و جہالت و خود پرستی میں مبتلا ہوتا اور غلط کاری سے نہیں بچتا۔

قرآن کریم، جہاں انسان کی عجیب و غریب صلاحیت اور امانت و ذمہ داری کے بارے میں بات کرتا ہے وہیں بلا توقف سے ”ظلم“ و ”بہول“ کی صفتوں سے بھی یاد کرتا۔ ترقی پذیری اور انحراف کی دو صلاحیتیں انسان میں ناقابل جدائی ہیں، انسان جانور کی طرح نہیں کہ اجتماعی زندگی میں نہ آگے بڑھ سکے نہ پیچھے ہٹ سکے نہ دائیں اڑ سکے نہ بائیں۔ انسان کی زندگی میں کبھی پیش قدمی ہے کبھی پسپائی، سرعت و تیزروی ہے اور توقف اور گراؤ، عدالت و نیکی، ظلم و تجاوز انسانی زندگی کے پرتو ہیں۔ ایک منزل میں عقل و علم کا منظر ہے۔ ایک مرحلے میں جہالت و ہوس پرستی ہے۔

زمانے میں جو تغیرات اور تبدیلیاں ہوتی ہیں، ممکن ہے دوسری قسم ہی کی ہوں۔

منجدا اور جاہل لوگ بشری خاصیتوں میں افراط بھی ہے تفریط بھی، انسان اگر حد اعتدال میں رہے، پہلی قسم کی تبدیلیوں کو دوسری قسم کی تبدیلیوں سے الگ کرے، زمانے کو علم و ایجاد کی طاقت سے کوشش و عمل کے ذریعے آگے لے جائے، ترقی و پیش رفت کے مظاہر سے اپنے تئیں ہم آہنگ بنانے کی سعی کرے۔ زمانے کے انحرافات کا راستہ روکے اور ہم رنگ زمانہ ہونے سے دور رہے تو انسان کے لیے ممکن ہے۔

افسوس یہ ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ آدمی کو اس موقع ہر دو خطرناک بیماریاں لگا رہی ہیں، جمود اور جہالت کے مرض پہلی بیماری کا نتیجہ ٹھراؤ، سکون اور توقف ہے، آدمی دستوں اور ترقیوں سے دور رہ جاتا ہے۔ اور دوسرے مرض کی وجہ سے سقوط و انحراف سے دوچار ہوتا ہے۔

جامد، ہر چیز سے نفرت کرتا ہے اور پرانے پن کے علاوہ کسی کو پسند نہیں کرتا۔ جاہل بڑی چیز کو تقاضائے وقت کا نام دیتا اور جدت پسندی و ترقی پسندی سمجھنے لگتا،

جامد، ہر نئی اور تازہ چیز کو فساد و انحراف کہتا ہے اور۔ جاہل، ہر بات کو تمدن اور توسیع علم و دانش کی مد میں شمار کرتا ہے۔

جامد آدمی، مغز اور چھلکے میں، وسیلے اور نصب العین میں فرق نہیں کرتا، اس کی نظر میں دین، آثار قدیمہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپتا ہے اس کی رائے میں نازل شدہ قرآن زمانے کی رفتار روکنے اور وضع کائنات کو اپنی حالت پر ساکن رکھنے کا فریضہ سپرد کرتا۔ جامد شخص کے عقیدے میں پارہ عم تیسارے لون پڑھنا، کھک سے لکھنا، صوف والی دوتا کو استعمال پر سنے حمام میں نہانا، ہاتھ سے کھانا کھانا، مٹی کے تیل کی لائین جلانا، جاہل و بے سواد جینا دینی آداب کی زندگی ہے، اس کی نگہداشت کرنا چاہیے، جاہل اس کے برخلاف، دونوں آنکھیں بند کیے دیکھتا رہتا ہے کہ یورپ میں کیا نیا سکوفہ کھلا، کیا نیا فیشن نکلا جس تعقید کرے اور جدت پسندی اور وقت کا جبر کہہ کر اسی راہ پر چل کھڑا ہو۔

جامد و جاہل، دونوں اس بات پر ہم خیال ہیں کہ جو وضع قطع پرانے زمانے کی تھی وہی دینی مسائل اور مذہبی شعائر ہیں۔ دونوں میں اختلاف یہ ہے کہ ایک رسم و رواج کی نگہداشت پر زور دیتا ہے اور جاہل کے خیال میں مذہب قدمت پرستی ہے اور اس کا تعلق سکون و قرار سے ہے۔

آخری صدیوں میں یورپ علم اور دین کے تضاد سے دوچار تھا، ہر جگہ یہی بحث و گفتگو تھی۔ دین و علم میں تضاد کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ چرچ نے کچھ قدیم علمی و فلسفی مسائل کو دینی عقائد اور دینی پہلو مان لیا تھا، لیکن علوم نے ان مسلمات کے خلاف کچھ ترقیاتی حقائق ثابت کر دیے تھے۔ ادھر علوم نے زندگی کی وضع بدل دی زندگی کی شکل و صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

جامد دانشک نام نہاد دیندار حضرت ایک طرف چند نفسی مسائل کو بلاوجہ مذہبی رنگ دیتے ہیں۔ دوسری طرف دینی زندگی کے ظاہری ڈھلچکے کو بھی غمزدہ مذہب کا حصہ بنا چاہتے ہیں، ادھر جاہل و بے خبر عوام بھی سوچتے ہیں کہ واقعا

مادی زندگی میں بھی آدمی کو خاص وضع قطع میں ہونا چاہیے۔ اور چونکہ علم کا فتویٰ یہ ہے کہ مادی صورت کو بدلنا چاہیے لہذا دین کا منسوخ ہونا ہی بہتر ہے اور یہ فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔

پہلے گروہ کے جمود اور دوسرے گروہ کی بے خبری نے علم و دین کے تضاد کو جنم دیا۔ اور بس۔

قرآنی مثال: اسلام ترقی یافتہ اور ترقی دینے والا دین ہے۔ قرآن کریم مسلمانوں کو ترقی اور پیش روی کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے اس بنا پر وہ ایک مثل میں کہتا ہے:

پیروان محمد مصطفیٰ علیہ السلام کی مثال دانے کی ہے، زمین میں بویا اس کی نازک سی کوئل پھوٹی، پھر اس نے کچھ قوت حاصل کی، اس کے بعد وہ اپنے تنے پر ٹہری اس کی یہ رفتار تخیل سے بھی کہان بھی حیرت میں پڑ گئے۔

یہ مثل قرآنی نصب العین کے مطابق ایک مثالی معاشرے کے لیے ہے۔ قرآن ایسے معاشرے کے بیج بونا چاہتا ہے جو ہمیشہ نشوونما پاتا، پھلتا، پھوٹتا اور پھیلتا رہے۔ ویل ڈیورنٹ کہتا ہے:

اسلام کی طرح کسی دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اسلام کے پہلے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے معاشرے کی تجدید و تعمیر میں کتنا کام کیا اور ترقی میں کس قدر طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اسلام جمود کے خلاف ہے وہ جہالت کا بھی دشمن ہے۔ اسلام کو جو خطرہ ہے وہ اس رنج سے بھی ہے اور اس سمت سے بھی۔ جمود اور خشک مزاجیاں نیشنل پرانے نوع کے کو محبوب قرار دینا۔ حالانکہ دین مقدس اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جاہل لوگوں کو ایک بہانہ فراہم کرتا ہے کہ وہ اسلام کو جدیدیت کا حقیقی مخالف سمجھیں گے۔

دوسری صرف تقلید اور فیشن پرستی و مغرب زدگی کے زیر سایہ یہ عقیدہ کہ مشرقی ممالک کی نوٹس لیسی اسی میں ہے کہ وہ جسمانی و روحانی، ظاہری و باطنی طور پر فرنگی بن جائیں، اہل مغرب کے تمام رسم و رواج قبول کر لیں۔ اپنے مدنی و معاشرتی قوانین کو آنکھیں بند کر کے یورپ کے قوانین سے ہم آہنگ بنالیں۔ یہ خیال جامد افراد کے لیے بہانہ بن گیا کہ وہ لوگ ہر نئی وضع کو بدینی کی نظر سے دیکھیں اور اسے دین، آزادی اور قوم کی اجتماعی شخصیت و نظریات کے لیے خطرہ سمجھیں۔

ان دونوں رویوں کا نقصان اٹھانے والا، اسلام سے خشک لوگوں کا جمود جاہلوں کو میدان جنگ مہیا کرتا ہے۔ اور جاہلوں کی جہالت خشک لوگوں کو ان کے عقائد و نظریات زیادہ متعصب اور خشک بنا رہی ہے۔

یہ متمدن نما جاہل سمجھتے ہیں زمانہ ”معصوم“ ہے۔ جیسے زمانے کی تبدیلیاں انسان کے علاوہ کسی اور ہاتھوں سے رونما ہوتی ہیں؟ کب سے اور کس تاریخ سے انسان سے غلطی سے دوری۔ عصمت۔ حاصل کی ہے، جو زمانے کے انقلابات خطا اور غلط فہمیوں سے ماورا۔ معصوم۔ مان لیے جائیں؟

آدم زاد جس طرح، علمی رجحانات، اخلاقی اور مذہبی رکھتا ہے اور بشریت کی صلاح و فلاح کے لیے ایجادیں کرتا ہے اسی طرح وہ خود پرستی، جاہ طلبی، ہوس رانی، دولت مندی اور استعماری خواہشات کے زیر اثر بھی رہتا ہے۔ بشر آخر بشر ہے، نئے نئے اختراعات کرتا ہے، بہتر سے بہتر وسائل دریافت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اتفاقاً غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ خود فراموش آدمی ان باتوں کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کا تکیہ کلام ہے۔ آج کی دنیا ایسی ہے، آج کی دنیا ویسی ہے۔

سب زیادہ حیرت انگیز بات ہے کہ یہ لوگ زندگی کے اصول جوتے، ٹوپی اور اپنے لباس کے معیار پر جانچتے ہیں، جیسے جوتا، ٹوپی نئی پرانی ہوتی ہے اسی طرح ان کے

نزدیک جو زمانہ نیا نیا، کارخانے سے بننے کے بعد بھی ابھی ان کے سامنے آیا ہے اس کی توقیت ہے، اسے تو خریدنا اور پہننا چاہیے اور جیسے ہی وہ پرانا ہو اسے دور پھینک دینا چاہیے۔ کائنات کے متعلق بھی ایسی ہی ہیں، ان جالوں کی نظر میں، اچھے اور برے کا مفہوم۔ نئے اور پرانے سے جدا نہیں۔ ان کے خیال میں ”فیوڈرزم“۔ یعنی، ایک طاقت و زبردستی اپنا نام ”مالک“ رکھ لے اور اپنی جگہ بیٹھا، سینکڑوں ہاتھوں اور بازوؤں سے کام لے، مقصد صرف منہ چلانا ہو۔ بہت برے ہے، کیوں؟ اس کی دلیل اس کا پرانا پن ہے۔ آج کی دنیا اس نظام پسند نہیں کرتی۔ اس کا دور گزر چکا، یہ فیشن پرانا ہو گیا۔ لیکن جس دن یہ طریقہ ایجاد ہوا تھا اور نیا نیا قالب سے اترتا تھا، دنیا کی بازار میں رکھا گیا تھا اس دن اچھا تھا۔

ان لوگوں کی نظر میں عورت کا استعمار برے ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا اسے ناپسند کرتی اور اس کے لیے تلے نہیں چلتی۔ اس کے مقابلے میں، کل تک عورت کو ترکہ نہیں ملتا تھا، اس کی ملکیت تسلیم نہ تھی، اس کا عقیدہ و ارادہ یا عزت نہ تھا، اس وقت یہ سب خوب تھا، کیونکہ نیا تھا اور نیا نیا بازار میں آیا تھا۔

ان حضرات کی رائے میں، چونکہ یہ زمانہ، فضا کا زمانہ ہے، اور اب موٹی جہاز چھوڑ کر خچر پر سواری ممکن نہیں، بجلی کو چھوڑ کر لائٹیں نہیں جلائی جاسکتی، تاکے بنانے والے بڑے بڑے کارخانوں کو بند کر کے چرنے سے کام نہیں چلایا جاسکتا، دیو مگر چھپا کی مشینیں نظر انداز کر کے قلمی کتابیں نہیں شایع ہو سکیں، یونہی، محفلِ رقص، نیم نرنا پارٹی ہو یا ٹونے، آخر ان میں شرکت کیوں کر چھوڑ دی جائے۔ شراب نوشی و بدستی ہوا، نیم عریاں لباس۔ یعنی اس مدی کے نئے طور طریقوں کا چھوڑنا، گدھے کی سواری کا دور واپس لانے کے برابر ہے۔

”نئی روشنی“ کی اصطلاح نے کس قدر شخصی اور کتنی خاندانی زندگیوں کو تباہ کیا ہے!

کہتے ہیں، علم کا دور ہے۔ ایٹم کا عہد ہے، مصنوعی سیاروں، فضائی راکٹوں کا زمانہ ہے۔ جی، بہت اچھا! ہم بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، ہم اس عہد وزمانے، اس دور اور صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری تمنا ہے، ہم اس دور کے علوم اور مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر فیض یاب ہوں۔ لیکن ایک بات تو بتائیے کیا اس دور میں سر مشہد علم کے علاوہ سب چیزوں اور دریاؤں کے دھانے خشک ہو گئے ہیں؟ اس صدی کی تمام ایجادیں اور روشنیاں علمی ترقی کا نتیجہ ہیں؟ کیا کبھی علم نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے وجود اور اس کی طبیعت کو سو فی صد رام و مطیع اور ہر چیز کو انسانی بنارہا ہے؟

علم کے بارے میں دنیا کے ایک آدمی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ ادھر سائنسی اداروں نے انتہائی مخصوص نیت سے پائلے اڈے سے تحقیق و تکلف کیے، ہر نئے محنت و تنہائی دریا کی اور جاہ طلب ہو سس پیشہ سرمایہ دار دولت کے پجاری، علمی محنتوں کو اپنے نجس مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں، علم فریادی ہے کہ اس کا استعمال انسان کی سرکش طبیعت ہمیشہ غلط کرتی ہے۔ یہی ہماری صدی کی مشکل اور بد قسمتی ہے۔

علم فنرکس میں ترقی کرتا ہے، روشنی کے کلیات دریافت ہوتے ہیں، ایک منافع پرست گروہ آگے بڑھتا اور خانہ برانداز و تباہ کن فلمیں بنانے کا کام اسی تحقیق کے مہارے شروع کر دیتا ہے۔ کمپٹری کا علم ترقی کرتا ہے مضر و ات کے خواص اور مرکبات کے نتائج دریافت کرتا ہے، کچھ لوگ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ، بلائے جان بشر ہیروئن "ایجاد کرتے ہیں، علم، ایٹم کے اندر جھانک کر اس کی حیرت انگیز اور طاقت دیکھتا اور اس کو مہار دیتا ہے اور معمولی سا انسانی فائدہ اٹھانے سے پہلے، اقتدار کے بھوکے ایٹم بمب بنا کر بے گناہوں کو تباہ کرتے ہیں۔

۔ بیسویں صدی کے ہیرو ”آئن اسٹائن“ کے اعزاز میں جشن ہو رہا تھا ، وہ اٹھا اور تقریر کے دوران کہنے لگا :
”آپ اس شخص کے لیے جشن منا رہے ہیں ، جس کا علم ایٹم بم بنانے کا سبب ہوا ہے ۔“

آئن اسٹائن نے علمی صلاحیتیں اس لیے نہیں استعمال کی تھیں کہ یہ بم بنایا جائے ، مگر ہوس پیشہ لوگوں نے اس کے علم سے یہی فائدہ اٹھایا ۔
ہروین ، ایٹم بم ، ایسی ویسی فلمیں ، فقط اس بنا پر معقول نہیں قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ ”صدی کی نئی ایجاد“ ہیں ۔ اعلیٰ درجے کے بم آخری ترقی یافتہ بمبار ہوئی جہاز کے ذریعہ بے گناہ آدمیوں کے سر پر برسانے سے عمل کی حشیانہ حیثیت میں ذرہ بھر کمی پیدا نہیں ہوتی ۔

اسلام اور بدلتی زندگی

(۳)

عالمی اور گھریلو زندگی میں مغربی رویوں کو قبول کرنے کے سلسلے میں جو حضرات حمایت کا دم بھرتے ہیں، ان کے پاس سب انجھی دلیل یہ ہے کہ — دنیا بدل گئی ہے، بیسویں صدی کے تقاضے اسی سسٹم کا پابند کر رہے ہیں۔ اگر اس رنج پر ہم روشنی نہ ڈالیں تو ہماری دوسری نچیں ناقص رہ جائیں گی۔

اچھی خاصی اور تفصیلی بحث و تحقیق کے لیے مقالات کافی نہیں ہیں، کیونکہ مقالات میں متعدد موضوعات و مسائل زیر بحث آنا ضروری ہیں فلسفی، فقہی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل۔ ”اسلام اور تقاضائے وقت“ کے عنوان سے جو کتاب لکھنے کی نیت ہے، جس کے نوٹ تیار ہیں۔ تو ان شاء اللہ بھیہ بحث و مسائل کی جائے گی۔

سر دست دو نکتوں کی وضاحت کافی ہے:

نمبر ۱:-

زمانے کی تبدیلیوں سے ہم آہنگی آئی آسان نہیں ہے، جتنی یہ مدعیان بے خبر سمجھتے ہیں۔

نمبر ۲:-

قوانین اسلام کے جوڑ اور موڑ
اور ان کے راز و اسرار

دوسرا ضروری نکتہ جسے روشن و عیاں ہونا چاہیے وہ اسلامی مفکروں کا یہ عقیدہ

کہ اسلام میں ایسے راز موجود ہیں جو دین کو اپنے دور کے ترقیات سے ہم آہنگ ہوئیں

مدد کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے۔ اسلام، زمانے کی ترقیوں اور ثقافتوں کی پیش رفت، دنیا کے پھیلاؤ اور زندگی کی جدیدیت کا ساتھ دیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا راز و رمز کیا ہے؟ دوسری لفظوں میں، اس مشینری کے اسپرنگ، بیئرنگ، بریکٹ اور نٹ یوں لگے ہیں کہ جن سے حرکت میں فرق نہیں پڑتا، یعنی کسی قانون کے نظر انداز کرنے کے بجائے وقت کی تبدیلیوں، اور تعلیم و ثقافت میں توسیع میں کسی قسم کا تضاد و تصادم نہیں ہوتا، اس عقیدے کے توضیحات اس مقالے کا موضوع ہیں۔

بعض قاری اور ان سے زیادہ میں خود سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ فنی اور ماہرانہ ماحول چاہتا ہے۔ اور ماہرین ہی کے سامنے اس پر گفتگو ہونا چاہیے۔ مگر سوال کرنے والوں اور مسئلے سے دل چسپی رکھنے والوں کی اکثریت سے دوچار ہوں، ان میں غلط اندیش لوگوں کی تعداد زیادہ ہیں، اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسلام کی اس خصوصیت کو باور نہیں کرتے۔ میں جس حد تک غلط فہمیوں کو دور کر سکتا ہوں اس حد تک کوشش کروں گا اور دوسروں کو نویدوں گا۔

محترم ناظرین! خیال رکھیں کہ اس قسم کی بحثوں سے ہمارے دور اندیش علماء بے خبر نہیں تھے، چنانچہ مرحوم آیت اللہ میرزا حسین نائینی کی ”تبیہ الامت“ اور استاد علامہ محمد حسین طباطبائی کا مقالہ ”وہیت و زعامت“ کتاب ”مرجعیت و روحانیت“ میں قابل ملاحظہ ہے۔ یہ کتابیں فارسی ہی میں ہیں اور چھپ چکی ہیں۔

آیت اللہ العظمیٰ میرزا محمد حسین نائینی، نجف کے عالم عہد، فقیہ عظیم اور اصولی، جنہوں نے علماء کے منصب پر ایک اہم کتاب ”تبیہ الامت“ تحریر فرمادی اور مشروطیہ استعمار سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ ان کی ولادت ۱۲۶۷ھ/۱۸۶۰ء اور سندوفات ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء ہے۔

۲۔ علامہ سید محمد حسین طباطبائی متوفی ۱۹۸۱ء، قم۔ تفسیر المیزان کے مصنف اور آخری دور کے مشہور فلسفی

دین مقدس اسلام اپنے اٹل اور ناقابل تغیر قوانین کے باوجود تمدن و ثقافتِ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور انسان کی بدلتی زندگی میں قابل تطبیق ہے۔ چند چیزوں کی طرف توجہ مبذول فرمائیے۔

جسم و صورت کے اختلاف
۱۔ اسلام زندگی کی ظاہری شکل و صورت سے بحث نہیں کرتا جب کہ انسانی دانش و بینش تمام و کمال اسی سے وابستہ ہے۔

اسلامی قوانین و سفارشات، روح و حقیقت سے متعلق ہیں۔ وہ زندگی کے نصب العین اور انسان کے لیے بہترین راستے کا رہنما ہے وہ راستہ جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ علم۔ نہ روح و مقصدِ زندگی کو بدلتا ہے نہ، بہتر اور نزدیک تر و بے خطر راستہ بتاتا ہے جو مقصدِ حیات تک پہنچا سکے۔ علم، ہمیشہ بہتر وسائل اور کامل تر ذرائع مہیا کرتا ہے جس سے آدم زادِ زندگی کے مقاصد حاصل کر سکے اور ان تک پہنچنے کے راستے اور ان پر چلنے کا انداز معلوم کر سکتا ہے۔

اسلام نے اپنی قلمرو، اپنے دائرہ کار میں مقاصد متعین کر دیے ہیں، شکل و صورت و وسائل علم و فن کے دائرہ کار میں چھوڑ دیے، تمدن و ثقافت کے پھیلاؤ میں لٹام اور مکرے بچ گیا۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے علم و عمل، توسیع تمدن و ثقافت، تقویٰ، استواری، ارادہ، ہمت پائدار اور استقامت پیدا کرنے اور بڑھانے میں اصلی عامل اور تمدن کی ترقی میں اساسی کردار اپنے ذمے لیا۔

اسلام نے شاہراہِ سفر بشر پر سنگ میل نصب کر دیے ہیں۔ وہ نشانِ راہ، رفتارِ کارِ حج اور منزل کی سمت بتاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں خطروں، موڑوں، گرنے کے مقاماتِ تباہی کے ٹھکانوں سے بچنے کے سگنل بھی دکھا دیے۔ اسلام کے تمام ضابطے یا پہلی قسم کے نشانات ہیں یا دوسری قسم کے۔

زندگی کے اسباب و وسائل ہر دور میں انسانی معلومات اور علمی اطلاعات سے بہتہ ہوتے ہیں، معلومات جتنے بڑھتے جاتے ہیں آلات و وسائل اتنے ہی کامل و مکمل ہوتے رہتا قص و وسائل کو جبر زمانہ کے ہاتھوں ہٹاتے جاتے ہیں۔

اسلام میں ایک سید یا ایک ظاہری و مادی وضع قطع ایسی نہیں مل سکتی جس پر تقدس کا سیل چسپا کیا گیا ہو۔ اور کوئی مسلمان اس وضع قطع کی نگہداشت کا دائمی محافظ بننے کا مدعی ہو۔

اسلام نے یہ نہیں کہا، اسلامی بنائی، کاشتکاری، حمل و نقل، جنگ..... کے لیے آلات، اوزار اور ذرائع کے نام اور خصوصیات نہیں متعین کیے کہ فلاں کام بس فلاں اوزار ہی سے کیا جائے۔ جس کے بعد یہ کہا جاسکے کہ علمی ترقی کے ساتھ وہ اوزار بیکار قرار دے دیا جائے۔ اور اسلامی ضوابط اور علم میں تضاد و تصادم رونما ہو۔ اسلام نے جوتے، ٹوپی، اور زناتے مردانے الگ الگ اور نئے قسم کے کپڑے نہیں بنائے ہیں نہ ان کے لیے خاص سانچے، پیمائے اور مادے، نہ ساخت اور تولید و تقسیم کے لیے چند آلات اور اوزار معین کیے ہیں۔

ایک جہت تو یہ ہے جس سے دین کو ترقیاتِ زمانہ سے ہم آہنگ بنانے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

۲۔ دین اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے اس کی بے اندازہ اہمیت اور الٹی بدلتی ضرورتوں کے لیے پائدار قانون اور الٹی بدلتی ضرورتوں کے لیے متبادل قانون

پہلو کہ انسان کی مستقل ضرورتوں کے لیے پائدار قوانین اور تبدیل ہونے والی ضرورتوں کے لیے بے متبادل ضابطے جن میں وقتی ضرورتوں کی رعایت ہو۔ انفرادی، اجتماعی، شخصی اور عمومی دائروں میں کچھ قوانین ناقابل تبدیلی ہیں۔ یہ نوعیت ہر زمانے میں

یکساں ہے۔ جو نظام، انسان اپنے غرائز کے سپرد کرتا ہے اور جو نظام اپنے اجتماع کو دینا ہے اس کے اصول و کلیات ہر زمانے میں ایک ہی طرح رہتے ہیں۔

”نظریۃ اضافیت اخلاق“ اور ”اضافیت عدالت“ اور اس کے حامیوں سے باخبر ہوں ان کے عقیدے اور دلائل کے بارے میں اپنی رائے بھی لکھوں گا۔

ضروریات بشر میں کچھ ضرورتیں اوتی بدلتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے ناپائدار اور تغیر پذیر قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے، اسلام نے ان کے لیے حالات کے لیے خاص مہیت وضع کر دی ہے، یعنی متغیر حالات کو غیر متغیر اصولوں سے وابستہ کر دیا، یہ اصول ثابت ہر بدلتی ہوئی صورت میں نعمتی قانون پیدا کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر اس سے زیادہ توضیح نہیں دینا چاہتا، البتہ، اپنے قاری کے ذہن روشن رکھنے کے لیے چند مثالیں دیتا ہوں:

اسلام کا ایک اجتماعی ضابطہ ہے:

”واعذوا لہم ما استطعتم من قوۃ“

مسلمانو! اپنی آخری حد امکان تک دشمن کے مقابلے میں قوت مہیا کرو۔

سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احکام کا ایک مربوط سلسلہ ”بتی و رمایہ“ کے نام سے فقہ میں مرتب ہوا حکم ہے کہ خود تم اور تمہارے بچے، مہارت کامل کی حد تک گھوڑے سواری اور تیر اندازی سیکھیں۔ گھوڑے سواری کا فن اور تیر اندازی کا ڈسنگ اس زمانے کی فوجی تربیت کا جز تھا، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد اصل ”بتی و رمایہ“ ہے۔ اس کی ”اصل واعذوا لہم ما استطعتم من قوۃ“ ہے یعنی تیر و شمشیر، نیزہ و کمان، انحر اور گھوڑا، اسلام کی نظریات اہمیت نہیں رکھتا، اصل ہے ”طاقت“ ہونا۔ اصل بات ہے ہر زمانے میں دشمن کے روبرو آخری حد امکان تک فوجی اور دفاعی حیثیت سے مضبوط ہونا طاقت ور ہونا تیر اندازی اور گھوڑے سواری ایک لباس ہے جو طاقت کے جسم پر

پہنسا جاتا تھا۔ دوسری لفظوں میں نفاذِ حکم کے لیے ایک صورت۔ دشمن کے مقابلے میں طاقت و ناپائدار قانون ہے، جو پائدار ضرورت کو پورا کرتا اور اسی کے دوام سے دوام پاتا ہے۔ تیسرا اندازی و گھوڑے سواری میں مہارت کا ضروری ہونا وقت کی وقتی ضرورت تھی، زمانے کی مناسبت اور عہد کے بدلنے سے وہ بدلے گی اور تمدن و ثقافت کی ترقی کے ساتھ دوسرے جنگی آلات اور آج کے گرم اسلحہ اور آج کی مہارت درکار ہے اور آج کے وسائل کل کی ٹکنیک کی جگہ بدل جائے گی۔

دوسری مثال :

”تبادلہ دولت کے بارے میں قرآن مجید نے ایک ”اصل اجتماعی“ بیان کر دی ہے اور اسلام نے ”شخصی ملکیت کی اصل“ قبول کی ہے۔ ہاں، اسلام جس کو ”ملکیت“ کا نام دیتا اور مانتا ہے اس میں اور آج کی دنیا میں سرمایہ داری کی بنا پر جو کچھ ہو رہا اور جو فرق ہے اس کے تقابل کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال مالکیت فرد کا لازمہ ”تبادلہ“ ہے۔

باہمی تبادلے کے لیے اسلام نے اصول مقرر کیے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک اصل ہے :

”وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ“

سرمایے کو غلط طریقے پر آپس میں گردش نہ دو۔

یعنی جو روپیہ اور جو سرمایہ، دست بدست گردش کرتا ہے، کاریگر اور کارخانہ دار کے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں آنے والی چیز جن جن ہاتھوں میں جس جس انداز سے جائے اور جو فائدہ ہو وہ مطابق شریعت ہو۔ سرمائے کے دست بدست آنے جانے میں جو فائدہ ہو رہا ہے اس سے انسانی قدر کے اندر ہونا چاہیے ورنہ اجازت نہ ہوگی۔ اسلام نے مالکیت کو مکمل خود مختاری کے برابر نہیں قرار دیا ہے۔

پھر اسلامی ضوابط میں بعض چیزوں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے

مثلاً خون اور انسان کا فضلہ.... کیوں؟ بات یہ ہے کہ خون انسان یا خون گوسفند کا استعمال مفید نہیں ہے۔ لہذا اس کی قیمت ایسی نہیں ہو سکتی جو انسانی سرمائے کا حصہ بن سکے۔ خون اور فضلات کی خرید و فروخت کی منوعیت کی اس وجہ قمرانی اصل ہے ”ولا تأکھوا أموالکم بنکم با بطل“۔ ہے خون و فضلہ کی منوعیت اسلام کی نظر میں ”فصل“ نہیں، اصالت تو ہے ایسی دو چیزوں کا تبادلہ جو بشری حالت کے لیے مناسب ہو خون وغیرہ کی منوعیت ایک لباس ہے جو غلط سرمائے کی گردش کو پھنسا دیا گیا ہے۔ دوسری لفظوں میں یہ منوعیت ”اصل“۔ لانا کھو اموالکم بنکم با بطل۔ کی اجزائی صورت ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر تبادلہ ”مبادلہ“ کا ہاتھ درمیان میں نہ ہو اس وقت بھی کوئی سرمایہ کسی سے غلط طریقے پر لے کر ملکیت اور تصرف کا حق حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اصل پابندار ہے اور پابند وقت نہیں، اس کا ماخذ (سرچشمہ) ناقابل تبدیل اجتماعی ضرورت ہے۔ رہا خون اور فضلے کا سرمایہ نہ ماننا اور اسے قابل ”مبادلہ“ (دین بین) نہ جاننا اس کا تعلق عہد و زمان، اور درجہ تمدن سے بھی ہو سکتا ہے اور حالات کی تبدیلی علوم کی ترقی، صنعت و امکان استفادہ صحیح و مفید کے بعد، دوسرا حکم بھی ہو سکتا ہے۔ ایک اور مثال:

حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے آخری زمانے میں مومبارک سفید ہو گئے تھے، آپ خضاب نہیں لگاتے تھے، واڑھی سفید دیکھ کر ایک شخص نے عرض کی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ بالوں کی سفیدی کو رنگ سے چھپالو؟ جواب میں حضرت نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: پھر آپ خضاب کیوں نہیں لگاتے؟ آپ نے فرمایا: جب حضور نے یہ فرمایا تھا اس وقت مسلمان تعداد میں کم تھے۔ پھر ان میں بوڑھوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو لڑائیوں یا

شریک ہوتے تھے، دشمن جب مسلمان فوج کو دیکھتا اور بوڑھے سپاہیوں پر اس کی نظر پڑتی تھی تو اسے ایک نفیاتی اطمینان و اعتماد حاصل ہوتا تھا کہ متقابل میں تھوڑے سے بوڑھے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمان جاری کر دیا کہ خضاب لگایا جائے کہ دشمن ان کے بڑھاپے کو دیکھ کر جو ان ہمت نہ ہو سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا، حضورؐ کا حکم تقاضائے وقت کے مطابق تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، لہذا اس قسم کے وسائل کا اختیار کرنا ضروری تھا، آج اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے لہذا اس کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے۔ خضاب لگائے یا نہ لگائے۔

حضرت علیؑ علیہ السلام کی نظریں پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ”خضاب لگاؤ“۔ کلیہ۔ اصل نہیں۔ بلکہ کسی اور اصل کی شکل اجرائی ہے۔ قانونِ اصلی۔ دشمن کی نفیاتی مدد نہ کرنا پر ایک لباس تھا۔

یہ مطلب ہے کہ اسلام ظاہری شکل، پورست، پچھلے اور اوپری خول کو اہمیت دیتا ہے اور روح و باطن و مغز کو بھی مگر ہمیشہ صورت کو روح، پچھلے کو مغز اور خول کو اندرونی حقیقت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ: ان دنوں ملک میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے ”رسم خط بدلا جائے“۔ یہ بات، زبان و ادب کے

لحاظ سے بھی قابل بحث ہے اور اصولِ اسلامی کے لحاظ سے بھی بحث طلب ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے مسئلے کی دو جہتیں زیر بحث لائی جاسکتی ہیں: ایک یہ بہت کہ آیا، اسلام کی کوئی خاص الف بے ہے۔ اور دوسری الف بے سے جدا ہے؟ کیا اسلام ہماری الف بے کو جس کا نام عربی الف بے ہے، اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور دوسری الف بے کو اجنبی جانتا ہے، جیسے لاطینی حروف؟

ہرگز نہیں۔! اسلام، کائناتی دین ہے اس کی نظریں ہر الف بے برابر ہے۔

شریک ہوتے تھے، دشمن جب مسلمان فوج کو دیکھتا اور بوڑھے سپاہیوں پر اس کی نظر پڑتی تھی تو اسے ایک نفیاتی اطمینان و اعتماد حاصل ہوتا تھا کہ متقابل میں تھوڑے سے بوڑھے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمان جاری کر دیا کہ خضاب لگایا جائے کہ دشمن ان کے بڑھاپے کو دیکھ کر جو ان ہمت نہ ہو سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا، حضورؐ کا حکم تقاضائے وقت کے مطابق تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، لہذا اس قسم کے وسائل کا اختیار کرنا ضروری تھا، آج اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے لہذا اس کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے۔ خضاب لگائے یا نہ لگائے۔

حضرت علیؑ علیہ السلام کی نظریں پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ”خضاب لگاؤ“۔ کلیہ۔ اصل نہیں۔ بلکہ کسی اور اصل کی شکل اجرائی ہے۔ قانونِ اصلی۔ دشمن کی نفیاتی مدد نہ کرنا پر ایک لباس تھا۔

یہ مطلب ہے کہ اسلام ظاہری شکل، پورست، پھلکے اور اوپری خول کو اہمیت دیتا ہے اور روح و باطن و مغز کو بھی مگر ہمیشہ صورت کو روح، پھلکے کو مغز اور خول کو اندرونی حقیقت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ: ان دنوں ملک میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے ”رسم خط بدلا جائے“۔ یہ بات، زبان و ادب کے لحاظ سے بھی قابل بحث ہے اور اصولِ اسلامی کے لحاظ سے بھی بحث طلب ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے مسئلے کی دو جہتیں زیر بحث لائی جاسکتی ہیں: ایک یہ بہت کہ آیا، اسلام کی کوئی خاص الف بے ہے۔ اور دوسری الف بے سے جدا ہے؟ کیا اسلام ہماری الف بے کو جس کا نام عربی الف بے ہے، اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور دوسری الف بے کو اجنبی جانتا ہے، جیسے لاطینی حروف؟

ہرگز نہیں۔! اسلام، کائناتی دین ہے اس کی نظریں ہر الف بے برابر ہے۔

مسئلے پر بحث کرنے کی دوسری جہت ہے۔ خط اور الف بے کی تبدیلی کا مسلمانوں کے اجنبی لوگوں کے حلق میں اترنے اور ان کے پیٹ میں ہضم ہونے پر اثر بھی پڑتا ہے؟ اس تبدیلی کا اثر قوم کے اپنے تمدن سے کٹ جانے پر کیا ہوگا، جس نے بہر حال اسلامی علوم اور اپنے علمی اثاثے کو چودہ سو برس تک کسی لفظ بے میں لکھا ہے؟ اور رسم الخط بدلنے کا منصوبہ ہے کن ہاتھوں میں اور اسے کون لوگ نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ ان کی تحقیقات ہونا چاہیے۔

مجھ جیسے لوگوں کے لئے نسخہ آمیز لہجے میں پوچھا جاتا ہے؟ جناب! خط ہے جو کھانا شاعر کیسا ہے!! پھری کاٹتے سے کھانا جائز ہے؟ بیت لگانا حرام

ھیٹ پہننا حرام نہیں
دم چھلانا حرام ہے۔

ہے؟ کیا اجنبی زبان میں بات کرنا ناجائز ہے؟

ان حضرات کے جواب میں کہتا ہوں: اس بارے میں اسلام نے کوئی خصوصی حکم نہیں دیا ہے! اسلام نے پابند نہیں کیا ہے کہ ہاتھ سے کھائے یا چمچے سے، یہ ضرور حکم دیا ہے کہ صفائی کا خیال رکھیں۔ جوتا، ٹوپی اور لباس کا بھی کوئی ماڈل نہیں دیا۔ انگریزی، جاپانی اور فارسی زبان اسلام کے نزدیک یکساں ہے۔

لیکن.....

لیکن اسلام نے ایک اور بات ضرور کہی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا بھلا دینا حرام ہے۔ دوسروں کے پیٹ میں ہضم ہو جانا، دوسروں میں مل کر مت جانا حرام ہے۔ دم چھلانا حرام ہے۔ اجنبی کے مقابلے انہوں کی نذر ہونا حرام ہے جیسے سائپ کے سامنے فرگوش، دوسرے کے بدلے گدھے کو حجر سمجھنا حرام ہے۔ ان انحراف اور ان کی بدبختوں کی "صدی کی ایجاد" کہہ کر جذب کر لینا حرام ہے۔ یہ عقیدہ کہ ایرانی کو جسم و روح، ظاہر و باطن میں فرنگی بن جانا چاہیے، حرام ہے چاروں تک صبح سویرے "فرانسیسی کلچرینٹر"، "میرس جانا اور حرف ر" کا مخرج "غ" میں

بدن اور رُفتم کو "غفتم" کہنا حرام ہے۔

اہم اور اہم تر مسئلہ

۳۔ ایک اور جہت کہ اسلام کو تقاضائے وقت سے ہم آہنگ کرتا ہے، وہ اس کے قوانین کا عقلی

پہلو ہے۔ اسلام نے اپنے پیروں کو علانیہ بتایا ہے کہ اس کے تمام ضوابط بلند ترین مصالح پر مبنی ہیں، اور خود اسلام میں مصالح کی اہمیت کے درجے بیان کیے گئے ہیں۔ اسلام کے معاملات کے ماہر ایسے مقامات پر طرح طرح کی مصلحتوں کو باہم متقابل دیکھ کر کام کی سمت وجہت آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔ وہ اسلام کی اس اجازت سے مطلع ہیں کہ ایسے مقامات پر حقیقی ماہرین اسلام مصلحتوں کی اہمیوں کا اندازہ لگائیں اور اسلام کی براہ راست رہنمائی کی روشنی میں اہم ترین مصلحتوں کا انتخاب کریں، فقہاء اس کلیہ کو "اہم و مہم" کا نام دیتے ہیں۔ یہاں مثالیں بہت ہیں لیکن ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

"ویٹو" کا حق رکھنے والے قوانین

۴۔ ایک اور جہت جس نے اس دین

کو حرکت و انطباق کی خصوصیت دی

اور اسے زندہ و جاویداں بنا دیا ہے وہ، خود اس دین کے اندر ایسے قوانین اور قاعدے وضع ہوئے ہیں جن کا کام دوسرے قوانین میں اعتدال اور ان پر کنٹرول قائم رکھنا ہے۔ فقہاء کی زبان میں انھیں "قواعد حاکمہ" کہتے ہیں جیسے "قاعدہ لا یرفع" اور "قاعدہ لا ضرر" جو پوری فقہ پر حاکم ہے۔ حقیقت میں اسلام تمام قوانین و ضوابط کے متعلق میں ان قواعد کو "ویٹو" کا درجہ دیتا ہے اس کی بات بھی طویل ہے اور اس کا بیان کرنا مقصود نہیں۔

حاکم کے اختیارات

جن برکیٹوں، اسپرنگوں کا سلسلہ ہم نے بتایا، ان کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہیں جو دین مقدس اسلام کی تعمیر میں

معمولہ کمیٹی میں ہیں اور انہوں نے اس دین کو ابدیت و قیامت کی صفت خاص بخشی ہے
مرحوم آیت اللہ نامی اور علامہ طباطبائی نے اس سمت میں ان اختیارات کا تذکرہ کیا ہے
جو اسلام نے "اسلام کی حکومت صالحہ" کو عطا کیے ہیں۔

اصل اجتہاد: (علامہ اقبال پاکستانی کہتے ہیں: "اجتہاد اسلام کی قوت محرکہ ہے")

بات بالکل تھیک ہے، لیکن اہم خصوصیت ہے "اجتہاد پذیری" اسلام اجتہاد
کو منظور کرتا ہے۔ اسلام کی جگہ کسی اور کو رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اجتہاد کس قدر
مشکل ہے، بلکہ اجتہاد کا راستہ ہی بند ملے گا۔ اس دین آسمانی میں عجیب و غریب ترین
بات وہ باریکیاں ہیں جو اس کی ساخت میں موجود ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے وہ
تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

بوعلی سینا نے کتاب "الشفا" میں بھی اسی بنیاد پر ضرورت اجتہاد کی بحث
چھیڑی ہے وہ کہتا ہے: چونکہ زمانے کے حالات تغیر پذیر ہیں، اور ہمیشہ نئے مسائل
پیش آتے ہیں، دوسری طرف اسلام کے کئی اصول، قانم و ناقابل تبدیل ہیں۔
ضرورت ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانے میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہند
ایسے افراد ہونا چاہیں جو نئے مسائل کا ادراک کر سکیں اور مسلمانوں کو جواب دیں کہ
بعد اطمینان دلائل۔

"قانون اساسی" کے تہ میں بھی اس کی پیش بندی کی گئی ہے۔ یعنی ہر زمانے
میں مجتہدین کی ایک کمیٹی ہوگی جس کے ممبر حکم از حکم پانچ ہوں گے، یہ حضرات
"تقاضائے وقت" سے باخبر بھی ہوں، یہ حضرات منظور شدہ قوانین کی نظارت کریں گے۔
قابل یاد دہانی بات یہ ہے کہ "اجتہاد" اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے۔ یعنی
تخصص، مہارت و کارشناسی اور اسلامی مسائل میں فنی کارشناسی،۔ ایسی

پہنر نہیں کہ مدرسے کا ہر بھگلوڑ صرف اس بہانے مدعی ہو سکے کہ وہ چند دن کسی حوزہ علمیہ میں رہ چکا ہے۔

اسلامی مسائل میں مہارت اور اظہارِ نظر کی صلاحیت کے لیے پوری عمر درکار ہے جو اگر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہے، اس پر ایک شرط زائد اس کا فطری ذوق اور قوت استعداد اور فن پر قابو اور توفیقات الہی کا ہونا ہے۔

مہارت خصوصی اور اجتہاد سے آگے، یہ لوگ ایسے ہوں جو مزع رائے و نظر سمجھے جاتے ہوں۔ تقویٰ، معرفت الہی، خدا ترسی سے کما حقہ بہرہ مند ہوں، تاریخ اسلام ایسے افراد کی نشان دہی کرتی ہے جو تمام تر علمی و اخلاقی صلاحیتوں کے باوجود جب انہیں نظر کا وقت آتا تھا تو کانپنے اور تھرتھرانے لگتے تھے۔

محترم مطالعہ کرنے والوں سے معذرت چاہتا ہوں کہ گفتگو کا دامن اس بحث میں ان مطالب تک پھیل گیا۔

پانچواں حصہ :

قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

- اسلام نے زن و مرد میں انسانی مساوات کی نگہداشت کی ہے۔
- اسلام زن و مرد کے مساوی حقوق کے خلاف نہیں وہ دونوں کے حقوق میں مشابہت کے خلاف ہے۔
- اسلام نے عورت کے بارے میں حقارت آمیز نظریوں اور رویوں کو کالعدم قرار دیا۔
- قرآن نے اپنے بیان کردہ واقعات میں توازن رکھا ہے۔ واقعات میں فقط مرد ہی بڑے کردار کے نہیں دکھائے۔ نواتین کے بلند کردار بھی نمایاں کیا ہے۔
- نواتین اگر مردوں کے برابر حصہ لینا چاہیں تو مرد کے حقوق سے مشابہت کا خیال ختم کر دیں۔
- علماء اسلام کے کلیئہ ”عدل“ کی بنیاد پر فلسفہ حقوق کی اساس کھی ہے۔

- اہل مشرق نے انسانیت کو درگزر اور نیکی میں اور اہل مغرب نے حقوق حاصل کرنے میں محدود کر دیا۔
- منشور حقوق انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اسے فلسفیوں کی تائید و رکاز سے عوام کی نہیں۔
- منشور حقوق انسانی میں احترام آدمیت کی بات مدلوں کے مشرق اور اسلام میں تصدیق شدہ ہے۔
- مغربی دنیا ایک طرف تاہم امکان انسانی مقام کو نیچے لے رہی ہے اور دوسری طرف حقوق انسانی کا لمبا ٹرنگ منشور جاری کر رہی ہے۔
- آج کے انسان کی مجبوری یہ ہے کہ اس نے "خود" کو بھلا دیا ہے۔
- احترام انسان فلسفہ مشرق سے ہم آہنگ ہے، فلسفہ مغرب سے نہیں۔

قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

اسلام، عورت کو کس قسم کی مخلوق سمجھتا ہے؟ کیا شرافت، اور انسانی حیثیت سے اسے مرد کے برابر جانتا ہے یا ادنیٰ درجے کی جنس؟ یہ سوال ہیں جن کے ہم جواب دیں گے۔ اسلام خاندانی مسئلہ میں عورت و مرد کے لیے خاص فلسفے کا قائل ہے۔ یہ فلسفہ گذشتہ چودہ سو برس اور آج کے فلسفے سے مختلف ہے۔ اسلام عورت مرد کے لیے

عالمی حقوق کے بارے میں
اسلام کا خاص فلسفہ

ہر جگہ ایک طرح کے حقوق، ایک قسم کے فرائض، ایک نوع کی سزا کا قائل نہیں۔ کچھ حقوق اور ذمے داریاں اور سزائیں مرد کے لیے مناسب سمجھتا ہے، کچھ باتیں عورت کے واسطے کہیں وہ ذرا زیادہ و مرد کو مشابہ وضع میں دیکھتا ہے، کہیں یہ مشابہت نہیں مانتا۔ کیوں؟ کس انداز و حساب کی بنیاد پر؟ یہ وجہ تو نہیں ہے کہ دوسرے دستانوں کی طرح اسلام بھی عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے اور عورت کو پست جنس مانتا ہے یا کوئی اور علت و فلسفہ ہے؟

مذہبی سسٹم کے پیروکار تقریریں اور تحریریں میں لکھتے اور کہتے اور ہم آپ سنتے رہتے ہیں کہ اسلامی قانون قاعدے، مہر و مان و نفقہ، طلاق و تعد و ازدواج، عورت کی جنس کو تفسیر رکھنے کے لیے ہیں۔ ہر جگہ عورت کی توہین کی گئی ہے۔ یہ لوگ سمجھاتے ہیں کہ عوام حکم مردی کی جنبہ داری کہتے ہیں۔

کہتے ہیں: بیسویں صدی سے پہلے رسم و رواج دنیا ہی یہ تھا کہ مرد کی جنس کو عورت کی جنس سے بہتر مانتے تھے۔ عورت فقط مرد کی لذت اندوزی اور بیگار کے لیے پیدا

کی گئی ہے۔ اسلامی قوانین بھی مرد کے فوائد کے گرد گھومتے ہیں۔

کہتے ہیں، اسلام مردوں کا دین ہے وہ عورت کو معیاری انسان نہیں مانتا اس کے لیے ایسے قوانین وضع نہیں کیے جو ایک انسان کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان جانتا تو کئی کئی بیویاں رکھنے کی اجازت نہ دیتا، طلاق کا حق مرد کو نہ دیتا، دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہ مانتا، گھر کی سرداری مرد کو نہ دیتا، بیوی کی میراث مرد کے حصہ ترکہ میں نصف کی نسبت سے نہ رکھتا۔ مہر کے نام سے عورت کی قیمت مقرر نہ کرتا۔ عورت کو اقتصادی و معاشرتی خود مختاری دیتا۔ اسے وظیفہ و نفقہ گیر مرد نہ بناتا۔ یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ اسلام عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے، اسے مرد کے لیے ایک وسیلہ جاتا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام دراصل مساوات کا دین ہے، متعدد مقامات پر اس نے مساوات کا خیال رکھا ہے صرف مرد و زن کے بارے میں اس کا رویہ جدا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام مردوں کے قوانین و حقوق میں امتیاز و ترجیحات کا قائل ہے اگر مردوں کے لیے ترجیحات کا قائل نہ ہوتا تو مذکورہ بالا ضابطے نہ بناتا۔

ان حضرات کے استدلال کو اگر منطق و منطق کے مطابق دھرائیں تو یہ سکل ہوگی:

(الف) اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان مانتا تو مرد کے مساوی و مشابہ حقوق اس کے لیے بھی بناتا۔

(ب) اسلام عورت کے لیے مرد کے برابر اور اس سے مشابہ حقوق و قوانین کا قائل نہیں۔

(ج) لہذا، عورت کو ایک حقیقی و واقعی انسان نہیں مانتا۔

برابری یا مشابہت اس استدلال میں جو کبھی استعمال ہوتا ہے وہ ہے کہ: "قانون میں یکسانیت و مشابہت (نشابہ)

کی بنیاد پر حیثیت و اعزاز انسانی جانچا جائے اور زن و مرد کو ایک سمجھا جائے۔ اچھا تو قسمی زاویے سے بھی ایک گوتے پر اشارہ کیا جانا چاہیے۔ یعنی بتائیے کہ عورت و مرد میں انسانی حیثیت سے اشتراک کا لازمہ کیا ہے؟ لازمہ یہ ہے کہ دونوں قانونی مساوات رکھتے ہوں یعنی کسی قسم کی ترجیح اور کسی کام میں حقوقی امتیاز نہ ہو۔ یا لازمہ یہ ہونا چاہیے کہ زن و مرد کے حقوق میں برابری و مساوات کے علاوہ ایک دوسرے کے مشابہت اور یک رنگی بھی ہونا چاہیے۔ کسی قسم کی تقسیم کار، کسی قسم کی تقسیم فرائض نہ ہو۔ زن و مرد کے انسانی مرتبے میں برابری بلا شک و شبہ موجود ہے۔ انسانی حقوق میں مساوات بھی ہے مگر حقوق میں ایک دوسرے کے مشابہ حقوق کا مقصد کیا ہے۔

اگر فلسفہ یورپ کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر ان کے افکار و نظریات کے زاویے سے سوچنے کا حق دیا جائے تو ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آیا تساوی حقوق کا لازمہ تشابہ حقوق بھی ہے یا نہیں؟ آخر تساوی اور تشابہ میں فرق ہے۔ تساوی کے معنی برابری اور تشابہ کہتے ہیں یکسانیت کو۔ ممکن ہے باپ اپنی دولت اپنی اولاد میں مساوی سے تقسیم کر دے مگر تشابہ تقسیم نہ کرے۔ مثلاً باپ متعدد قسموں کے سرمائے کا مالک ہو۔ ایک تجارتی مرکز، ایک زرعی جائداد، کچھ کرایے کے مکانات و املاک۔ لڑکوں یا صدائیتوں کا جائزہ لینے کے بعد، اس نے اندازہ لگایا کہ ایک میں تجارت، دوسرے میں زراعت، تیسرے میں املاک کے کرایے کی وصولیابی کا حقوق دیکھا۔ اپنا سرمایہ تقسیم کرتے وقت اس نے فیصلہ کیا کہ جائداد و املاک تقسیم کرتے وقت ہر ایک کے حصے کو قیمت میں برابر رکھنے کا خیال رکھا اور کسی کو ترجیح و امتیاز نہیں دیا۔ سب کو حصہ دیتے وقت اس کے حصے کی قیمت کا اندازہ کر لیا۔

کیست (مقدار) اور چیز ہے کیفیت اور چیز ہے، برابر اور ہے اور یکسانیت اور ہے۔ طے شدہ بات ہے کہ اسلام نے یکساں اور یک انداز حقوق زن و مرد کو

نہیں دیے ہیں۔ اس کے باوجود اسلام مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں امتیاز اور ترجیح حقوق کا بھی قائل نہیں۔ اسلام زن و مرد میں انسانی مساوات کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ اسلام زن و مرد کے حقوق میں مساوات کا مخالف نہیں، تشابہ حقوق کے مخالف ہے۔

”ساوی و مساوات“ دہر بری کے لفظ میں چونکہ امتیاز نہ ہونے کا مفہوم بھی ہے لہذا لفظ نے ”تقدس“ کا پہلو اختیار کر لیا ہے، خصوصاً جب اسے ”حقوق“ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ حقوق کی برابری (ساوی حقوق)؛ کتنی مقصدی، خوبصورت ترکیب کون شخص ایسا ہوگا جو پاک فطرت اور صحیح وجدان رکھتا ہو اور ان دو نکتوں کو سن کر سر نہ جھکائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، ہم ایک زمانے میں علم و فلسفہ و منطق کے علم بردار تھے، آج یہ حالت ہے۔ ”تشابہ حقوق زن و مرد“ کو ”حقوق کی برابری“ کے نام سے ہم پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

اس کی مثال تو یہ ہے، جیسے کوئی اپنے بھو (بے پند) کو گلابی دنا شپاتی کی قسم کا ایک پھل، کہہ کر شور مچائے۔

سب مانتے ہیں، اسلام نے زن و مرد میں ہر جگہ تشابہ حقوق وضع نہیں کیے۔ نہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کے لیے مشابہ فرائض اور سزا تجویز کی۔ ہاں، یہ سوال۔ کیا مجموعی طور پر جو حقوق عورت کو دیے ہیں وہ مردوں کو عطا کردہ حقوق سے کم قیمت ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسے ہم ثابت کریں گے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت مرد کے حقوق کو بعض مقامات پر غیر متشابہ کیوں رکھا، علت کیا ہے؟ دونوں کو ایک دوسرے کے مشابہ کیوں نہ رکھا؟ اگر عورت و مرد کے حقوق مساوی بھی ہوتے اور مشابہ بھی تو اچھا نہ ہوتا، جو مساوی تو رکھے مگر مشابہ نہ بنائے؟ اس مدعا کو واضح کرنے کے لیے بن پہلوؤں پر بحث کرنا ہوگی۔

۱۔ تخلیق و پیدائش کے لحاظ سے عورت کی انسانی حیثیت پر اسلام کا نقطہ نظر۔
 ۲۔ عورت و مرد کی تخلیق میں جو فرق ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ آیا یہ اختلاف دونوں کے طبیعی و فطری حقوق میں نامسا بہت رکھنے کا سبب ہے یا نہیں؟
 ۳۔ اسلامی عنا بطوں میں زن و مرد میں جو اختلافات ہیں وہ بعض حصوں میں نامسا بہ حالات پیدا کرتے ہیں ان کا فلسفہ کیا ہے؟ کیا وہ فلسفے ابھی تک اپنے استحکام پر باقی ہیں؟

اسلام کی جہان بینی
 میں عورت کا مرتبہ

۱۔ قرآن فقط قوانین کا مجموعہ نہیں، اس کے مندرجات صرف خشک قواعد و ضوابط ہی نہیں بلکہ ان کی تشریح بھی ہے۔ قرآن میں قانون، تاریخ و غلط

تفسیر خلقت اور ہزاروں مطالب ہیں۔ قرآن کبھی قانونوں کے بیان میں دستور العمل معین کرتا ہے۔ کبھی وجود و ہستی کی تشریح، کبھی خلقت زمین و آسمان، نباتات و حیوانات، انسان اور موت و زندگی، عزت و ذلت، عروج و زوال، غربت و امیری کے رزق بتاتا ہے۔

قرآن کتاب فلسفہ نہیں ہے، اس کے باوجود کائنات، انسان، اور معاشرے فلسفے کے تینوں اہم موضوعات کے بارے میں اپنی حتمی رائے ضرور دیتا ہے۔ قرآن، اپنے پیروکاروں کو فقط قانون کی تعلیم نہیں دیتا، صرف وعظ و نصیحت نہیں کرتا، وہ تشریح تخلیق کائنات بھی کرتا ہے انداز و فکر و کائنات شناسی کا خاص زاویہ بھی بتاتا ہے جن میں معاشرے جیسے مالکیت، حکومت، عائلی قوانین وغیرہ کی تشریح بھی کرتا ہے اور اے تخلیق و موجودات ہی میں قرار دیتا ہے۔

جو مسائل قرآن مجید میں تشریح طلب سمجھے گئے ہیں، ان میں زن و مرد کی تخلیق بھی ہے۔ قرآن نے اس بارے میں خاموشی اختیار نہیں کی اور بے معنی خیال آرائی

کرنے والوں کو موقع نہیں دیا کہ وہ اپنی طرف سے عورت و مرد کے لیے کوئی فلسفہ گزیریں۔
 دوران کی اسلام سے نسبت دے کر اسلامی مسلمات کا نام دیں۔ اسلام نے آگے بڑھ کر
 خود عورت کے بارے میں اپنا نقطہ بیان کیا ہے۔

قرآن مجید کا عورت کے بارے میں نقطہ نظر معلوم کرنے سے پہلے دوسری مذہبی
 کتابوں میں ذہن و مرد کی سرشت پر گفتگو بھی دیکھتے چلیے قرآن مجید بھی خاموش نہیں دیکھنا
 چاہیے کہ تخلیق زن و مرد کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر ہے کیا؟ دونوں ایک خیمہ سے
 بنے ہیں یا الگ الگ؟ دونوں کی سرشت ایک ہے یا مرد کی طینت اور ہے عورت
 کی سرشت اور ہے۔ قرآن بڑی صفائی سے متعدد آیتوں میں کہتا ہے کہ عورت کو مرد
 کی جنس اور اسی جیسی سرشت سے پیدا کیا ہے۔ آدم اول کے بارے میں ارشاد ہے
 ”تم سب کو ایک باپ سے اور اس کی شریک حیات کو خود اسی کی جنس سے قرار دیا
 النساء/۱) تمام آدم زاد کے لیے فرمایا: اللہ نے خود تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں
 پیدا کیں (النساء، آل عمران، الروم)

کچھ مذاہب کی کتابوں میں جو لکھا ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں حقیرانہ
 سے پیدا کیا گیا، یا عورت کو بائیں یا زائد حصہ جسم قرار دیا گیا، اور یہ کہ آدم اول کی بیوی
 آدم کے بائیں پہلو کے کسی عضو سے پیدا کی گئیں۔ قرآن میں اس کا کوئی سراغ نہیں
 ملتا۔ بنا برین اسلام میں عورت کے لیے سرشت و طینت کی بنیاد پر کوئی حقارت
 آمیز نظریہ موجود نہیں۔

ایک اور نظریہ حقارت آمیز ماضی میں موجود تھا اور بین الاقوامی ادب میں
 اس کے ناپسندیدہ نشان ملتے ہیں۔ وہ تھا کہ عورت عنصر گناہ ہے۔ عورت چھوٹا
 شیطان ہے مرد جو گناہ و جرم کرتے ہیں اس میں عورت کا دخل ہوتا ہے۔ مرد بذاتہ گناہ سے پاک ہے
 عورت اسے گناہ کی طرف لے جاتی ہے شیطان براہ راست مرد تک نہیں پہنچ سکتا وہ عورت کے ذریعے مرد کو فر

دیا ہے شیطان، عورت کو دوسو سے میں ڈالتا اور وہ مرد کو۔ آدم اول نے جو شیطان کا فریب کھایا اور سعادت کی جنت سے نکلے وہ بھی عورت کے سبب ہوا شیطان نے حوا کو ورغلا یا اور انھوں نے.....

قرآن نے جنتِ آدم کی بات چھپڑی ہے مگر کہیں یہ نہیں کہا کہ شیطان یا سانپ نے حوا کو فریب دیا، اور حوا نے آدم کو قرآن حوا کو نہ دے دے ورنہ قرار دیتا ہے نہ ان کو حساب خارج کرتا ہے۔ قرآن کے بقول: ہم نے آدم سے کہا، تم اور تمھاری زوجہ بہشت میں رہو اور اس کے میوے کھاؤ۔ شیطان کے دوسووں کے تذکرے میں قرآن تثنیہ کی فریاد لاتا ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ شیطان نے ان دونوں کے لیے دسویں کے
فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ شیطان نے ان دونوں کو فریب کی راہ دکھائی۔
وَقَامَا فِيهَا لُكْمًا مِّنَ النَّجِيسِ یعنی شیطان نے دونوں کے پاس
میں قسم کھائی کہ وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے اس دور کے عام عقیدے بلکہ آج کی دنیا میں بھی کہیں کہیں پائے جانے والے عقیدے کے خلاف سختی سے قدم اٹھایا اور جنس زن کو اس اتہام سے بری قرار دیا کہ وہ عنصر گناہ یا گناہ ہے یا چھوٹا شیطان ہے۔

یہ تعارتِ آمیز نظر یہ بھی عورت کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی روحانی و نفسیاتی صلاحیت کے پیش نظر وہ جنت میں نہیں جائے گی۔ عورت روحانی سراج اور الہی معارف کو نہیں پاسکتی۔ جیسے مرد قربِ الہی حاصل کرتے ہیں عورت کو یہ

۱۔ البقرہ/۲۵ (یا ادم اسکن انت و زوجک الجنة و کلا منہما رغداً)

۲۔ الاعراف/۳۰ ۳۔ الاعراف/۲۲ ۴۔ الاعراف/۲۱

مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے متعدد آیات میں صاف صاف کہا ہے کہ آخرت کا بدلہ، اور قرب الہی کا جنس سے کوئی تعلق نہیں، یہ مسئلہ ایمان و عمل کا ہے اس میں عورت ہو یا مرد، قرآن مجید نیک اور مقدس مرد کے ساتھ نیک اور مقدس خاتون کا تذکرہ کرتا ہے۔ آدم و ابراہیم علیہما السلام کے ساتھ ان کی بیویاں، حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی محترم مائیں، بڑے اعزاز سے یاد کی گئی ہیں۔ نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کا نااہل بیویوں کے نعمن میں بیان کیا مگر نہایت موزوں انداز سے۔ زوجہ فرعون، ایک بڑی خاتون جو انتہائی گندے شوہر کے ساتھ رہیں۔ گویا قرآن نے اپنی تاریخی حکایتوں میں توازن کو برقرار رکھا۔ اور اپنی داستانوں کے ہیرو مرد ہی نہیں خواتین کو بھی یاد رکھا ہے۔

قرآن کریم، مادرِ حضرت موسیٰ کے بارے میں کہتا ہے :
 ”ہم نے مادرِ موسیٰ کو ”وحی“ بھیجی کہ بچے کو دو دودھ پلائیں اور جب ان کی جان کے بارے میں وہ خوف زدہ ہوں تو ہمند رہیں ڈال دیں اور ڈریں نہیں کہ ہم اسے تمہارے واپس لوٹا دیں گے“

قرآن کریم مادرِ عیسیٰ حضرت مریمؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کا مرتبہ یہاں تک پہنچا کہ ملائکہ محرابِ عبادت میں ان سے باتیں کرتے تھے۔ غیب سے ان کے لیے روزی آتی تھی، روحانی مرتبہ اتنا بلند ہوا کہ پیغمبرِ وقت حیران رہ گئے وہ نبی سے آگے بڑھ گئیں، زکریا، مریمؑ کے سامنے حیران ہو گئے۔

تاریخ اسلام میں مقدس و بلند مرتبہ عورتیں فراواں ہیں، حضرت خدیجہؑ کے پائے کے بہت کم مرد ملیں گے اور پیغمبرِ مصلیٰ کے سوا فاطمہؑ کا ہم پایہ کوئی نہ تھا۔

حضرت زہرا سلام اللہ علیہا خاتم الانبیاء کے علاوہ تمام پیغمبروں اور اپنی اولاد (جو امام تھی) سب پر شرف رکھتی ہیں۔ اسلام نے خلق سے حق کی طرف سفر میں زن و مرد کا فرق نہیں کیا، بل سے حق سے خلق۔ کے سفر میں اور پیغمبرانہ ذمہ داریوں میں مرد کو مناسب تر سمجھا ہے۔

عورت کے بارے میں ایک اور حقارت آمیز نظریہ تھا، وہ مجرد جنسی ریاضت، شادی نہ کرنے اور مرد سے دور رہنے کا دستور تقدس ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بعض آئینوں میں جنسی روابط بذاتہ نجس ہیں، اور ان قوانین کے ماننے والوں میں فقط وہی لوگ روحانی درجے حاصل کر سکتے ہیں جو ساری زندگی کنوار پن میں گزار دے۔ بین الاقوامی پیشوائے مذہبی کا جملہ ہے ”بکارت کے تیشے سے شادی کے درخت کو جڑ سے کاٹ دو“ یہی پیشوا دی کو فاسد فاسد کر کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں چونکہ اکثریت کنوار پن پر صبر کر سکتے ہیں لہذا ہو کر فتنہ و منکریں گھر گھر ہو جاتے ہیں، متعدد عورتوں سے پھنستے ہیں، ریاضت کی فکر اور مجرد زندگی کی حمایت اور کنوار پن جنس خواتین سے بدظنی ہے۔ یہ لوگ عورت سے محبت کو اخلاقی تباہ کاری شمار کرتے ہیں۔

اسلام نے اس بے معنی نظریے اور عمل سے مقابلہ کیا اس نے ازدواج کو مقدس قرار دیا، کنوار پن کو منحوس شمار کیا، اسلام نے عورتوں سے محبت کو انبیاء کے اخلاق کا حصہ بنا، اور کہا: ”من اخلاق الانبیاء حب النساء“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، مجھے تین چیزیں پسند ہیں خوشبو، عورت اور نماز۔

برٹریڈ رسل کہتے ہیں: تمام مذاہب میں جنس زن کے بارے میں بدظنی ہے، اسلام کے علاوہ، اسلام نے معاشرتی فلاح و بہبود کے زاویے سے حدود اور پابندیاں تو رکھی ہیں مگر اس رابطے یا عورت کو نجس قرار نہیں دیا۔

عورت کے بارے میں حقارت آمیز ایک رویہ یہ بھی تھا کہ: عورت وجود

مرد کا پیش خیمہ ہے، وہ مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

اسلام نے کوئی ایسا بات نہیں کہی، اسلام نے انتہائی وضاحت سے علت غائی بیان کی اور اسلام صاف صاف کہتا ہے: زمین و آسمان، ابر و ہوا، نباتات اور حیوانات سب انسان کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی اس کے بجائے وہ ایک کو دوسرے کے لیے پیدا ہونے کا تذکرہ کرتا ہے:

”هٰنَ لِبَاسٌ لَّكُمْ فَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لِّهِنَّ“۔ عورتیں تمہارے لیے زینت و لباس ہیں تم عورتوں کے لیے لباس و زینت ہو۔ اگر اسلام عورت کو مرد کے لیے پیش خیمہ جانتا تو بہر حال اپنے قوانین میں اس زاویے کو ملحوظ رکھتا، لیکن چونکہ اسلام تشریح خلقت کے نقطہ نظر کا حامی نہیں اور عورت کو طفیلی وجود مرد نہیں مانتا، اس بنا پر اس نے اپنے ضابطوں میں زن و مرد کے لیے یہ گوشہ پیش نظر نہ رکھا۔

حقارت آمیز رویوں میں سے ایک رویہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسا شر و بلا ہے جس سے مرد بچ نہیں سکتا، بہت سے مرد جنہوں نے عورت سے فائدہ اٹھایا ہے، وہ بھی اسے خیر اور اپنی مصیبت کی بنیاد جانتے ہیں قرآن حکیم نے خصوصی طور پر اس بات کی یاد دلائی ہے کہ وجود زن مرد کے لیے خیر و آرام دل و جان ہے۔

تو ہیں نمبر رویوں میں یہ بات بھی ہے کہ عورت تولید میں ناچینر ہے، جاہلیت کے عرب اور تعدد قومیں ماں کو مرد کے مادہ تخلیق کا برتن جانتی تھیں ان کے خیال میں مرد کا مادہ ہی اصل بیج ہے ماں فقط اسے محفوظ رکھتی اور نشوونما دیتی ہے۔

۱۔ بقرہ/۱۸۷

۲۔ الروم/۲۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ انْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا اِيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ۔

وَرَّانِ مجید نے متعدد آیات میں پھر تھکا سیر اس سوچ کو ختم کیا، اور مرد و عورت کو مساوی بتایا۔

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا کہ فلسفیانہ اور تخلیقی بیانات کے نقطہ نظر سے اسلام کسی قسم کی حقارت آمیز رائے نہیں رکھتا، بلکہ ایسے خیالات کو بے ہودہ سمجھتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ مرد و زن کے حقوق میں تشابہ نہ ہونے کا فلسفہ کیسے؟ ہم نے کہا ہے، اسلام زن و مرد کے خانگی تعلقات و حقوق میں خاص فلسفہ کا مالک ہے۔ اسلام کا فلسفہ خود سو برس پہلے کے فلسفے سے مختلف اور عامر فلسفے سے بھی متفق نہیں ہے۔

مساوات؟ ہاں۔ مشابہت؟ نہیں۔

ہم کہہ چکے کہ اسلام میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ مرد و زن دو مساوی انسان ہیں یا انسانیت میں فرق ہے؟ کیا ان کے گھروں، حقوق، قیمت کے لحاظ سے مساوی ہوں یا نہیں؟ اسلام کی نظر میں مرد و زن دونوں انسان ہیں اور انسانی حقوق میں برابر کے حصے دار ہیں۔

اسلام کے نزدیک بحث طلب بات ہے کہ زن و مرد فقط اس بنا پر کہ ایک عورت ہے، دوسرا مرد، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، کائنات ان دونوں کے لیے یکساں نہیں ہے، خلقت اور طبیعت نے دونوں کو ایک جیسا تسلیم نہیں کیا، وہ یہی ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے پہلو ایسے ہیں جہاں حقوق و فرائض، قانون سزا میں مشابہ وضع نہیں ہے۔ یورپ کو شاں ہے کہ عورت و مرد بلحاظ قوانین و ضوابط، حقوق و فرائض میں وضع کے طور پر ایک اور مشابہ ہیں۔ اور طبیعت اور پھر کے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اسلام اور مغربی سسٹم میں یہی اختلاف دیکھا جاتا ہے بنا پر یہ جھگڑا ہے کہ اسلامی قوانین کے طرفدار اور مغربی سسٹم کے حامی "اکائی اور تشابہ قوانین زن و مرد"

۱۳۔ "یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی..." شے یہ بات پہلوی دور کی ہے، انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بدل چکی ہے لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا مذہبی ہے کہ اسلام کا نسل تو سے مگویش وہ قوانین کچھ اور۔

وَرَانِ مجید نے متعدد آیات میں پھر تفاسیر اس سوچ کو ختم کیا، اور مرد و عورت کو مساوی بتایا۔

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا کہ فلسفیانہ اور تخلیقی بیانات کے نقطہ نظر سے اسلام کسی قسم کی حقارت آمیز رائے نہیں رکھتا، بلکہ ایسے خیالات کو بے ہودہ سمجھتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ مرد و زن کے حقوق میں تشابہ نہ ہونے کا فلسفہ کیسے؟ ہم نے کہا ہے، اسلام زن و مرد کے خانگی تعلقات و حقوق میں خاص فلسفہ کا مالک ہے۔ اسلام کا فلسفہ خود سو برس پہلے کے فلسفے سے مختلف اور عامر

مساوات؟ ہاں۔
مشابہت؟ نہیں۔

فلسفے سے بھی متفق نہیں ہے۔

ہم کہہ چکے کہ اسلام میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ مرد و زن دو مساوی انسان ہیں یا انسانیت میں فرق ہے؟ کیا ان کے گھروں، حقوق، قیمت کے لحاظ سے مساوی ہوں یا نہیں؟ اسلام کی نظر میں مرد و زن دونوں انسان ہیں اور انسانی حقوق میں برابر کے حصے دار ہیں۔

اسلام کے نزدیک بحث طلب بات ہے کہ زن و مرد فقط اس بنا پر کہ ایک عورت ہے، دوسرا مرد، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، کائنات ان دونوں کے لیے یکساں نہیں ہے، خلقت اور جمیعت نے دونوں کو ایک جیسا تسلیم نہیں کیا، وہ یہی ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے پہلو ایسے ہیں جہاں حقوق و فرائض، قانون سراسر مشابہ وضع نہیں ہے۔ یورپ کو شاں ہے کہ عورت و مرد بلحاظ قوانین و ضوابط، حقوق و فرائض میں وضع کے طور پر ایک اور مشابہ ہیں۔ اور طبیعت اور نچر کے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اسلام اور مغربی سسٹم میں ایسے اختلافات و نما ہوتا ہے بنا پر یہ جھگڑا سے ملتا، اسلامی قوانین کے طرفدار اور مغربی سسٹم کے حامی "اکائی اور تشابہ قوانین زن و مرد"

۱۳۔ "یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی..." شے یہ بات پہلوی دور کی ہے، انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بدل چکی ہے، لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا مندرجہ ذیل ہے کہ اسلام کا یہل تو ہے مگر وہ قوانین کچھ اور۔

برابر بلکہ بہتر حقوق کا اعتراف کریں۔

میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ ہمارے موجودہ بظاہر اسلامی معاشرے میں جو قوانین عملاً رائج ہیں وہ قدر و قیمت کے لحاظ سے عورت کو مرد برابر حقوق دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آج کی عورت کے معاملات کی مکمل چھان بین کی جائے اور وہ بہت سے حقوق جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں اور طویل مدت سے عملاً ان کو چھوڑ رکھا گیا ہے۔ وہ سب حقوق واپس کیے جائیں۔ مگر یورپ کی اندھی تقلید میں نہیں جو خود ان کے لیے مصیبت عظیم کا سبب بنے ہوئے ہیں ہم بھی غلط طریقے اور مفروضے کا خوبصورت نام رکھ لیں۔ اور مغربی قسم کی بد نصیبیوں پر مزید مشرقی قسم کی بد بختیاں بڑھا دیں میرا مدعا یہ ہے کہ عورت اور مرد کی طبیعت و خیر میں جس حد تک مشابہت نہیں ہے۔ وہاں تک دونوں کو غیر مشابہتی حقوق دیے جائیں اور اس میں ”عدل“ و ”حقوق فطری“ کی نگہداشت رہے۔ یوں عائلی زندگی بھی خوشگوار ہو سکے گی اور معاشرہ بہتر خوشی میں آگے بڑھ سکے گا۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ انصاف عدالت اور فطری و انسانی حقوق زن و مرد کا لازمہ یہ ہے کہ کچھ حقوق میں ”تشابہ“ نہیں ہے۔ لہذا ہماری سو فی صد فلسفیانہ پہلو سے ہے۔ اس کا تعلق فلسفہ قانون سے ہے۔ اس کا تعلق اصل عدالت اور کلیہ ”انصاف“ سے ہے ”عدل“ اصول دین میں بھی ہے اور فقہ اسلامی میں بھی کہن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ”اصل عدل“ وہ کلیہ ہے جو اسلام میں ”عقل و شرع“

شہید بات پہنوی دور کی ہے، انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ لیکن ایران کے عداوت مند دس سالوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اسلام کا یسٹل تو ہے مگر جس وہ قوانین کچھ اور۔

کی طبیعت کا سبب یعنی اسلامی فقہ۔ مکمل شیعہ فقہ۔ ہیں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں قانون فلاں بنیاد پر خلاف عدل ہے اور اگر اس کی صورت یہ ہو تو ظلم ہوگا اور اس عدالت کے خلاف ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے تو مجبوراً ماننا پڑے گا کہ شریعت کا حکم یہی ہے، کیونکہ شریعت نے خود ایک اصل کی تعلیم دی اور کہا ہے کہ عدالت و حقوق فطری و طبیعی کے محور سے حکم کو دور نہ ہونا چاہیے۔

تقدیر یہی تھا کہ وہ لوگ اپنا کام مکمل طور پر آگے نہ بڑھا سکے تقریباً آٹھ صدی بعد یورپ کے فلاسفہ اور دانشوروں نے پیچھا کیا اور یہ اعزاز اپنے لیے حاصل کر لیا کہ معاشرتی و سیاسی و اقتصادی فلسفے پیدا کیے اور دوسری طرف افراد، معاشروں اور قوموں کو زندگی کی قدروں اور ان کو ان کے انسانی حقوق سے آشنا کیا، تحریکات اور انقلابات برپا کیے دنیا کی صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

میرے خیال میں تاریخی اسباب کے علاوہ ایک نفسیاتی و جغرافیائی سبب کا دخل بھی تھا۔ ہاں معنی کہ اسلامی مشرقی بلاک میں عقلی حقوق کا مسئلہ تو موجود تھا مگر لوگوں نے اس کو مسلسل توجہ کے قابل نہ سمجھا، اس کی ایک وجہ مشرقی و مغربی لوگوں کے اخلاقی رجحانات ہیں، مشرق اخلاق کی طرف مائل ہے اور مغرب حقوق کی طرف، مشرق اخلاق کا دیوانہ، مغرب حقوق پر فریفتہ، مشرق اپنی فطرت و طبیعت کی بنا پر انسانیت کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ جذبات کام میں لائے درگزر کرے، اپنے ہم نوع افراد سے محبت کرے، جواں مردی اور فرائض جو مسلکی دکھائے لیکن مغربی انسان کے نزدیک انسانیت کا مطلب ہے اپنے حقوق جاننا، اس کا دفاع کرنا، اور کسی کو یہ حق نہ دینا کہ اس کے حقوق کے دائرے میں قدم رکھے۔

بشریت کو اخلاق کی ضرورت بھی ہے اور حقوق کی بھی۔ انسانیت حقوق سے بھی تعلق رکھتی ہے اور اخلاق سے بھی، اخلاق و حقوق الگ الگ انسانیت کا

معیار نہیں ہیں۔

دین مقدس اسلام اس عظیم خصوصیت کا حامل تھا اور ہے۔ اس نے حقوق اخلاق کو ایک وقت مرکز توجہ قرار دیا۔ اسلام کے نزدیک خلوص و نیکی، اخلاق معاملات ہیں اور ”مقدس“ کام، حقوق اور ان کا دفاع بھی ”مقدس“ اور انسانی کام شمار ہوتے ہیں۔ یہ تفصیل طلب داستان ہے جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔

خاص مشرقی روح نے اپنا عمل انجام دیا۔ شروع شروع میں تو حقوق و اخلاق دونوں اسلام سے لیے اور ان پر عمل کیا لیکن آہستہ آہستہ حقوق کو چھوڑ دیا اور اخلاق پر توجہ جمالی۔

مقصود یہ ہے کہ، اس وقت جس مسئلہ کا سامنا ہے۔ وہ مسئلہ قانونی ہے۔ وہ مسئلہ عقلی و فلسفی ہے۔ وہ مسئلہ استدلال و برہان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا تعلق عدالت اور جج پر آف لا ہے۔ عدالت و انصاف و حقوق۔ قانون وضع ہونے سے پہلے موجود تھے اور قانون وضع کرنے سے عدالت و حقوق انسانی کی حقیقت نہیں بدلی جاسکتی۔

مان ٹیسکیو کہتا ہے،

”انسان کی قانون سازی سے پہلے، ایسے عادلانہ رویے موجود تھے جو مخلوقات پر حکومت کرتے تھے۔ انھیں رویوں کا وجود بعد میں قانون سازی کا سبب بنا۔ اب اگر ہم یہ فرض کریں کہ سوائے ابتدائی قوانین کے کوئی شے عادل یا ظالم وجود نہیں رکھتی تو گویا ہم اس کے مدعی ہو رہے کہ دائرہ بننے سے پہلے اس دائرے کی تمام شعاعیں اور خط مساوی ہیں ہیں۔“

سربرٹ اسپنسر کہتا ہے،

”عدالت احساسات کے علاوہ کسی اور چیز سے مخلوط ہے اسے افراد بشر کے طبعی

حقوق کہتے ہیں۔ اور عدالت کے وجود خارجی سے پہلے حقوق اور طبعی خصوصیات (و امتیازات) کا احترام کرنا چاہیے۔“

یورپ کے فلسفی یہی عقیدہ پہلے بھی رکھتے تھے اور اب بھی وہ بہت بڑی تعداد میں اسی کے حامی ہیں۔ حقوق انسانی کے اعلانات اور منشور اسی نظر سے کے ماتحت مرتب ہوئے اور جو دفعات وضع کی گئی ہیں وہ حقوق طبعی کے مفروضہ سے حاصل شدہ نتائج ہیں یعنی حقوق طبعی و فطری کا مفروضہ جس نے اعلان حقوق انسانی “روپ دھارے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مان ٹیسکیو، اسپنسر وغیرہ عدالت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں بعینہ وہی بات ماہرین علم کلام (علم عقائد) ”حسن و قبح عقلی“ کے ضمن میں کہتے رہے ہیں۔ مسلمان علما میں کچھ لوگ ذاتی حقوق کے منکر اور عدالت کو معاہداتی چیز جانتے ہیں۔ یورپ والوں میں بھی یہ خیال موجود تھا، انگریز ”ہوبز“ عدالت کو ایک موجود حقیقت نہیں مانتا تھا۔

حقوق انسانی کا منشور
فلسفہ قانون نہیں ہے
منطکہ خیز بات یہ کہتے ہیں کہ: حقوق انسانی کے منشور کو حکومت کے دونوں ایوانوں نے منظور کیا ہے۔ بات ہے عہد شاہی کی۔ اور چونکہ حقوق زن و مرد اس منشور کی ایک دفعہ ہے لہذا قانون تائید ہر دو ایوان

۱۔ علم کلام و عقائد میں ایک بحث یہ ہے کہ اچھائی اور برائی عقلی بنیاد پر موجود ہے یا اسلام نے جسے اچھا کہا وہ اچھا ہے اور جسے برا کہا وہ برا ہے۔ یہی بحث ”عدل“ کے موضوع میں دبستان بناتی ہے۔ امامیہ و شافعیہ و معتزلہ۔

۲۔ دونوں ایوانوں سے مراد اس وقت کی مجلس ملی اور سنا ہے۔ مدعی کہتے تھے کہ عورت مرد کے مساوی حقوق کا مسئلہ قابل بحث یوں نہیں ہے کہ سینٹ اور اسمبلی نے منشور حقوق انسانی، اقوام متحدہ منظور کر لیا ہے اور اس میں مساوی حقوق موجود ہیں لہذا ”سول لا“ میں اگر غیر مساوی ہیں۔

حقوق کہتے ہیں۔ اور عدالت کے وجود خارجی سے پہلے حقوق اور طبعی خصوصیات (و امتیازات) کا احترام کرنا چاہیے۔“

یورپ کے فلسفی یہی عقیدہ پہلے بھی رکھتے تھے اور اب بھی وہ بہت بڑی تعداد میں اسی کے حامی ہیں۔ حقوق انسانی کے اعلانات اور منشور اسی نظر سے کے ماتحت مرتب ہوئے اور جو دفعات وضع کی گئی ہیں وہ حقوق طبعی کے مفروضہ سے حاصل شدہ نتائج ہیں یعنی حقوق طبعی و فطری کا مفروضہ جس نے اعلان حقوق انسانی “روپ دھارے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مان ٹیسکیو، اسپنسر وغیرہ عدالت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں بعینہ وہی بات ماہرین علم کلام (علم عقائد) ”حسن و قبح عقلی“ کے ضمن میں کہتے رہے ہیں۔ مسلمان علما میں کچھ لوگ ذاتی حقوق کے منکر اور عدالت کو معاہداتی چیز جانتے ہیں۔ یورپ والوں میں بھی یہ خیال موجود تھا، انگریز ”ہوبز“ عدالت کو ایک موجود حقیقت نہیں مانتا تھا۔

حقوق انسانی کا منشور
فلسفہ قانون نہیں ہے
منحکمہ خیز بات یہ کہتے ہیں کہ: حقوق انسانی کے منشور کو حکومت کے دونوں ایوانوں نے منظور کیا ہے۔ بات ہے عہد شاہی کی۔ اور چونکہ حقوق زن و مرد اس منشور کی ایک دفعہ ہے لہذا قانون تائید ہر دو ایوان

۱۔ علم کلام و عقائد میں ایک بحث یہ ہے کہ اچھائی اور برائی عقلی بنیاد پر موجود ہے یا اسلام نے جسے اچھا کہا وہ اچھا ہے اور جسے برا کہا وہ برا ہے۔ یہی بحث ”عدل“ کے موضوع میں دبستان بناتی ہے۔ امامیہ و شافعیہ و معتزلہ۔

۲۔ دونوں ایوانوں سے مراد اس وقت کی مجلس ملی اور سنا ہے۔ مدعی کہتے تھے کہ عورت مرد کے مساوی حقوق کا مسئلہ قابل بحث یوں نہیں ہے کہ سینٹ اور اسمبلی نے منشور حقوق انسانی، اقوام متحدہ منظور کر لیا ہے اور اس میں مساوی حقوق موجود ہیں لہذا ”سول لا“ میں اگر غیر مساوی ہیں۔

کے مطابق عورت و مرد کو مساوی حقوق کا مالک ہونا چاہیے۔
 شاید منشور حقوق انسانی، قراردادِ مسودہ قانون، ہے اور اس میں صلاحیت ہے
 کہ دونوں ایوان اسے منظور یا نامنظور کر سکیں!؟
 منظور حقوق انسانی کے مشتملات قراردادِ قسم کے نہیں ہیں کہ مختلف ممالک کے قانون
 ساز ادارے اس کو منظور یا نامنظور کر سکیں۔

منشور حقوق انسانی، ذاتی حقوق ہیں وہ نہ چھینے جاسکتے ہیں نہ خود آدمی انہیں کسی کو
 دے سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں یا ایسے حقوق ہیں جن پر اس میں گفتگو کی گئی ہے اس
 منشور میں ایسے حقوق پر گفتگو ہے جو منشور کے دعوے کے مطابق انسانی حیثیت کے لازم
 میں اور تخلیق کے توانا ہاتھوں نے انسان کے لیے معین کیے ہیں۔ یہ حقوق منشور کے دعوے کے مطابق اس انسان کو ملنا چاہیے
 انسان اس منشور کے حقوق اپنے لیے وضع نہیں کر سکتے، نہ وہ اپنے اختیار سے سلب
 یا ساقط کر سکتے ہیں۔ دونوں ایوانوں کی منظوری یا قانون ساز اداروں کی تائید کا اصول
 ہی نہیں۔

منشور حقوق انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اس کی منظوری فلسفیوں کو کرنا چاہیے
 نہ اسمبلی کے نمائندوں کو، دونوں ایوانوں کو یہ حق کہاں ہے کہ وہ اپنی اٹھک بیٹھکوں
 میں لوگوں کے لیے منطق و فلسفہ وضع کریں۔ اور اگر ایسا ہے تو آئن سٹائن کا فلسفہ امتیاز
 بھی اسمبلی میں لائیں اور نمائندوں سے وہ تنگ کرائیں۔ آسمانی کروں میں فلسفہ حیات
 بھی منظور کرائیں۔ طبیعت کے قانون، قراردادوں کی طرح منظور یا منظور نہیں ہو سکتے۔
 جیسے ہم کہیں کہ دونوں ایوان نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا ہے کہ گلابی ناشپاتی

— تو منسوخ، نئے جائیں۔ ٹھیک ممبری اس کا جواب دیتے ہیں کہ منشور میں تائید و مخالفت ایوان کی ضرورت
 ہی نہیں وہ ایک فلسفہ اور مستقل دستور ہے۔

کا سب سے پیوند لگایا جائے تو پیوند لگ جاتا ہے اور اگر تہمت کے درخت میں اس کا پیوند لگایا جائے تو نہ لگے گا۔

جب اس قسم کے اعلان کسی ایسے گروہ کی طرف سے شایع ہوں جو مفکر اور فلسفی ہوں تو اقوام کو چاہیے کہ اس اعلان کو فلاسفہ اور مجتہدین کے سامنے رکھیں اور اگر اس قوم کے مفکرین و فلاسفہ کی رائے اس کے حق میں آجائے تو اس قوم کے تمام افراد پابند ہیں کہ ان متعلق کو قانون سے بالاتر سمجھیں، قانون ساز ادارے بھی پابند ہیں کہ کوئی قانون اس کے خلاف وضع نہ کریں۔

دوسری قوموں کا معاملہ یہ ہوگا کہ جب تک خود ان کی رائے میں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ واقعا طبیعت میں یہ حقوق اسی طرح سے موجود ہیں اس وقت تک وہ اس کی پابندی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ پھر یہ مسائل تجرباتی تو ہیں نہیں جن کے لیے وسائل اور لیبارٹری ہو اور وہ آلات اور لیبارٹریاں صرف یورپ والوں کو میسر ہیں دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ ایٹم کو توڑنے اور اس کے دوسرے راز معلوم کرنے کی بات نہیں کہ یہ سب کچھ چند محدود افراد کے قبضے میں ہے۔ یہ فلسفہ و منطق کی بات ہے اور اس کے آثار ہیں مغز، عقل اور قوت استدلال۔

فرض کیجیے اگر دوسری قومیں مجبور ہوں اور فلسفہ و منطق میں وہ دوسروں کی تقلید کریں، اپنے اندر موزونیت اور فکر فلسفی کی کمی محسوس کریں تو ہم ایرانیوں کو تو یہ نہ کرنا چاہیے۔ ہم نے ماضی میں اپنی صلاحیتیں درجہ کمال پر دکھائی ہیں اور منطق و فلسفہ کی چھان بین میں کام کیے ہیں۔ ہم فلسفے کے مسائل میں دوسروں کی تقلید کیوں کریں؟

مسلمان دانشوروں پر حیرت ہے کہ جہاں ”اصل عدالت“ اور انسان کے نجی حقوق کا نام آتا ہے، وہ اس قدر اس کی اہمیت ماننے لگتے ہیں کہ چوں و چرا کے بغیر ”عقل و شرع“ کی مطابقت کا اصول برتنے لگتے ہیں اور فرماتے ہیں ”یہی حکم شرعی“

یعنی شرعی تائید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچا ہے کہ ان مسائل کی تائید اسمبلی کے نمائندوں سے طلب کی جاتی اور اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہم عورت کے حقوق انسانی کی تحقیق کے لیے ٹرکوں اور لٹریکوں سے رجوع کریں، کوپن (سوالنامہ) چھاپ کر ان

فلسفہ کوپن سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

سے جواب لکھوائیں، اور اس کی روشنی میں نتیجہ نکالیں کہ انسانی حقوق کیا ہیں؟ کیا عورت و مرد کے انسانی حقوق ایک جیسے ہیں یا دو طرح کے ہیں؟

بہر حال، ہم عورت کے انسانی حقوق کا مسئلہ علمی و فلسفی اساس اور انسان کے ذاتی حقوق کی بنیاد پر دیکھیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ جن اصولوں کا یہ تقاضا ہے کہ تمام انسان کلی طور پر خداداد اور طبعی حقوق کے ایک سلسلے کے مالک ہیں، آیا وہی اصول یہ بھی لازم قرار دیتے ہیں کہ عورت و مرد بھی حقوق کے نقطہ نظر سے مشابہ (وضع) حالت رکھتے ہیں یا نہیں؟ میں ملک کے صحیح دانشوروں، مفکروں اور قانون دان حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دلائل کو تحقیق و تنقید کی نظر سے دیکھیں۔ کیونکہ ایسے حضرات ہی اس قسم کے مسائل میں اظہار رائے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انتہائی شکرگزاری کا باعث ہوگا اگر یہ حضرات اپنی رائے دلائل کے ساتھ بیان فرمائیں۔ تائید میں یا تردید میں۔

اس دعا کی تہ تک پہنچنے کے لیے پہلے انسانی حقوق کی اساس و بنیاد سے بحث کرتے ہیں۔ پھر عورت و مرد کے حقوق کو موضوع مطالعہ بنائیں گے۔

مناسب جگہ کا اصل مطلب پہلے نئی صدی میں حقوق سے متعلق تحریکوں جو زن و مرد کے حقوق میں برابری کے نظریے پر تمام ہوئے اشارہ کروں۔

یورپ میں حقوق نسوان کی تاریخ پر ایک نظر:

یورپ میں سترھویں صدی کے بعد انسانی
حقوق کے نام سے نغمہ سنجی شروع ہوئی، ترقی
اٹھارویں صدی کے لکھنے والوں نے حیرت انگیز

تسلل سے اپنے افکار، انسان کے طبعی، فطری اور ناقابل سلب حقوق پر پھیلا ناشریح کیے
جان جکیوروسو، والٹر اور مائیکو اسی گروپ کے مفکر اور مصنف ہیں۔ انسانی حقوق طبعی
کے بارے میں ان افکار کی اشاعت کا عملی اثر یہ ہوا کہ انگلستان کی حکومت اور عوام میں
رہ کشی کا آغاز ہو گیا اور ۱۹۸۹ء میں قوم نے کچھ اپنے اہتمامی اور سیاسی حقوق ایک
منشور کی صورت میں پیش کیے اور انھیں حاصل کر لیا۔

اس مہم کا دوسرا بڑا نتیجہ، انگلستان کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی میں برآمد
ہوا، شمالی امریکہ کے تیسرا استعماری علاقے، جہاں کے عوام نے سخت دباؤ اور شدید
حملے کر کے بغاوت اور خود مختاری کا پرچم بلند کیا اور آخر میں اپنی آزادی حاصل کر لی۔
۱۷۷۶ء میں فلاڈلفیا میں ایک کانفرنس ہوئی جہاں آزادی عام کے بارے میں ایک
اعلان و منشور شایع کیا گیا، اس کے مقدمے میں لکھا تھا:

”تمام افراد بشر خلقت میں یکساں ہیں اور خالق نے سب کو مستقل اور ناقابل تبدیل
حقوق عطا فرمائے ہیں، جیسے زندگی، کاتھ اور آزادی، کاتھ حکومتوں کی تشکیل کی طاقت اور اصل حق
مذکورہ حقوق کی حفاظت ہے۔ اور اس کا اقتدار قوم کی پس پر موقوف ہوگا۔۔۔“

۱۔ ترجمہ تاریخ برصغیر ج ۴ ص ۲۶۶۔ مصنف نے البرٹ مالٹ کی نوول ہسٹری یونیورسل

“ALBERT MALET'S NOVELLE HISTOIRE UNIVERSELLE”

THE UNANIMOUS DECLARATION OF THE

THIRTEEN UNITED STATES OF AMERICA”

جو جو ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو منظور ہوا۔

افراد بشر آزاد پیدا ہوئے ہیں اور زندگی بھر آزاد رہیں گے اور حقوق میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔۔۔۔۔“

انیسویں صدی میں، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے بارے میں حقوق بشر کے مسئلہ پر نئے افکار ابھرے جن کے نتیجے میں سوشلزم، اور محنت کش طبقہ کی نفع میں قطعی شرکت اور سرمایہ دار کے ہاتھ سے مزدور کو حکومت منتقل کرنے کی بات سامنے آئی۔

یسویں صدی کی ابتدا میں انسانی حقوق کے بارے میں جتنی بھی گفتگو ہوئی ہے اس کا پس منظر۔ حکومتوں کے مقابلے میں قومی حقوق یا مزدور و محبت کش عوام اور حکمران و مالک ہیں۔

یسویں صدی میں پہلی مرتبہ مردوں کے مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا سوال

"DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN AND
OF CITIZENS"

یہ مشق فرانسیسی قومی اسمبلی نے ۱۷۸۹ء میں آئین کے مقدمہ کے طور پر منظور کیا اور بعد میں
تھامس پاس کے ذریعہ حقوق انسانی کے نام سے مشہور ہوا۔

”ہاں، انگلستان دموکریسی میں قدیم ترین ملک تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ملک بیسویں صدی کے اوائل میں ”عورت و مرد کے مساوی حقوق“ کا قائل ہوا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ باوجود کہ اٹھارہویں صدی میں اعلان آزادی کے ساتھ ”عام انسانی حقوق“ کا اعتراف کر چکا تھا، مگر سیاسی حقوق میں مرد و زن کی مساوات کا مسودہ ۱۹۴۷ء میں منظور کرتا ہے۔ فرانس نے بھی بیسویں صدی ہی میں یہ اصول مانا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں پوری دنیا میں متعدد گروپ "عورت و مرد" کے حقوق و فرائض کے بارے میں ایک بڑی اور گہری تبدیلی کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ قوموں کے تعلقات حکومتوں سے، محنت کشوں کے تعلقات مالکوں سے، مزدوروں کے تعلقات سرمایہ داروں سے اس وقت دگرگوں نہیں ہو سکتے جب تک مرد و زن کے حقوق و تعلقات میں اصلاحات رونما نہیں ہوتے، نہ اس کے بغیر معاشِ ترقی انصاف قائم ہو سکتا ہے۔

اسی لیے انسانی حقوق کا منشور ۱۹۴۸ء جنگ عظیم دوم کے بعد ادارہ اقوام متحدہ نے شایع کیا۔ اس کے مقدمے میں درج ہے:

”چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی حقوق، اور مردانہ انسانی کی قدر و قیمت اور

”حقوق مرد و عورت کی برابری کا ایک بار پھر اعلان کیا ہے۔۔۔۔۔“

انیسویں اور بیسویں صدی کا مشینی (صنعتی) انقلاب کاری گروں اور مزدوروں، خاص کر عورتوں کی عزت سے بڑا سبب بنی کہ موضوع حقوقِ خواتین پر توجہ دی جائے۔ تاریخ البیروت مالٹ میں ہے:

ایک مدت تک حکومت نے مزدوروں کے حالات اور کارکنوں کے مسائل

۱۔ بین الاقوامی مشور حقوق انسانی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو منظور کیا۔

پردھیاں نہیں دیا سرمایہ دار جو چاہتے تھے وہ کرتے رہے کارخانہ
داغ و رتوں اور کم سن بچوں کو بڑی تھوڑی تھوڑی مزدوریوں پر رکھ لیتے
تھے، کام کا وقت زیادہ ہونے سے اکثر لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا
ہو جاتے اور جوانی میں مر جاتے تھے

یورپ میں، انسانی حقوق کی تحریک کا یہ مختصر تاریخی جائزہ تھا، انسانی حقوق کے
تمام منشوروں میں جو مطالب ہیں وہ اہل یورپ کے لیے نئے ہیں لیکن ہمیں علم ہے کہ اسلام
میں چودہ صدی پہلے یہ بتایا جا چکا تھا، اور کچھ عرب اور ایرانی دانش وران اعلیٰ میوں
کے تقابلی مطالعے میں یہ بات کر چکے ہیں اور کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ ہاں، اعلیٰ میے اور
اسلام کے ضوابط میں کہیں کہیں اختلاف ہیں، اور یہ بحث بڑی خوش گوار و دل کش ہے۔
ان مسائل میں ایک مسئلہ ”حقوق زن و مرد“ کا مسئلہ ہے۔ اسلام مساوات کا قائل ہے
اور مشابہت و یکسانیت اور اکائی کو ”حقوق زن و مرد“ میں تسلیم نہیں کرتا۔
انسان کی حیثیت | چونکہ افراد خاندان بشری کے تمام افراد کی ذاتی حیثیت کی
پہچان اور ان کے ناقابل تبدیل (واثقالی) دیکھاں حقوق،
اور حقوق : آزادی و عدالت اور صلح کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔

چونکہ پہچان نہ ہونے اور حقوق بشری کے حقوق کی تحقیر و مشیہ نہ عمل پر تمام ہوتی
ہے، جو روح بشریت کو کشری پر ابھارتی ہے۔ اور اسی دنیا کا وجود جس میں تمام افراد
بشر اپنے عقیدے کے انہما میں آزاد ہوں، خوف اور غربت سے مطمئن ہوں انسانی زندگی
کی بلند ترین دنیا کا اعلان کیا جاتا ہے۔

چونکہ، اساسی طور پر حقوق انسانی کو، نفاذ قانون کے ذریعے حمایت کی جاتی ہے۔

تاکہ انسان ظلم اور دباؤ کے خلاف آخری علاج کے لیے اٹھنے پر مجبور نہ ہو۔

چونکہ اس کی طور لازم سے قوموں میں باہمی دوستانہ تعلقات کو پھیلایا جائے (امثال اس بات کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی بنیادی حقوق اور فرد انسان کی قدر و منزلت اور عورت و مرد کے حقوق کی برابر کی کا پھر سے اعلان کیا ہے اور تختہ ارادہ کیا ہے کہ اجتماعی ترقی میں مدد کریں گے اور اچھے ماحول میں زندگی کی شکل صورت بہتر بنائیں گے۔
چونکہ.....

عام اجلاس اس اعلامیہ جہاں حقوق بشر کو تمام عوام اور تمام اقوام کی مشترک مناسبت کے طور پر اعلان کرتا ہے تاکہ تمام افراد اور معاشرے کے تمام ارکان اس اعلامیہ کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھیں اور پوری کوشش کریں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کے احترام کا دائرہ وسیع ہو اور قومی، بین الاقوامی اور عالمی تدریجی کوششوں سے ان اقدار کی پہچان اور ان کا واقعی اور زندہ نفاذ، خود ممبر قوموں اور ان کے ممالک میں رہنے والے عوام میں۔ وجود پذیر ہو۔“

مندرجہ بالا سنہری فقرے انسانی حقوق کے بین الاقوامی (پوری دنیا کے لیے) اعلامیہ کے مقدمے میں درج ہیں، یہ وہی اعلامیہ ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ:
”سب سے بڑی کامیابی ہے جو آج کی تاریخ تک انسانی حقوق کی تائید میں عالم بشریت کو نصیب ہوئی ہے۔“

اس کا ہر جملہ سوچا سمجھا ہے۔ جیسا کہ سابقہ مقالے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ جملے صدیوں کے فلاسفہ اور آزادی طلب اور قانون دانانِ عالم کے افکار کی نمایندگی کرتے ہیں۔

منشور حقوق انسانی کے اہم نکات: منشور، تیس دفعات میں مرتب ہے اس سے قطع نظر کہ بعض دفعات

کچھ مطالب مکرر یا کم از کم بعض دفعات میں بیان شدہ مطالب دوسری جگہ کے بیان کردہ مطالب سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ یہ کچھ مطالب ایسے بھی ہیں جن کو الگ پیرا گراف میں ہونا چاہیے تھا۔

اس مقدمے کے چند اہم نکات ایسے ہیں جن پر توجہ کرنا ضروری ہے :

① حیثیت، احترام اور ناقابل انتقال ذاتی حقوق میں انسان ایک ہی نوع سے بہرہ مند ہے۔

② انسان کی حیثیت، احترام اور ذاتی حقوق، کلی اور عمومی ہیں جو تمام انسانی افراد کو آغوش میں لیتے ہیں۔ ان میں لفرقی نہیں ہے۔ سفید و سیاہ، بلند اور پستہ قد، زن و مرد سب ان میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ جیسے خاندان کے تمام ممبروں میں سے کسی ایک کو اپنے نسب میں دوسروں پر فوقیت اور اعزاز و نجابت جتانے کا حق نہیں، اسی طرح تمام افراد بشر ایک بڑے خاندان کے ممبر اور ایک جسم کے اجزاء ہیں، شرافت و عزاز میں برابر ہیں۔ کوئی شخص اپنے نہیں دوسرے فرد سے زیادہ معزز سمجھنے کا حق نہیں رکھتا۔

③ آزادی و صلح و عدالت کی اساس یہ ہے کہ تمام افراد دل کی گہرائیوں سے تمام انسانوں کی حیثیت اور ذاتی احترام کی واقعیت پر ایمان رکھیں اور اعتراف کریں۔ یہ اعلامیہ مکتبہ چاہتا ہے :

تمام افراد بشر جو ایک دوسرے کے خلاف بے چنیاں پھیلاتے ہیں۔ ان کا حشر چہ دریافت کر لیا گیا ہے۔ لڑائیوں کا پھیلنا، ظلم اور دست درازیوں کا ہونا، اور ایک دوسرے کے غائب و مشیائہ کارگزاریوں کا مرکزی نقطہ انسان کے ذاتی احترام اور اس کی حیثیت سے ناآشنائی ہے۔ چند افراد کی یہ ناآشنائی (ذات واقفیت) اپنے حریف کو تشدد اور نا فرمانی پر ابھارتی ہے اسی سبب صلح و امن کی راہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

④۔ سب کو مل کر جس بلند ترین آرزو کے حصول کی جدوجہد کرنا چاہیے، وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہے جس میں عقیدہ و امن اور مادی خوش حالی مکمل طور پر موجود ہو گمٹیں، خوف اور افلاس کی جڑیں اکھڑی ہوئی ہوں، اس تنا کو رو بہ راہ لانے کے لیے علم کے جس درجات مرتبہ کے گئے ہیں۔

⑤ انسان کی ذاتی حیثیت پر یقین اور ناقابل سلب و انتقال حقوق کا احترام تعلیم و تربیت کے ذریعے تمام انسانوں میں پیدا کیا جائے۔

مقام و احترام انسان : حقوق انسانی کا منشور، چونکہ احترام انسانیت و آزادی و مساوات کی بنیاد پر مرتب اور انسانی حقوق کا

حیا کی خاطر وجود پذیر ہوا ہے، اس لیے ہر صاحب وجدان (واحساس) انسان کے لیے احترام و عزت کے لائق ہے۔ ہم مشرق کے باشندے مدتوں سے انسان کی قدر و احترام کا دم بھر رہے ہیں جیسا کہ سابقہ مقالے میں کہہ چکا ہوں، دین مقدس اسلام میں انسان، حقوق انسان، آزادی اور باہمی برابری کی بڑی قیمت اور احترام ہے۔ اس منشور کے لکھنے والے اور وہ فلسفی حضرات جو حقیقی طور پر اس فکر کے خالق اور لکھنے والے بن گئے

والے ہیں۔ ہمارے احترام و تعظیم کے لائق ہیں لیکن چونکہ یہ تین ایک فلسفیانہ اعلان ہے، فرشتے نہیں، انسانوں کے ہاتھوں سے لکھا گیا ہے۔ انسانی افراد نے استنباط حاصل نہ کر سکیں، کیا ہے، لہذا ہر فلسفی کو متفق ہے وہ اس کا تجزیہ و تحلیل کرے اور اگر اتفاقاً کہیں کمزوری نظر آئے تو اس کی یاد دہانی کرائے۔

یہ اعلامیہ / منشور کمزور مقامات سے خالی نہیں، مگر ہم اس مقالے میں کمزور نکات کے بجائے نقطہ قوت پر انگلی رکھیں گے۔

اس منشور کا سارا زور انسان کے ذاتی مقام پر ہے، شرافت اور انسان کی

انسانی حیثیت اس اعلامیہ کے نقطہ نظر سے انسان ایک نوع ہونے کے ناطے، خصوصی کرامت و شرافت اور حقوق اور آزادیوں کے ایک سلسلے کا براہ راست مالک ہے جبکہ دوسرے جاندار اس ذاتی حیثیت و شرافت و کرامت نہ رکھنے کی وجہ سے ان حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ اس اعلامیہ کا نقطہ مقصد قوت یہی ہے۔

مغربی فلسفوں میں انسان کا منزل اور گراؤٹ

اب یہاں پھر ایک مرحلہ آگیا ہے کہ ہم دوبارہ اسی پرانے فلسفی مسئلے پر توجہ مبذول کریں :

انسانی قدر و قیمت کی دریافت، پوری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کی شرافت و مقام، انسان کی قابل احترام شخصیت، آئیے پوچھیں :

انسان کی وہ ذاتی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ ان حقوق کا مالک بن گیا اور گھوڑے، گائے اور بکری اور کبوتر سے ممتاز ہو گیا ؟

یہاں، منشور حقوق انسانی اور مغربی فلسفے میں انسانی قیمت کی دریافت کے درمیان اسامی تناقض (ایک دوسرے کی مخالفت) کھل کر سامنے آتی ہے۔ مغربی فلسفے میں برسوں سے انسان اپنی قیمت و اعتبار کھو چکا ہے، گزشتہ باتو میں انسان، اور اس کے مرتبہ بلند کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کی جڑیں سر زمین مشرق میں تھیں۔ آج یہ باتیں مغرب کے اکثر فلسفہ نظاموں میں مذاق اور توہین کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں۔

کے۔ یورپین کی نظر میں انسان، مشین کی حد تک پستی میں آگیا ہے۔ اس کی روئے اور حالت مقام انکار میں واقع ہو چکی ہے۔ کسی غلبہ غالی، مقصد خلیق اور جمیعت کے عین مقصود کا عقیدہ رجعت پسندی سمجھا جاتا ہے۔

مغرب میں انسان کے اشرف المخلوقات کے نام کا دم نہیں بھر سکتے کیونکہ یورپ

کے عقیدے میں، انسان کا اشرف مخلوقات ہونا، تمام مخلوقات کا انسان کا طفلی ہونا، ساری دنیا کا مسخر انسان ہونا، بطلیموس کے اس پرانے فلسفے کی بات ہے جو غلط ہو چکا، زمین و آسمان کی ہیئت، آسمان کی مرکزیت اور آسمانی کروں کا زمین کے گرد گھومنا سب باطل ہو چکا تو اب انسان کے اشرف مخلوقات ہونے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ یورپ کی نظریں یہ انسان کی خود پسندی تھی جو اس دور میں انسان کے دماغ میں سما کی ہوئی تھی۔ آج کا انسان عاجزی اور انکساری اختیار کر چکا ہے، دوسرے موجودات کی طرح وہ اپنے وجود کو ایک مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں جانتا۔ خاک سے نکلا، خاک میں مل کر ختم ہو جائے گا۔

یورپ کا انسان "عاجزاتہ" طور پر، روح کو وجود انسانی کا مستقل پہلو نہیں مانتا۔ وہ اپنے وجود اور گھاس بھوس اور حیوان میں اس تہمت سے فرق کا قائل نہیں ہے۔ یورپ کا انسان، فکر و عمل، روح اور پتھر کے کوئلے کی گرمی میں ماہیت و جوہر اعتبار سے فرق نہیں کرتا، وہ سب کچھ مادے اور انزجی کا کرشمہ جانتا ہے۔ یورپ کا انسان کی رائے میں، زندگی کا میدان تمام جاندار مخلوق کے لیے جن میں وہ خود بھی ہے۔ خونلی میدان ہے، جسے زندگی نے، ختم نہ ہونے والی جنگ سے وجود بخشا ہے۔ تمام جان رکھنے والی مخلوق پر ایک اصل دھکیہ، حکمراں ہے اور وہ اصل تنازع للبقا ہے۔ انسان مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ اس جنگ سے خود کو بچائے، عدالت، نیکی، تعاون، اور خیر خواہی جیسے بہت کچھ اخلاقی اور انسانی مفہوم اسی "بنیادی اصل" تنازع للبقا کے پیدا کردہ ہیں۔ انسان نے ان مفاہیم کو اپنی جگہ بچانے کے لیے خود وضع کیا ہے۔

کچھ طاقت ور مغربی فلسفیوں کی رائے میں انسان شینسی ہے جسے صرف اقتصادی منافع چلاتے ہیں، دین و اخلاق، فلسفہ و ادبیات و نہر سب کچھ اوپر کی لیا پوتی ہے۔ اس کے نیچے بدوار، تقسیم، دولت کا صیر پھیر ہے۔ یہ تمام جلوے اور

زندگی کے مظاہرے، انسانی زندگی کے اقتصادی پہلو ہیں۔

نہیں جناب، انسان کے لیے یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اصل محرک اور تمام حرکات اور عمل کی گردش کا بنیادی عامل تو جنسی خواہش ہے۔ خلاق و فلسفہ، علم و دین و ہنر سب لطیف بنیاں اور مظاہرے ہیں، انسان کے وجود کا عامل تو جنسی احساس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر طے ہے کہ مخلوقات کو بے مقصد مانیں، اور طبیعت اندھوں کی طرح عمل کر رہی ہے، یہی عقیدہ بنالیں۔

اگر انواع و اقسام کی مخلوق کی زندگی کی ضمانت کا قانون صرف "نازع بقا" ہے، بہتر سے بہتر کا انتخاب ہے۔ باقی سب تبدیلیاں مکمل طور پر اتفاقی ہیں، انسان کی بقا اور موجودیت اتفاقی و بے مقصد تبدیلیوں کے سبب ہے، کئی ملین برسوں سے اس کے اجداد نے دوسری انواع مخلوق پر تیرموں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور اب تک وہ سلسلہ موجودہ صورت میں چل رہا ہے۔ یہی فلسفہ صحیح ہے؟

اگر یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان ان مشینوں کا نمونہ ہے جو اب وہ خود اپنے ہتھوں بنا رہا ہے۔

گرتا ہی مان لیا گیا ہے کہ روح کا یقین، اصالت اور اس کی بقا کا عقیدہ خود خواہی و خود پسندی اور اپنے بارے میں غیر معمولی مبالغہ ہے۔

سائنس کے فلسفہ جنسیت کو صرف اشارہ ہے، فرائڈ آرٹ کی سب سے زیادہ متنی بچے کے دودھ پینے سے پہلے سے بڑھاپے تک وہ ہر مرحلے میں جنسیت ہی محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے صنفی حیات و تاسخ جدید مفکروں کے مسلمات اور یورپ کی فکری نظام کی موجودہ حد بندی کرتے دلتے ہیں۔

اگر ثابت ہو چکا ہے کہ۔ انسان میں اصلی محرک اقتصادی یا جنسی یا بالادستی کا جذبہ ہے۔

اگر بنیادی بات یہی ہے کہ نیک و بد، اچھائی اور برائی مجموعی طور پر اضافی ہیں اور فطرت و وجدان کی آواز مہل خیال ہے۔

اگر انسان جنس کے لحاظ سے نہوت اور خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے اور قوت کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔
اگر۔۔۔۔

اس کے بعد، انسان کی حیثیت اور شرافت اور ناقابلِ سلب حقوق۔ اور انسان کی قابلِ احترام شخصیت کا دم بھرنے اور اس کو تمام اقدامات کا نصب العین و مقصد بنانا کیسے ممکن ہے!

مغرب انسان کے بارے میں مغربی فلسفے سے جہاں تک ہو سکتا تھا اس نے انسان کی ذاتی حیثیت کو نقصان پہنچایا اور انسانیت کا مقام تحت الثریٰ تک پست کیا۔ ایک طرف تو مغرب کا فلسفہ، تخلیقِ انسان اور اس کے وجود کی علتِ غرض کے زاویے سے۔ اس کی تخلیق میں کارخانہِ تخلیق کے عمل کے زاویے سے۔ اس کے ڈھانچے اور اس کے وجود کے تانے بانے اور ہستی کے زاویے سے۔ اس کے محرکاتِ عمل کے نقطہ نظر سے۔ اس کے وجدان و ضمیر کے لحاظ اس حد تک نیچے گرا یا جہاں کچھ تذکرہ ہم نے کیا۔

اس کے بعد ایک قدامتِ اعلان شائع کیا جس میں انسان کی قیمت اس کا مقام حیثیت اور کرامت و ذاتی شرافت اور مقدس حقوق، ناقابلِ تبدیلی اور ناقابلِ سلب اختیارات کا ڈھول بجایا گیا۔ اس فرمان میں تمام افرادِ بشر کو دعوت دی گئی کہ اس منشور پر ایمان

نہایت

مغرب پر فرض تھا، پہلے وہ انسان کی جو تشریح کر چکا ہے اس پر نظر ثانی کرے
اس کے بعد بلند بالا اعلامیہ حقوق مقدس فطری انسان صادر کرے۔
میں یہ مانتا ہوں، سب مغربی فلسفی انسان کی وہی تشریح نہیں کرتے جس کا میں نے
تذکرہ کیا ہے۔ بہت سے حضرات، کم و بیش انسان کی وہ تعبیر بھی کرتے ہیں جو مشرق
وے کرتے ہیں۔ مگر میری نظر اس انداز فکر پر ہے جس نے مغرب کی اکثریت کو متاثر کیا
ہے۔ وہ سب دنیا بھر کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔

انسانی حقوق کا منشور اسے صادر کرنا چاہیے جو انسان کو ایک مادی مرکبات
تیار شدہ شے سے بلند تر درجے پر فائز جانتا ہو۔ جو انسان کے محرکات اور ارادوں
کو حیوانی و شقی جہانات کا مجموعہ نہ مانتا ہو۔ جو انسان کے لیے انسانی وجدان کا
قائل ہو۔ اعلامیہ بشر مشرق کو صادر کرنا چاہیے جو قانون - "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ
خَلِيفَةً لِّكَ" میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں - پر ایمان رکھتا ہو۔ اور انسان میں خدائی
ہموے ڈھونڈھتا ہو۔

حقوق انسانی کا نعرہ لگانا چاہیے جو انسان کے سیر و سفر کے لیے ایک منزل کا
قائل ہو اور یہ مانتا ہو کہ انسان اس منزل کے لیے راستے کی مشقیں جھیلتا ہے؛
يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ اذْكُرْ كَادُخَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمِلَاقِيهِ ۝
اے انسان! تو اپنے رب کی حضوری کے لیے کوشش کر رہا ہے تو ایک نہ
بیکسو ان کے سامنے حاضر ہو گا۔

انسانی حقوق کا منشور شایع کرنے کا حق اس نظام فلسفہ کو حاصل ہے جو قانون
و نفس و ماسواہما مجبور ہوا و تقواہما کہ قائل ہو۔ اوسم ہے جان کی اور جس

اسے ہموار بنایا، پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اسے سمجھائی۔ (قرآن) جو انسان میں بھلائی کے رجحانات مانتا ہو۔

انسانی حقوق کا منشور جاری کرنے کا اسے حق ہے، جو انسانی سرشت کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو، اور اس کی سرشت کو موقد ترین و کامل ترین سمجھتا ہو کہ۔ ”لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم“ یہی مطالبہ کرتا ہے۔ یعنی۔ ہم نے انسان کو بہترین انداز سے پر بنایا ہے۔

مغربی طرز فکر کے نمایاں شان بات منشور حقوق انسانی نہیں ہے کہ وہ انسان کی یہ شرح کرتے ہی نہیں۔ ان کو تو وہی طریقے جاری کرنا چاہیے جسے مغرب علیٰ طور پر انسان کے لیے جائز سمجھتا ہے۔ یعنی انسانی احساسات کا قتل عام، سرمایہ داری کی بے پناہ قوت، انسان پر دولت کی برتری، مشین کو معبود سمجھنا ثروت کی خدائی انسان سے بیگناہ۔ حالت یہ ہے کہ اگر اتفاقاً ایک میلو نرا پنی کروڑوں کی جائداد اپنے بعد اپنے کتے کے نام لکھ جائے تو اس کتے کا اعزاز آدمی زاد سے بڑھ جاتا ہے، دولت مند کتے کے سب سے معلوم کتے آدمی پیشکار و نوکر کی طرح حاضر رہتے ہیں۔ منشی، سپرنٹنڈنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں اور دست بستہ لوگ اس کے سامنے حاضر رہتے اور تعظیم کرتے ہیں۔

مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی | انسانی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان نے بتعبیر قرآن

”خود“ کو بھی بھلا دیا ہے اور خدا کو بھی، بری بات یہ ہے کہ ”خود“ کی توہین کی ہے ”دروغ“ ”بہی“ اور ”ضمیر و باطن“ سے توجہ ہٹالی، مسمیٰ اور مادی دنیا میں اپنی نظر کو محدود

دیا، مادیات کا مزہ چکھنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ دیکھتا ہے نہ سوچتا ہے، خلقت کو بے مقصد سمجھتا ہے، خود اپنا انکار کرتا ہے، اپنی روح ماتھے سے دے بیٹھتا ہے۔ آج کے انسان کی اکثر بد نصیبیوں کا سرچشمہ ہی اندازِ فکر ہے۔ افسوس کہ یہ سوچ دینا چھائی ماری ہے۔ انسان کے بارے میں اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدن جس قدر پھیلتا اور عظیم تر ہو جاتا ہے تمدن اسی قدر حقارت میں گرتا جا رہا ہے۔ انسان کے بارے میں یہ سترِ فکر موجب ہوا کہ واقعی انسان ہمیشہ ماضی میں تلاش کیا جائے اور آج کے تمدن بڑے کا خانے کی دست رس میں ہے کہ ہر اعلیٰ درجے کی چیز تیار کر دے، بس انسان نہیں بنا سکتی۔

گناہ بھی کہتے ہیں :

یورپ والے زمین کی خدائی کا لقب حاصل کرنے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زمین کی تمام نعمتیں اور ان کے امکانات قبضے میں کر لیے اور ان کے مالک بن بیٹھے، دوسری قومیں اسے خدا کی قدرت سمجھ بیٹھیں، لیکن اہل یورپ ایک چیز سے عاجز رہے، اور وہ اپنے اندر تامل کرنا ہے، جو گئے گئے تمدن کی جھلک چمک کو مہمل سمجھنے کے لیے انہی ہی دلیل کافی ہے۔

مغربی تمدن نے اہل مغرب کو شراب نوشی اور جنسی عمل پر کسبِ بے تواس کا سبب "خود تماشائی" کو بھلانا اور ضائع کرنا ہے۔ ... اس کی عملِ قوت نے اسے انکشاف، ایجاد اور وسائلِ جنگی کی کھینچ پھینچ یہ ابھارا کہ وہ "اپنے آپ" سے فراری ہے، اسے غیر معمولی قوت اور تسلط اپنے اوپر باقی نہیں رہا۔ ... تنہائی اور خاموشی سے خوف، دولت سے وابستگی نے مغربی انسان کو اندر کی مدد سے سے معذور بنا دیا، اس کی مسلسل عمل و کارکردگی کا ایک محرک یہی ہے۔

دنیا فتح کرنے کی ہوس کا باعث ہے ”اپنے اوپر حکومت“ نہ کر سکنے کی ناتوانی ہے۔ اسی بنا پر مغرب کا انسان پوری دنیا میں بحران و فساد پھیلا رہا ہے..... آدمی جب اپنی روح کھودے تو عالم کی فتح اس کے کس مرض کی دوا ہوگی..... جن لوگوں کو انجیل نے تعلیم دی کہ وہ حقیقت، محبت اور صلح کے مبشر بنیں وہ لوگ سونے اور غلاموں کی جستجو میں سرگردان ہیں۔ خداوند کی بادشاہی میں انجیل کی تعلیم کے مطابق بخشش و عطا کی جستجو کرنے کے بجائے اپنے گناہوں اور اپنی برائیوں سے صفائی کے لیے مذہب کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ کلام الہی شایع کرنے کے بجائے قوموں کے سروں پر بزم برساتے ہیں.....“

اسی سبب انسانی حقوق کا منشور دوسروں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر خود اہل یورپ نے ٹھکرایا، جو فلسفہ اہل مغرب نے عملی زندگی میں اپنا رکھا ہے اس کے بعد خود اہل مغرب کے لیے سوائے منشور حقوق انسانی، غلط قرار دینے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

چھٹا حصہ

عالمی حقوق کی فطری بنیادیں

- کتابِ حققت انسان کے اصلی حقوق پہچنانے کی تنہا سند کی کتاب حوالہ ہے۔
- ”مدنی“ معاشرے میں باہمی قرار داد کا پہلو اور عالمی معاشرے میں فطری پہلو کا غلبہ ہوتا ہے۔
- عالمی حقوق میں چار زماںوں کا مفروضہ، سوشلزم کے مفروضہ مالکیت کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔
- کیا میاں بیوی دو حقوقی فطرتیں رکھتے ہیں؟

(علامہ مطالب از مؤلف)

عالمی حقوق کی فطری بنیادیں

①

انسانی حقوق کا منشور اس بنیاد اور روح پر قائم ہے کہ انسان ایک نوع کی حیثیت اور ذاتی شخصیت کی بنا پر قابلِ احترام ہے۔ اور عین خلقت و آفرینش میں حقوق اور آزادیوں کا ایک سلسلہ اسے عطا کیا گیا ہے جنہیں اس سے نہ چھینا جاسکتا ہے نہ بدلا جاسکتا ہے۔ ہم اس پر گفتگو کر چکے۔

یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس روح و اساس کو اسلام کی تائید حاصل ہے، اور مشرقی فلسفے بھی اس کے حق میں ہیں۔ اس منشور کی روح و اساس سے جو بات جوڑ نہیں کھاتی اور اسے بے بنیاد ظاہر کرتی ہے، وہ مغربی فلسفوں کی وہ بہت سی تشریحات ہیں جو انسان اور اس کی ہستی کے تانے بانے کے بارے میں کی جاتی ہیں۔

یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ انسانی حقوق پہچاننے کے لیے فقط ایک کتاب ایسی ہے جو حوالہ سننے کی پوری گنجائش رکھتی ہے، اور وہ ہے آفرینش کی بیش بہا کتاب، اس عظیم کتاب کے صفحے صفحے اور سطر سطر میں انسانوں کے اصلی حقوق مندرج اور زن و مرد کے ایک دوسرے کے مقابلے میں حقوق کے حذو و حال پہچانے جاسکتے ہیں۔

تعب ہے۔ بعض سادہ دل، کسی طرح تیار نہیں کہ اس عظیم کتابِ حوالہ کو سندی درجہ دیں۔ ان لوگوں کے نزدیک حوالے کی تنہا صلاحیت و سندیت ان لوگوں کو حاصل ہے جنہوں نے ”منشور“ کی تیاری میں حصہ لیا اور آج سارے جہاں

کی قیادت و حکومت کے مدئی ہیں۔ چاہے، وہ خود اس اعلائیے کے دفعات کی پابندی نہ کریں۔ دوسروں کو بہر حال یہ حق نہیں ہے کہ ان کی بات میں چون و چرا کریں۔ لیکن ہم انہیں ”مقوق انسانی“ کے حوالے سے چون و چرا کا حق رکھتے ہیں اور تخلیق کے عظیم کائنات کو اللہ کی بولتی کتاب جانتے اور اسی کو اکیلا ندی حوالہ ملتے ہیں۔

محترم قارئین!

مقدرت خواہ ہوں، مقالات کے سلسلے میں کچھ مسائل ایسے آگئے جن میں فلسفہ کا رنگ اور ذرا خشکی محسوس ہوتی ہوگی، ممکن ہے بعض حضرات اس سے تھکن بھی محسوس کرتے ہوں، میں حتی الامکان ایسے مسائل سے پہلو بچاتا ہوں لیکن مسائل حقوقِ خلائق کے ذیل میں کچھ فلسفیانہ بحثوں کا آنا ضروری اور ان سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

طبعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں ربط

ہمارے نزدیک طبعی و فطری حقوق وہاں سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں، قوتِ تخلیق نے اپنی روشن نگاہی اور مقصدیت کے پیش نظر موجودات کو ان کمالات کی طرف رواں کیا ہے جن کی صلاحیت ان کے وجود میں ودیعت فرمائی ہے۔

ہر فطری صلاحیت ایک ”طبعی حق“ کی بنیاد ہے اور اسے ایک ”طبعی سند“ حاصل ہے۔ مثلاً انسان کا بچہ، پڑھنے اور اسکول جانے کا حق رکھتا ہے، بکری کے بچے کو دودھ حاصل نہیں، کیوں؟

انسان کے فرزند میں سبق پڑھنے اور دانشور بننے کی صلاحیت ہے اور بکری کے فرزند ہے۔ لیکن بکری کے بچے میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔

قوتِ تخلیق نے وجود انسان میں اس مطالبے کی دستاویز رکھی ہے اور وجود انسان میں دستاویز نہیں رکھی۔

سوچنے، دوش دینے، آزاد ارادہ رکھنے کا حق بھی اسی طرح ہے۔
کچھ لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ ”فطری حقوق“ کا مفروضہ اور یہ کہ خلقت و پیدائش نے
انسان کو ایک قسم کے حقوق سے خصوصیت دی ہے۔ گھٹیا دعویٰ اور خود پسندی کی بات
ہے۔ اس مفروضہ کو دور کر دینا چاہیے۔ انسان وغیرہ انسان میں حقوق کے لحاظ سے کوئی
فرق نہیں ہے۔

نہیں، بات یوں ہی نہیں۔ فطری صلاحیتوں میں اختلاف ہے۔ قوۃ خلاقہ و خالق
اکبر، نے انواع و موجودات میں ہر قسم کو ایک دائرہ حرکت دیا ہے اس کو اسی قسم کی
سعادت عطا کی ہے وہ موجود اپنے مدار میں حرکت کرتا ہے۔ قوت تخلیق نے بھی
ایک غرض معین کی ہے۔ یہ دستاویزی اتفاق اور بے خبری کے عالم میں ان موجودات
کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں۔

تمام افراد انسانی خاندانی (عائلی) حقوق کے علاوہ
اجتماعی (معاشرتی) حقوق کے مالک ہیں انسان

معاشرتی حقوق

خاندان کے دائرے سے نکل کر ایک بڑے معاشرے میں، ایک دوسرے کے مقابلے میں
کچھ حقوق پیدا کرتے ہیں۔ یہ حقوق مساوات کی بنیاد اور مشابہ صورت حال کی وجہ
سے مساوی حقوق بھی رکھتے ہیں اور مشابہ حقوق بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان کے ابتدائی
فطری حقوق ایک دوسرے کے برابر اور ایک دوسرے کے مانند ہیں؛ سب کو ایک
جیسا حق ہے کہ کائنات کے انعامات سے فائدہ اٹھائیں۔ سب کو مماثل حق حاصل
ہے، کام کریں۔ سب کو مماثل حق ہے زندگی کے میدان میں ہونے والی دوڑ میں شریک
کریں اور آگے بڑھیں سب کو برابر کا حق ہے کہ سماجی منصبوں میں سے جس منصب کے لیے
چاہیں اپنا نام پیش کریں، پھر اسے حاصل کرنے کے واسطے جائز طریقے استعمال کریں۔
سب کو برابر کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو ظاہر کریں۔

ہاں، یہی ابتدائی فطری حقوق کی مساوات آہستہ آہستہ کتابی اور عملی
 نوعیت میں غیر مساوی حقوق کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یعنی سب کو برابر کا حق ہے
 ہم کہیں زندگی کی دوڑ میں مقابلہ کریں، مگر جیسے ہی اس مقابلے میں ذمے داری ادا کرنے
 اور مقابلے میں حصہ لینے کا مرحلہ آتا ہے، پھر مقابلے میں سب دریلے ایک طرح نہیں نکلتے
 کچھ لوگوں کی صلاحیتیں زیادہ ہیں کچھ کی کم ہیں۔ بعض زیادہ کام کرنے والے ہیں، کچھ کم
 بعض زیادہ علم رکھنے والے ہیں، زیادہ باکمال ہیں، بڑے ہنرمند ہیں، زیادہ کارآمد ہیں
 زیادہ لائق ہیں۔ تہری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے حاصل کردہ حقوق غیر مساوی ہوں گے اور
 کریم ان کے حاصل کردہ حقوق کو ابتدائی فطری حقوق کی طرح مساوی حقوق کی صنف میں
 گن کر دیں تو ہمارے عمل ظلم و ستم کے علاوہ کچھ نہ ہوگا!

کیا معاشرتی اور ابتدائی فطری حقوق کے لحاظ سے تمام افراد کی حیثیت مساوی
 و مشابہ ہے؟

انسانی حالات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ افراد بشر میں کوئی بھی حاکم یا محکوم، افسر
 یا ماتحت، سپاہی یا وزیر نہیں پیدا ہوا، یہ خصوصیات کتابی حقوق ہیں اور افراد کو
 قابلیت و صلاحیت و کارکردگی کے ذریعے معاشرے سے اپنا یہ حق لینا چاہیے۔
 معاشرہ بھی ایک طے شدہ قرارداد کے ذریعے یہ حق دیتا ہے۔

انسان اور حیوان کی معاشرتی زندگی میں یہی فرق ہے جیسے شہد کی مکھی، اس
 طرح کے حیوانات کی زندگی کا ڈھانچہ فی صد فطری ہے ان کے منصب اور ان کے کلم
 فطرت سے تقسیم کر دیے ہیں خود انھیں کوئی اختیار نہیں۔ فطری طور پر ان میں کوئی
 حاکم سے کوئی محکوم، کوئی کاریگر ہے کوئی انجینئر، کوئی پہرے دار پیدا ہوا ہے۔ انسانی
 معاشرہ اس طرح کا نہیں ہے۔

سچی وجہ سے بعض دانشوروں نے، قدیم فلاسفہ کے نظریے کو رد کر دیا ہے کہ

”انسان فطرتاً معاشرتی مخلوق ہے۔“ یہ دانش ور کہتے ہیں کہ نہیں، انسانی معاشرہ سو
طے شدہ اصولوں کا پابند ہے۔

عالمی حقوق: یہ غیر خاندانی و عائلی (گھریلو) معاشرے کی بات تھی۔ گھریلو معاشرہ
کیسے؟ کیا افراد، گھریلو معاشرے میں ابتدائی فطری حقوق میں
مشابہت و یکسانیت رکھتے ہیں اور انسانی حقوق میں فرق ہے؟ یا، گھریلو معاشرہ یعنی
وہ معاشرہ جس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور بہن بھائی ہوں۔ غیر خاندانی
معاشرے ابتدائی حقوق میں فرق رکھتا ہے اور فطرت کے قانون نے خاندانی
حقوق کو خاص شکل و صورت میں وضع کیا ہے۔

یہاں دو مفروضے موجود ہیں:

پہلا مفروضہ: میاں بیوی، باپ بیٹا، ماں اور اولاد ہونا دوسرے معاشرتی
اور اعداد و شمار بھی جیسے تعلقات کی طرح قومی یا سرکاری اداروں میں اس کا سبب نہیں کہ
چند افراد فطری طور پر خاص صورت و حالت حاصل کریں مثلاً ایک افسر بن جائے دوسرا
ماتحت، ایک حکمران ہو دوسرا محکوم، ایک زیادہ خواہ لے دوسرا کم۔ بیوی یا شوہر
باپ یا ماں اور اولاد ہونا بھی اس کا سبب نہیں کہ اس بنیاد پر وہ خاص پوزیشن حاصل
کریں۔ فقط کارکردگی کی بنیاد ہی پر ایک شخص کا منصب معین ہو سکتا ہے۔

”عالمی حقوق میں عورت مرد کے حقوق کی مشابہت“ کا مفروضہ۔ جسے غلطی سے
”ساوی حقوق“ کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی فرض کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس مفروضہ کا
مطلب یہ ہے کہ زن و مرد (میاں بیوی) کی صلاحیتیں اور ضرورتیں مشابہ ہیں اور مشابہ
حقوق کی دستاویزیں فطرت کی طرف سے انھیں مل چکی ہیں اور یوں، خاندانی زندگی
میں وہ شریک ہیں لہذا عالمی حقوق، یکسانیت، مماثلت اور مشابہت کی بنیاد پر مرتب
ہوں۔

دوسرا مفروضہ : نہیں ، ان کے ابتدائی طبعی فطری حقوق بھی الگ الگ ہیں ۔
 شوہر و بیوی کے حقوق کی بنیاد پر خاص فرائض و حقوق ثابت کرتا ہے اور بیوی ہونا ، بیوی ہونے
 کے بعد اسے خاص ذمہ داریوں اور حقوق ثابت کرتی ہے ۔ اسی طرح باپ یا ماں اور اولاد ہونے
 کے بعد بہت سے ہر حال خاندانی معاشرہ دوسری کچنیوں اور امداد یا بھی کے اداروں سے
 جیسے " عورت و مرد کے عائلی حقوق میں مشابہت نہیں " کا مفروضہ ۔ جسے اسلام
 نے منظور کیا ہے ۔ اسی کلیہ پر مبنی ہے ۔

ان دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے کی
 صورت کیسے ہے ۔ اس کو سمجھنا ہے ۔

عالمی حقوق کی فطری بنیادیں

(۲)

محترم مطالعہ کرنے والے اچھی طرح نتائج دریافت کر سکیں، اس لیے گزشتہ پیرا گراف میں جو حقائق عرض کیے ہیں ان کا خلاصہ دیکھتے چلیں:

۱۔ فطری حقوق اس لیے پیدا ہوئے کہ فطرت کا ایک مقصد ہے، اس مقصد کی خاطر موجودات کے اندر صلاحیتیں اور استحقاق ودیعت ہوئے۔

۲۔ انسان، انسان ہونے کے زاویے سے خاص حقوق اور ان کے سلسلے کا مالک ہے جسے "انسانی حقوق" کا نام دیا گیا ہے۔ حیوانات اس قسم حقوق سے بہرہ ور نہیں ہیں۔

۳۔ فطری حقوق کا تعین اور ان کی پہچان اور کیفیت سمجھنے کے خلقت و تخلیق و پیدائش کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہر فطری صلاحیت ایک فطری حق کے لیے ایک فطری دستاویز ہے۔

۴۔ انسانی افراد تمدنی اور بڑے معاشکے میں فطری حقوق میں مساوی و مشابہ حقوق رکھتے ہیں، البتہ کارکردگی کی بنیاد پر ان میں فرق ہوتا ہے۔ اس کا تعلق کام اور ذمہ داری انجام دینے سے ہے۔ نیز فرائض کی انجام دہی میں متبادل دیکھا جاتا ہے۔

۵۔ چونکہ تمام انسان انفرادی طور پر شہری سماج ہیں، مساوی اور مشابہ فطری حقوق کے مالک ہیں۔ انسانی فطرت کے مطالعے سے ثابت ہو چکا ہے کہ افراد

ان دونوں معاشرت پسند جانداروں کے۔ جیسے شہد کی مکھی۔ برخلاف فطرت کی طرف سے حاکم و محکوم، فرماں روا اور فرماں بردار، مزدور یا کارخانہ دار، جنرل یا سپاہی، کارکن یا مین نہیں آیا۔ کام اور منصب اور ذمہ داریاں فطرت نے تقسیم نہیں کی ہیں۔

۶۔ خاندانی حقوق میں عورت و مرد کے حقوق کی مشابہت کا مفروضہ اس بات پر قائم ہے کہ خاندانی و عائلی معاشرے کا معاملہ، شہری معاشرے کے معاملے سے جلد ہٹ کر زن و مرد، اپنی صلاحیتوں اور ملتی جلتی ضرورتوں کے ساتھ خاندانی زندگی میں شرکت نہیں کرتے۔ دونوں کے پاس فطرت کی طرف سے عطا کردہ ملتی جلتی دستاویزیں نہیں ہیں۔ قانون تخلیق نے انھیں ملتی جلتی شکل صورت میں نہیں قرار دیا، اس نے ہر ایک کے الگ الگ دائرہ کار اور معین وضع پیش نظر رکھی ہے۔

اب دیکھتے ہیں دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور کس انداز سے ان دونوں مفروضوں کو سمجھا جائے؟

اس معیار کی بنا پر جو پہلے مل چکا ہے، دونوں مفروضوں میں سے کون سا مفروضہ صحیح ہے؟ دریافت کرنا زیادہ مشکل بات نہیں۔ عورت و مرد کی فطری صلاحیتوں و ضرورتوں کا مطالعہ کر لیں۔ بالفاظ دیگر، قانون خلقت نے جو فطری دستاویز ہر ایک کو ایک ایک دیئے رکھے ہیں، بات واضح ہو جائے گی۔

خاندانی زندگی فطری ہے
یہ بھی منہا ہمتی زندگی؟
ہم گزشتہ مقالے میں بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے بارے میں دو نظریے ہیں؛

الف۔ انسان کی معاشرتی زندگی طبعی و فطری ہے۔ اصطلاح میں انسان کو مدنی بالطبع کہتے ہیں۔

ب۔ معاشرتی زندگی ایک منہا ہمتی عمل ہے، جسے انسان خود

منتخب کرتا ہے اور اس انتخاب کا سبب اندرونی نہیں بیرونی عوامل کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ ثواب ہوئی اجتماعی زندگی کی، خاندانی زندگی کیا ہے؟ یہاں بھی دو نظریے ہیں؛ نہیں!۔ اس مسئلہ میں ایک نظریے کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں ہے۔ خاندانی زندگی سوئی صیغی اور فطری ہے۔ انسان فطرتاً گھریلو پیدا ہوا ہے۔ بالفرض، شہری زندگی کے بارے میں فطری ہونے نہ ہونے کی بات ہو بھی، اس وقت بھی انسان کی فطرت میں "گھریلو زندگی" کا انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بہت سے جانور جو فطرتاً اجتماعی زندگی تو نہیں رکھتے اس کے باوجود ایک قسم کی "عائلی زندگی" نے جوڑا بن کر رہنے کی زندگی۔ بسر کرتے ہیں جیسے کبوتر اور بعض حشرات جو فطرتاً "غفت" رہتے ہیں۔

خاندانی زندگی کا معاملہ اجتماعی زندگی کے معاملے سے مختلف ہے۔ فطرت میں کچھ ایسا نازک عمل ہوا ہے کہ انسان اور بعض جانور گھریلو زندگی اور خاندانی مرکزیت حاصل کرتے ہیں، انھیں صاحب اولاد ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔

تاریخی قرینے کسی ایسے عہد کی نشان دہی نہیں کرتے جب انسان گھریلو زندگی نہ رکھتا ہو۔ یعنی میان بیوی الگ الگ زندگی بسر کرتے ہوں۔ یا جنسی تعلقات مشترک اور عمومی رہے ہوں۔ آج، دنیا میں وحشی قبیلے موجود ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہیں، انھیں سے ہمیں مائٹی کے وحشی قبیلوں کا سماج سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ماضی میں انسانی زندگی۔ ماں کی بادشاہی۔ یا۔ باپ کی بادشاہی کی صورت ہی میں پائی جاتی ہے۔

چار عہدوں کا مفروضہ : ملکیت کے مسئلے میں یہ سنم ہے کہ شروع میں ملکیت مشترک تھی، اور نجی و خصوصی

ملکیت بعد میں وجود پذیر ہوئی۔ لیکن "جنسیت" کے بارے میں یہ بات نہیں ہے۔

ملکیت ابتدا زندگی انسانی میں اس وجہ سے مشترک تھی کہ انسان ایک قبیلہ تھا اور خاندانی صورت رکھتا تھا۔ یعنی قبیلے کے افراد ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ خاندانی احساسات سے بہرہ ور تھے۔ لہذا ملکیت بھی مشترک تھی۔

شروع کے ادوار میں فرض کریں کہ قوانین و رسم و رواج نہ تھے جس کی بنیاد پر عورت مرد دونوں ایک دوسرے کو ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیتے۔ اس دور میں خود ان کی فطرت اور طبعی احساسات ان کو فرائض و حقوق کا پابند کرتے تھے۔ ہرگز ان کی جنسی زندگی بلا شرط و بے پابندی کے نہیں تھی۔ یونہی وہ جانور یونہی زندگی گزارتے ہیں ان کے پاس کوئی اجتماعی یا قرار داری قانون نہیں رکھتے، اس کے باوجود فطری قانون کے مطابق حقوق و فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کی زندگی بے شرط و قید و پابندی نہیں ہے۔

بیگم مہر انجینئر منوچہریاں نے اپنی کتاب ”انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران“ کے مقدمے میں لکھا ہے:

”معاشرتی جائزہ رکھنے والے زاویہ نظر سے زن و مرد کی زندگی زمین کے مختلف خطوں میں چار میں سے ایک راستے سے گذرتی ہے:

- ۱۔ فطری مرحلہ۔
 - ۲۔ مرد کے غلبہ کا دور۔
 - ۳۔ عورت کے احتجاج کا زمانہ۔
 - ۴۔ زن و مرد کے مساوی حقوق کی منزل۔
- پہلے مرحلے میں زن و مرد، بغیر کسی قید و شرط کے باہم جنسی
 تعلق رکھتے تھے....“

معاشرہ شناسی کو یہ دعویٰ منظور نہیں۔ جامعہ شناسی و معاشرہ آگاہی زیادہ

سے زیادہ یہ بات مان سکتی ہے کہ کہیں اور اتفاقاً کچھ وحشی قبائل میں چند بھائیوں نے چند بہنوں سے مشترکہ طور شادیاں کی ہوں۔ اور وہ سب بھائی، ان سب بہنوں سے جنسی عمل کرتے ہوں، بچے بھی سب کے مشترک ہوں یا لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے محدود و مخصوص نہ ہوں لیکن شادی انھیں محدود و مخصوص کر دیتی ہو۔ اور اگر اتفاق در اتفاق بعض وحشی قبائل میں جنسی عمل اس سے بھی زیادہ عام تھا یہاں اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ عورت ”قومی“ ہوتی ہوگی۔ یہ صورت استثنائی ہے، عام دستور اور وضع فطرت سے انحراف۔

ویل ڈیورنٹ نے ”تاریخ تمدن“ جلد اول، صفحہ ۲۷۷ پر لکھا ہے:

”ازواج ہمارے حیوانی اجداد کی ایجاد ہے۔ کچھ پرندوں میں دیکھا گیا ہے کہ دراصل ہر پرندہ ایک جفت پر اکٹھا کرتا ہے۔ گوریلے اور نگوٹان، نر و مادہ کا سلسلہ بچے کی پرورش تک باقی رکھتے ہیں، اور یہ تعلق بڑی حد تک عورت مرد کے تعلق جیسا ہوتا ہے، اور جب مادہ کسی دوسرے نر سے نزدیکی کرتی ہے تو اسے اپنے نر کی بڑی سختی سہنا پڑتی ہے۔“

ڈی گریس پگنی نے بوریو کے اورنگوٹن کے بارے میں لکھا ہے کہ۔
وہ ایسے خاندانوں میں زندگی گزارتے ہیں جو نر و مادہ اور ان کے بچوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ساواٹھ (Dr. SAVAGE) نے گوریلوں کے سلسلے میں کہا ہے:-

ان کی عادت ہے کہ ماں باپ درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل اور میوے کھاتے اور آپس میں کھیلتے ہیں۔ ان کے بچے درختوں پر ماں باپ کے گرد ایک شاخ سے دوسری شاخ پر رتے جاتے ہیں۔

شادی تو ٹھہر انسان سے پہلے تاریخ میں موجود ہے، ایسے سماج جن میں شادی نہ ہو بہت کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی تحقیق کرے تو کچھ سماج ڈھونڈ سکتا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ خاندانی (گھوٹلو) احساس، انسان کا ایک فطری احساس ہے۔ تمدن یا
ت کو پیدا کر دیا نہیں ہے۔ جیسے بہت حیوانات فطری اور شریک کے طور پر خاندانی رہتے
ہوتے ہیں۔

ہذا، انسان پر کوئی دور ایسا نہیں گذر کہ جنس زن اور جنس مرد کئی طور پر، باقید و شرط
و معاہدہ۔ خواہ وہ فطری ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی بسر کرتے ہوں۔ اس طرح کے دور کا مفروضہ
بہت اشتراکی دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ خود اشتراکی طرفداروں نے بھی دولت کی اشتراکیت
کے آغاز میں نہیں کیا تھا۔

زن و مرد کے جنسی تعلقات میں چار ادوار کا مفروضہ، ایک تقلیدی مفروضہ ہے جو
مالکیت کے بارے میں سوسائٹوں کے چار دوروں سے حاصل کیا ہے۔ سوشلسٹ
کہتے ہیں کہ، انسان نے مالکیت کے چار دور گزارے ہیں؛
پہلا دور۔ ابتدائی مشترک ملکیت۔

دوسرا دور۔ فیوڈل ازم (جاگیرداری)

تیسرا دور۔ کپٹلزم (سرمایہ داری)

چوتھا دور۔ سوشلزم اور کمیونزم۔

جو ابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت ہے مگر ذرا اونچی سطح پر۔

خوشی کی بات ہے کہ یکم منوچہریان نے چوتھے دور کا نام "حقوق زن و مرد کی برابری" رکھا،
اور انہوں نے سوشلسٹوں کی تقلید نہیں کی، اور آخری دور کو ابتدائی اشتراکیت
اور سوشلسٹ بازگشت کا نام نہ دیا۔

گرچہ مختصر کے خیال میں بقول ان کے چوتھے دور اور پہلے دور میں "زیادہ مشابہت" ہے
اور اشتراکیت کی ہے؛

جو تھا مرد، پہلے مرحلے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ عورت و مرد کسی بالادستی

اور برتری کے بغیر مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔“

”شہادتِ زیاد“ زیادہ مشابہت۔ کا مطلب میں ابھی نہیں سمجھ سکا۔

اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ۔ بالادستی و برتری مرد کو حاصل نہ ہو، اور ایک دوسرے کے درمیان برابر کے معاوضے اور شرائط ہوں، تو یہ بات تو دلیل بننے کے قابل نہیں ہے، کہ یہ دور، ان دوروں سے مشابہت رکھتا ہو محترمہ کے نزدیک، شرط و قید و پابندی کے ہر بندھن سے آزاد تھے۔ جب مرد و زن گھریلو زندگی ہی نہ رکھتے تھے۔

اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ۔ چوتھے مرحلے میں آہستہ آہستہ تمام بندھن ٹوٹ جائیں گے اور گھریلو زندگی منسوخ ہو جائے گی اور افراد بشر میں ایک قسم کا جنسی اشتراک حکمرانی کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ”حقوق کی برابری“ سے ان کا مطلب اس مطلب و مدعا کے علاوہ ہے جو برابری حقوق کے حامیوں کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ محترمہ مذکورہ بالا مفہوم و مدعا کی بڑی سخت حامی ہیں اور یہ بات ان کے لئے اتفاق سے بڑی وحشت ناک ہوگی۔



اب ہمیں زن و مرد کے گھریلو حقوق کی فطرت کی طرف توجہ کرنا چاہئے اس بارے میں دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ایک سوال یہ کہ۔ زن و مرد طبیعت و فطرت کے لحاظ سے فرق رکھتے ہیں یا نہیں؟ بالفاظ دیگر عورت و مرد میں فقط تولید و تناسل کے اعضا کا فرق ہے یا اس سے زیادہ گہرا فرق موجود ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ۔ اگر دوسری نوعیت کے اختلافات بھی معلوم ہیں تو کیا وہ اختلافات ایسے ہیں جو حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یا ایسے اختلاف ہیں جن کا فطرت انسانی سے تعلق نہیں ہے جیسے رنگ و نسل۔

عورت، فطرت کے زاویہ نظر سے

پہلی بات کے بارے میں خیال ہے کہ بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس بارے میں تھوڑا

سابقہ مطالعہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ فرق و اختلاف زن و مرد فقط تولید و ناسل کے اعضاء ہی میں نہیں، دوسری باتوں میں بھی فرق ہے، بحث اس میں ہے کہ باقی اختلافات عورت و مرد کے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔

مغربی دانشوروں اور ماہرین نے پہلے حصے پر مناسب طریقے سے گفتگو کی ہے، حیاتیاتی و نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں کے مطالعے کے بعد ان لوگوں نے تھوڑے سے بھی انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ ان لوگوں نے جس طرف توجہ نہیں کی وہ ہے ان اختلافات کا جائزہ جو خاندانی حقوق اور ذمہ داریوں پر اثر ڈالتے ہیں اور مرد و عورت کو غیر مشابہ قرار دیتے ہیں۔ فرانس کے مشہور فیزیولوجسٹ، ایکس کارلے، جو بیالوجسٹ اور اعلیٰ درجے کے سرجن تھے، موصوف نے اپنی بہت عمدہ کتاب میں دونوں باتوں کا اعتراف کیا، موصوف کی کتاب کا فارسی ترجمہ ”انسان موجودہ ناشناختہ“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یعنی موصوف کے بقول۔ زن و مرد قانون تخلیق کے مطابق مختلف طور پر پیدا ہوئے ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ دونوں کے اختلافات اور فرق ان کے فرائض و حقوق پر اثر انداز بھی ہوتے اور ان میں بھی فرق ڈالتے ہیں۔

”جنسی عمل اور تولید مثل“ کے عنوان سے ایک فصل قلم بند کی ہے (طبع سوم صفحہ ۱۰۰) کہتے ہیں:

”یہی اور تخم دان بڑے وسیع عمل کرتے ہیں۔ پہلے تو نریا مادہ خلیے بناتے ہیں جن کی پوسٹگی سے نیا انسان وجود میں آتا ہے۔ اور عین اسی دوران ایسے ردوں کی نمون پر ریزش کرتے ہیں، جو رگوں، پٹھوں اور ڈھانچے نینر شعور میں مرد و عورت کے اثر ظاہر کرتے ہیں۔ یوں وہ ہمارے تمام بدنی عمل میں تیزی بخشتے ہیں۔“

بیضوں سے ہونے والی ریزش، تہور، جوش و خروش اور خشونت و سختی پیدا کرتی ہے اور یہی خصوصیات جنگی بیوں کو اس گائے سے ممتاز کرتے ہیں جو کھیتوں میں جانی کا کام کرتی ہے۔ تمدن بھی وجود زن میں اسی طرح کے اثرات ڈالتا ہے۔
.... مرد و عورت میں جو اختلاف موجود ہے، وہ فقط جنسی بدن، بچہ دانی اور نظام تولید اور خاص تربیت ہی پر متبج نہیں ہوتا بلکہ ایک اور گہری علت ہے اس اختلاف کی، اور وہ ان کیمیائی مادوں کی ریزش ہے جو نسلی غدودوں سے خون پر ہوتی ہے۔

اس اسی وراثت کے پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے انقلابِ خواتین کے صرف سوچنے میں کہ دونوں جنسوں کو ایک تعلیم و تربیت دی جائے۔ دونوں کے مصروفیات، اختیارات اور ذمہ داریاں ایک قسم کی دی جائیں۔ عورت بہت سے پہلوؤں سے مرد سے مختلف ہے، بدن کے حصے، اعضاء کی قوت و ساخت، خاص کر اعصابی سلسلہ، اس کی جنس کی اٹلیاں اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔

فرضاً وحی کے قانونِ قاعدے، ستاروں کی دنیا جیسے ہیں، سخت اور ناقابلِ تبدیلی۔ ممکن نہیں کہ انسانی رجحانات و ارادے ان میں دخل دے سکیں، ہم مجبور ہیں جس صریح و وہ ہیں، اسی طرح انہیں مان لیں۔

خواتین کو مردوں کی اندھی تقلید کے بغیر کوشش کرنا چاہئے کہ اپنی فطرت کے عطا کئے ہوئے انعامات کو دوست دیں، واپس اپنی خاص شرت و خمیر کے مطابق اسی راہ میں آگے بڑھیں۔ بشریت کے ارتقا میں ان کی ذمہ داریاں مردوں سے زیادہ اہم ہیں، ان ذمہ داریوں کو سبک نہ سمجھیں اور ان سے پہلو تہی نہ کریں۔

کمال نے مرد کے مادہ تولید اور عورت کے مادہ تولید میں جیسوں اور ان کے باہم پیوست ہونے کی کیفیت بتائی اور یہ کہ تولید کے لیے مادہ کا ہونا ضروری ہے برضاف وجود نر کے اور یہ کہ جس

ت کے جسم کو مکمل کر لے۔ فصل کے آخر میں لکھا ہے :

”ہیں جوان سرکیوں کے لیے وہ طرز فکر اور اس قسم کی زندگی اور فکری اشتغالات اور مقاصد اور سڈ پالوجی نہ رکھنا چاہئے جو نو جوان لڑکوں کے لیے ہو کر تے ہیں تعلیم و تربیت کے ماہرین کو مرد و زن کے اختلاف اعضاء، جنس، مرد و زن کے نسبت اور ان کے فطری فرائض کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہماری آئندہ نسل کی بنیاد و تعمیر بنیادی نکتے پر بڑی اہمیت حاصل کر سکے گی۔“

آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس بڑے دانشور نے زن و مرد کے بڑے فطری فرق بھی بتائے ہیں یہ سب کچھ بھی ظاہر کیا کہ ان اختلافات کے سبب فرائض و حقوق میں مشابہت نہیں ہے۔ آئندہ فصل میں ہم دوسرے دانشوروں کے نظریے بیان کریں گے کہ وہ لوگ زن و مرد میں کیا اختلاف مانتے ہیں، پھر نتیجہ حاصل کریں گے کہ زن و مرد کن حصوں میں صلاحیتوں اور ضرورتوں میں مشابہ ہیں اور اس وجہ سے انھیں مشابہ حقوق رکھنا چاہیے اور کن حصوں میں مشابہت نہیں رکھتے، اور ایسے حالات میں حقوق و فرائض غیر مشابہ حاصل ہونا چاہئے۔ اور مرد کے عائلی حقوق و فرائض میں یہ حصہ کتاب نازک ترین و اہم ترین حصوں میں ہے۔

سآلواں حصّہ :

عورت و مرد کے فرق

- — کیا عورت و مرد میں فرق کا خیال قرونِ وسطیٰ کی سوچ ہے۔
- — عورت کے حقوق نے افلاطون و ارسطو کو آمنے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔
- — عورت و مرد کی تخلیق میں، قانونِ خلقت نے دونوں کے جوڑ کو زیادہ منطوط بنایا ہے۔
- — مرد، دنیا پر قبضہ کرنے والا ہے اور عورت مرد کو قابو میں رکھنے والی ہے۔
- — مغرب کے نئے مقلدوں کو زن و مرد کے جن تعلقات نے غرقِ سرور کر رکھا ہے، خود اہل مغرب اس خمّار کا دور گزار رہے ہیں۔

عورت و مرد میں فرق و اختلافات

(۱)

عورت و مرد کے فرق و اختلافات : عجیب مہیں بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ بیویں صدی کے نصف آخر میں زندگی گذر رہی ہے۔ پھر بھی کونے کھدے میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سوچنے کا انداز قرون وسطی جیسا ہے۔ پرانے خیالت گھے پسے افکار، اختلاف زن و مرد سمجھتے ہیں۔ عورت و مرد کے درمیان فرق ہے۔ شاید چلتے ہیں کہ قرون وسطی کے لوگوں کی طرح یہ نتیجہ نکالیں کہ عورت کی جنس گھٹیا ہے، عورت انسان کا اس نہیں ہے۔ عورت حیوان و انسان کے درمیان برزخ ہے۔ عورت میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ زندگی میں مستقل و آزاد ہو، اسے بہر حال مرد کے ماتحت اور اس کی سرپرستی میں رہنا چاہیے۔ آج کی دنیا میں ان پرانی باتوں کا فائدہ کیا ہے۔ آج سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ باتیں جھوٹ اور جعل سازی تھیں۔ مردوں نے زور و ظلم سے عورت کو دبا رکھا تھا۔ اب سب جان گئے ہیں کہ بات برعکاس تھی عورت کی جنس برتر اور مرد کی جنس پست اور ناقص تر۔ خیر، جناب! عوام کی حیرت انگیز ترقی کی روشنی میں عورت و مرد کا فرق کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جعل سازی اور بہتان کی بات نہیں۔ علمی اور تجرباتی حقیقتیں ہیں۔ مگر یہ فرق اس بحث سے قطعیاً غیر متعلق ہیں کہ مرد یا عورت برتر جنس ہے اور دوسری جنس گھٹیا ہے اور ناقص ہے۔ قانونِ خنقی کے سامنے ان کی اونچ نیچ سے مقصد ہی کچھ اور ہے۔ قانونِ خلقت نے یہ فرق اس لیے رکھا تھا کہ زن و مرد کی خاندانی زندگی کے تعلق کو زیادہ مضبوط کرے۔ ن کی اکائی کی بنیاد رکھی جائے قانونِ خلقت نے یہ فرق اس لیے رکھا تھا کہ زن و مرد اپنے ہاتھوں اپنے عائلی فرائض خود بانٹ لیں اور جسم کے دوسرے اعضاء کی طرح اختلاف کے باوجود ایک جسم بنائیں۔ مگر قانونِ خلقت نے

انکچہ، کان، ہاتھ، پاؤں اور یہ ٹرھ کی ٹہری کے جوڑ بنائے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ ان پر خاص نظر رکھتا اور ان میں فرق چاہتا ہے۔ ایک پر دوسرے کے مقابلے میں غلیم جائز سمجھتا ہے۔

یہ موضوع میرے تعجب کا باعث ہے۔ بعض حضرات اس پر اصرار کرتے اور زور دیتے ہیں کہ جسمانی اور نفسیاتی مساویتوں کے لحاظ سے زن و مرد کا فرق، عورت کے ناقص اور مرد کے کامل ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا انہماک یوں کرتے ہیں کہ قانون خلقت نے مصلحت کی بنا پر عورت کو ناقص پیدا کیا، عورت کے ناقص انخلقت ہونے کی بات ہم مشرق کے رہنے والوں سے پہلے اہل مغرب میں پہلے کی ہے۔ وہاں مذہب و کلیسا کہتے ہیں،

عورت کو عورت ہونے پر شرمندہ ہونا چاہیے۔ کبھی کہا جاتا ہے۔ عورت وہ مخلوق ہے جس کی زنجیں بڑی اور عقل چھوٹی ہے۔ عورت آخری وحشی ہے جسے مرد نے رام کیا ہے۔ وغیرہ۔ اس سے زیادہ عجیب یہ بات کہ، اخیر دور میں کچھ یورپ والے ایک سو اسی درجے کی گردش یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک ہزار ایک دیلوں سے مرد کو مخلوق ناقص و پست و زبوں و عورت کو مخلوق کامل و برتر ثابت کر دکھائیں۔

پرنسپل آف مونیٹنگ کی تالیف "زن جنس برتر" مجلہ "زن روز" میں پڑھی ہے۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ جنس کس زور آوری اور بے معنی تانے بانے سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ برتر ہے۔ کتاب میں فزیالوجی، انفسیاء اور معاشرتی شماریات کی حد تک کارآمد اطلاعات دی گئی ہیں۔ اس کے بعد جو مصنف نے نتائج حاصل کرنا چاہے ہیں اور اپنا مقصد کیا ہے اس کے نام سے عیاں ہے، ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں زمین آسمان کے فرق ہے۔ مذہب میں۔ آخر، ایک دن عورت کو اتنا حقیر و پست و زبوں کیوں کہا تھا کہ آج مجبور ہو کر گزشتہ کی تلافی کرنا پڑ رہی ہے اور اس میں بھی وہ سب نقائص اور کمزوریاں جو

عورتوں کے ذمے لگائی تھیں اب انھیں کو مرد کے سر تھوپنے کی مہم شروع کرنا پڑی ہے۔ کیوں ضروری ہے کہ زن و مرد کے فرق کو کسی کے ناقص اور کسی کے کامل ہونے پر زور دیں پھر کبھی مرد کا دامن پکڑیں کبھی عورت کا۔

ایشلی مونٹگو ایک طرف تو زور دیتے ہیں کہ زن کو جنس کے اعتبار سے مرد پر برتری حاصل ہے اور دوسری طرف مرد کے خصوصیات بتاتے ہیں کہ مرد تاریخی اور اجتماعی لحاظ سے تاریخ کا خالق ہے، فطری عوامل نہیں۔

مرد و عورت کا فرق تناسب (ایک مناسبت پر مبنی ہے) نہ نقص و کمال قانون خلقت چاہتا تھا کہ ان اختلافات سے عورت و مرد میں زیادہ مناسبت رہے، کیونکہ دونوں بہر حال شریک زندگی گذاریں گے۔ الگ الگ زندگی بسر کرنا قانون خلقت سے انحراف ہے۔ یہ مطلب بعد میں آنے والے توضیحات میں زیادہ روشن ہوگی اور تفاوتوں کی نوعیت اور کھلے گی۔

پسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جو ہماری صدی میں زیر بحث آیا۔ کم از کم ایک ہزار چار سو برس پہلے یہ بحث ہو چکی ہے۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت میں اس کا تذکرہ ہے۔

افلاطون نے بڑی صفائی سے کہا ہے کہ عورت و مرد مشابہ صلاحیتوں کے مالک ہیں عورتیں بھی وہی ذمہ داریاں سنبھال سکتی ہیں جو مرد سنبھالتے ہیں۔ انھیں وہی حقوق ملنا چاہئے جن سے مرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔

عورت کے بارے میں بیسویں صدی کے مسائل جنہیں نیا کہا جاتا ہے سب کا سرچشمہ افلاطون کے افکار میں ہے، بلکہ اس صدی کے لوگ جسے حد افراط اور ناقابل قبول کہتے ہیں وہ افلاطون کے یہاں موجود ہے۔ لوگ اتنے بڑے آدمی سے تعجب کرتے ہیں، جو شخص ”پدر فلسفہ“ ہو وہ ایسی باتیں کرے! افلاطون نے رسالہ جمہوریت کی پانچویں فصل اسی موضوع سے مخصوص کی ہے اور زن و فرزند کی اشتراکیت، نسل کی اصلاح و بہبود، بعض زن و مرد افراد کی تولید

نسل سے محرومی اور ان افراد کو یہ حق دینا جو اعلیٰ درجے کے صفات سے متصف ہوں بخاندان
بہرہ ورانہ کی تربیت و پرورش کا ضابطہ، تناسل و تولید کے لیے معین عمروں کا تعین یعنی زن
و مرد جنسی عمل اور اولاد پیدا کرنے کے لیے ایسی عمروں کا تعین جن میں جوش اور زندگی کی
طاقت بھرپور ہو۔

افلاطون کا عقیدہ ہے جس طرح مردوں کو جنگی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے، عورتوں
کو بھی اسی طرح تربیت دی جائے، مردوں کی طرح خواتین بھی ورزشی مقابلوں اور کھیلوں میں
شرکت کیا کریں۔

اس کے باوجود دو نکتے افلاطون نے ضرور لکھے ہیں :

۱۔ وہ مانتا ہے کہ عورتیں جسمانی، روحانی اور دماغی طور پر مردوں سے کمزور ہیں۔ یعنی
مرد و زن کے تفاوت کو کمیت (مقداری) کے لحاظ سے تسلیم کرتا ہے۔ اگرچہ کیفیت میں اور
سہولتوں میں اس کے خلاف ہے۔ افلاطون کے خیال میں مرد و زن میں مماثل صلاحیتیں پائی
جاتی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ ہر شعبے میں وہ مردوں سے زیادہ کمزور ہیں اور اس سے کام لینے
و کام کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو کام مرد کر سکتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔
افلاطون عورت کو مرد سے کمزور تر ماننے کی بنیاد پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ مرد پیدا
ہوئے عورت نہیں۔ وہ کہتا ہے :

”خدا کا شکر ادا کرتا ہوں یونانی پیدا ہوا ہوں، غیر یونانی نہیں ہوں۔ آزاد خلق ہوا
ہوں۔ غلام نہیں۔ مرد پیدا ہوا ہوں، عورت نہیں۔“

افلاطون نے نسلی بہبود، عورت و مرد کی مساوی صلاحیتوں کے مطابق پرورش، زن
و مرد کی دیگرہ کی مشترک ملکیت (اشتراکیت) کا جو نظام بنایا ہے اس میں حاکم طبقہ کو ذمہ دار
منصوب ہے۔ یعنی فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی۔ جنہیں افلاطون تنہا حکومت کے لائق سمجھتا ہے۔
اس سے جانتے ہیں کہ افلاطون سیاسی رویوں میں ڈیموکریسی کے خلاف اور اسٹوکراسی کا حامی

گذشتہ نظریوں میں سازی بایں ارسطو کریت سے وابستہ ہیں ان کے علاوہ دوسرے طبقات کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دیتا۔

پرانے زمانے کے لوگوں میں افلاطون کے بعد جس کے نظریات و افکار جو ہماری دسریں

میں ہیں وہ اس کے شاگرد ارسطو کے ہیں۔ ارسطو نے اپنی کتاب "سیاست" میں زن و مرد کے فرق پر انہماک رائے کرتے ہوئے اپنے استاد افلاطون کی سخت مخالفت کی ہے۔ ارسطو کے نزدیک زن و مرد میں اختلاف کیمت (مقداری) ہی پہلو سے نہیں۔ کیف (کیفیت) کے لحاظ سے بھی ہے۔ قانون خلقت نے ہر ایک کے ذمے جو فرائض عائد کیے اور جو حقوق تجویز کیے ہیں ان میں زیادہ مقامات باہم مختلف ہیں۔ ارسطو کے عقیدے میں عورت و مرد کے اخلاقی فضائل بھی اکثر مقامات پر جدا جدا ہیں۔ ایک خلق، مرد کے لیے باعث شرف ہو سکتا ہے اور وہی خلق عورت کے لیے فضیلت نہ ہو۔ اسی طرح اس کے برعکس ایک خلق عورت کے واسطے فضیلت ہو اور مرد کے لیے نہ ہو۔

ارسطو کے نظریات نے پرانے زمانے میں ہی افلاطون کے خیالات کو منسوخ کر دیا اس کے بعد آنے والے دانشوروں نے اس کے نظریات کو افلاطون کے خیالات پر ترجیح دی یہ باتیں تھیں ماضی بعید کی، اب دیکھیں نئی دنیا کیا کہتی ہے

آج کی دنیا کی نظر: آج کی دنیا، اندازہ و گمان کی بات کے بجائے مشاہد و تجربہ پر بنیاد رکھتی ہے۔ جب اعداد و شمار کی بات ہوتی ہے تو چشم دید حقائق سامنے ہوتے ہیں جدید دنیا میں فزیکس کے گہرے مطالعات، نفسیات و معاشرے کے حقائق کی روشنی میں بہت زیادہ اختلاف اور فرق معلوم ہوئے ہیں، ایسے انکشافات جسے پرانی دنیا دریافت نہیں کر سکی تھی۔

ماضی بعید میں مرد و زن کے اقدار متعین کرتے ہوئے فقط ایک کے جسم کی قوت اور موٹائی

دوسرے جسم کی چھوٹائی، ایک کا جسم بھاری بھر کم دوسرا نازک اندام، ایک قد اور دوسرا
دست قد والی، ایک کی آواز میں زیادہ گرج دوسرے کی آواز میں لطافت و نرمی، ایک کا جسم
پختہ بال، دوسرے کا جسم آمینہ اور کندہ۔ اس سے آگے بڑھ کر تو ہونے کی حد تک جو دونوں میں
بیک سو سال میں ہے۔ یا پھر عقل و احساسات کا حساب لگاتے تھے۔ مرد کو منہ پر عقل و
عورت کو منہ پر مہر و محبت کہتے تھے۔

آج — ان باتوں سے آگے بڑھ کر متعدد پہلو اجاگر ہوئے ہیں، یہ معلوم ہوا کہ زن و
مرد کی دنیا اکثر معاملات میں لگ لگ اور ان معاملات میں فرق ہے۔

اب تحقیق نے جو کچھ لکھا ہے، ہم اس سے زن و مرد کے مجموعی تفاوت اور اختلافات کا تذکرہ
کریں گے اور اختلافات کے فلسفے پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ بھی غور کریں گے کہ ان اختلافات کی بنیاد
فطرت ہے ورنہ کتنی باتیں ہیں جو تاریخی، ثقافتی و معاشرتی عوامل سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ تفاوت
بیت ہیں جنہیں برتھمنس تھورس سے مطالعے اور تجربے سے دریافت کر سکتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن
کا کچھ ممکن نہیں ہے۔

دور کی بات | مرد، متوسط طور پر، بھاری اور گتھے بدن کا اور، عورت، چھوٹی اور زیادہ
نازک اندام ہوتی ہے۔ مرد کا قد لمبا، عورت کا قد چھوٹا ہوتا ہے۔ مرد میں کھردرائی
و سنسار و نرمی و لطافت، مرد کی آواز موٹی اور بھاری، عورت کی آواز نازک اور دلکش۔
عورت کے جسم کی جلد بڑھتی ہے، مرد کی جسمانی نشو و نما سست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ
مرد کے جسم میں لڑکے سے زیادہ جلدی بڑھتی ہے، مرد کے رگ پیچھے اور جسمانی قوت عورت
سے زیادہ ہوتی ہے۔ عورت میں چارہ ہی سے مقابلہ کرنے کی قوت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔
مرد سے پہلے بالغ ہو جاتی ہے۔ اس میں مرد سے پہلے تولید کی قوت آ جاتی ہے اور پہلے
مرد ہو جاتی ہے۔ مرد کے یہاں اس کے برعکس ہے۔ لڑکی، لڑکے سے پہلے بولتی ہے عورت
کے طور پر مغز سے، مرد کا متوسط مغز بڑا ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی جسم کی نسبت سے عورت کا

منغز بنہ ہوتا ہے۔ مرد کے پھیپھڑے عورت کے پھیپھڑوں سے زیادہ سانس میں ہوا کھینچتے ہیں۔ عورت کے دل کی دھڑکن مرد کے دل کی دھڑکن سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

نفسیاتی فرق : مرد، ورزش، ٹنکار اور دور دوڑ دھوپ کے کام سے بہ نسبت عورت کے دل چسپی رکھتا ہے۔ مرد کے احساسات رزم و مقابلہ و جنگجوئی، عورت کے جہانات رزم دوستی صلح پسندی چاہتے ہیں۔ مرد، حد سے آگے بڑھنے اور ہنگامہ لانی عورت پر سکون اور خاموشی تر جذبات رکھتی ہے۔ عورت اپنے لیے اور غیروں کے لیے سخت رویے سے بچتی ہے، اسی وجہ سے عورتوں کی خودکشی مردوں سے کم ہے۔ مرد، خودکشی کے معاملے میں بھی عورت سے زیادہ سخت ہے، بندوق، پستول سے اور پھندا ڈال کر مرنے کے واقعات اور اونچی عمارتوں سے کود کر جان دینے کے قصے مرد کے زیادہ ہیں۔ عورت، خوب اور گولیاں، ایفون... کھاکر مری جاتی ہیں۔

عورت کے نفسیات اور احساسات مرد کے مقابلے میں زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں عورت مرد سے جلدی جوش میں آجاتی ہے یعنی عورت جن معاملات میں اسے خاص لگاؤ یا خطرہ ہو، تیزی اور جلدی سے اپنے احساسات میں بہہ جاتی ہے اور مرد بہ نسبت عورت کے زیادہ سرد مزاج ہے۔ عورت طبعاً زیور و آرائش جہاں و زیبائش چاہتی ہے اسے زنگارنگ فیشن درکار ہیں۔ مرد اس کے خلاف ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کے احساسات زیادہ ناپائیدار ہیں۔ عورت مرد سے زیادہ احتیاط طلب زیادہ مذہبی، زیادہ باتوئی، زیادہ ڈرپوک اور زیادہ تکلف پسند ہے عورت نفسیاتی طور پر مادرانہ جذبات رکھتی ہے، یہ نفسیات بچپن ہی سے اس میں موجود ہوتے ہیں۔ اسے مرد سے زیادہ خاندان اور گھر سے تعلق خاطر ہوتا اور بلا ارادہ گھریلو فکریں رہتی ہیں۔ عورت دلیل و استدلال اور خشک عقلی بحثوں میں مرد کے برابر نہیں پہنچ سکتی، ہاں ادب، نقاشی، اور ذوق و نفسیات سے نازک تعلق رکھنے والوں میں مرد سے کم نہیں۔ مرد، راز کو چھپانے اور تکلیف دہ معاملات کو اپنے اندر محفوظ رکھنے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔

سب سے زیادہ رازداری کی بدولت پیدا ہونے والی آزمائشیں مرد کو زیادہ جھیلنا پڑتی ہیں۔ مختلف عورتوں کے۔ خواتین، مرد سے زیادہ رحم دل ہیں، فوراً انہیں رونا آتا اور کبھی کبھی شش بھی کھجاتی ہیں۔

اساسات کا ناطہ: مرد، اپنی خواہشات کا غلام ہے، عورت محبت کی بندھی ہوئی ہے۔ مرد جس عورت سے محبت کرتا ہے اسے پختا اور پسند کرتا ہے۔ عورت اس سے محبت کرتی ہے جس کی قدر و قیمت جانتی ہو اور جس نے اس سے محبت کا اظہار کر دیا ہو۔ مرد کی خواہش کہ عورت کے ساتھ رہے اور عورت بھی اس کا ساتھ دے اسے تسلیم کر دے۔ عورت، مرد کا دل موہنے اور دل کی راہ سے اس پر چھا جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ مرد، عورت کے سر پر سوار ہونا چاہتا ہے، عورت، مرد کے دل میں سما نا چاہتی ہے۔ مرد، عورت کو پکڑنا چاہتا ہے، عورت بھی مرد کو جذب کرنا چاہتی ہے۔ عورت، مرد میں دلیری و بہادری اور مرد عورت میں دلیری و زیبائش دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ عورت کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے کہ مرد اس کی حمایت کرے۔ عورت، مرد سے زیادہ خواہشات پر قابو رکھتی ہے۔ مرد کی خواہش حملہ آور اور پہل کرنے والی ہے۔ عورت کی خواہش میں نرمی و تحریک ہے۔

عورت مرد کے فرق

(۲)

پروفیسر ریک کے نظریات | مشہور امریکی نفسیات، پروفیسر ریک کے نظریات "زن و مرد" کے شمارہ نمبر ۹ میں ہیں چھپ چکے ہیں۔ یہ پروفیسر ریک کے "زن و مرد" کے مسائل پر تحقیق کرتے اور نتائج حاصل کرتے رہے پھر انہوں نے ایک ضخیم کتاب میں دونوں کے درمیان فرق بتائے ہیں۔ پروفیسر موصوف کے بقول:

مرد کی دنیا، عورت کی دنیا ہے بہت مختلف ہے۔ اگر عورت مرد کی طرح نہیں سوچتی یا اس جیسا کہ نم نہیں کرتی تو اس کا سبب دونوں کی دنیاؤں کا فرق ہے۔

پروفیسر نے لکھا ہے:

تورات کے بموجب "زن و مرد ایک گوشت سے وجود میں آئے" ٹھیک ہے دونوں ایک گوشت سے پیدا ہوئے ہیں، مگر دونوں کے جسم مختلف ہیں۔ پھر دونوں کی یہ ہیں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ عذریں ہیں، دونوں کے احساسات کبھی مماثل نہیں ہو سکتے۔ حادثات اور اتفاقات کے وقت دونوں کا رد عمل ایک نہیں ہو سکتا۔ زن و مرد اپنے جنسی تقاضوں کے مطابق مختلف اقدام کرتے ہیں جیسے دوسرے دوسروں میں الگ الگ حرکت کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کریں، ممکن ہے۔ مگر کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یعنی دونوں زندگی ساتھ بسر کر سکتے ہیں، ایک دوسرے کے عاشق اور

ایک دوسرے کے صفات و اخلاق قبول کر کے ٹھکاوٹ اور اکٹا ہٹ محسوس نہ کریں۔

پروفیسر ریک نے زن و مرد کے تقابلی مطالعے میں جو اختلافات قلم بند کیے ان میں ہے:

① مرد اپنے چاہنے والی عورت کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے خیال سے اکٹا ہٹ محسوس کرتا ہے۔

لیکن عورت کے لیے اس سے بہتر کوئی لذت نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک چاہنے والے مرد کے پہلو میں رہے۔

② مرد کا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ایک حالت میں رہے، عورت کی خواہش رہتی ہے کہ ہر آن

نئی ٹوٹی ہوئی ہر صبح کونئے حیلے میں بستر سے اٹھے۔

③ بہترین جملہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ عام محاورہ ہے ”پیاری میں

نہیں چاہتا ہوں“ خوبصورت ترین جملہ جو عورت اپنے چاہنے والے سے کہہ سکتی ہے،

وہ ہے ”مجھے تم پر ناز ہے“

④ اگر کوئی شخص زندگی میں کئی محبوب عورتوں کے ساتھ رہ چکا ہو تو دوسری عورتوں

کی نظر میں وہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔ مرد کو وہ عورت بدی معلوم ہوتی ہے جو کئی مردوں

کے ساتھ زندگی گزار چکی ہو۔

⑤ مرد کو بڑھاپے میں بد بختی کا احساس ہو جاتا ہے، کیونکہ اپنے روزانہ مشغلے یعنی کام کو ہاتھ

سے دیتے ہیں۔ مگر عورت بڑھاپے سے خوش ہوتی ہے کہ بہترین چیزیں اس کے سامنے ہوتی

ہیں۔ گھر اور چند نو اسے پوتے۔

⑥ مرد کی نظر میں خوش نصیبی کے معنی ہیں معاشرے میں ایک شخصیت اور مقام حاصل کر لے۔

عورت کے نزدیک خوش نصیبی کے معنی ہیں ایک آدمی کے دل پر قابو اور اسے زندگی

بھر کے لیے اپنا لینا۔

⑦ مرد ہمیشہ چاہتا ہے کہ محبوب عورت کو اپنے مذہب و قوم میں داخل کر لے۔

⑧ عورت کے لیے شادی کے بعد خاندانی نام، دین و ملت اپنے محبوب مرد کی خاطر

بدل لینا آسان کام ہے۔

شاہ کا خلقت زن و مرد کے ایسے فرق جن سے دونوں کی خاندانی ذمہ داریوں اور حقوق میں فرق پیدا ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس سے قطع نظر یہ مسئلہ بجائے

نحو خلقت کا شاہکار ہے، درسِ توحید و معرفتِ خدا ہے، جہان و کائنات کے حکیمانہ و مدبرانہ نظام پر ایک آیت و نشان ہے۔ ایک واضح مثال ہے کہ خلقت کے معاملات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ فطرانہ حیرے میں اندھے کی طرح راستہ نہیں ملے کر رہی ہے۔ علتِ غائی کے عمل و فعل بغیر تخلیق و وجود کائنات آئے دن رونما نہیں ہو رہا ہے اس دعوے پر یہ بحث دلیل ہے۔

تخلیق کی عظیم قوت نے، غفیرِ نوع اور مقصد تک پہنچنے کے واسطے تولید و تناسل کا انتظام کیا ہے۔ اس کے کارخانے سے ہمیشہ جنسِ نر اور جنسِ مادہ وجود میں آرہی ہے۔ پھر نسل کی بقا و دوام کے لیے دونوں جنسوں کی باہمی مدد اور تعاون و وحدت کی نیور کھی ہے، خصوصاً نوعِ انسان میں، ان دونوں کی مدد سے وہ اس دور کو مکمل کر رہی ہے۔ قوتِ تخلیق نے ہر صاحبِ حیات کی خاصیت خود خواہی و منفعت طلبی کو خدمت و تعاون، عفو و ایثار سے بدل دیا ہے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا طلب گار بنا دیا ہے۔ اس نے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے اور دونوں کے جسم و روح کو جوڑنے کے واسطے عجیب قسم کے جسمانی و روحانی فرق رکھے ہیں۔ تاکہ وہ آپس زیادہ سے زیادہ جذب و انجذاب حاصل کر سکیں ایک دوسرے کے عاشق و طلب گار ہوں۔ اگر عورت میں جسم و جانِ خلق و مزاجِ مردانہ ہوتا تو مرد سے کام لینا اور مرد کو اپنا شیفتہ وصال بنانا محال ہوتا۔ اور اگر مرد میں اوصافِ جسمانی و روحانی وہ ہوتے جو عورت میں ہیں تو، عورت اسے اپنی زندگی کا ہیرو نہ مانتی وہ اس کے دل کو جینا اپنے فنِ شکار کا بہترین شاہکار نہ سمجھتی۔ اصل مرد جہاں گیر اور زن مرد گیر پیدا ہوئی ہے۔

قانونِ خلقت نے زن و مرد کو ایک دوسرے کا طلب گار بنایا ہے۔ یہ ربط عام چیزوں کا عام چیزوں جیسا نہیں، وہ تعلق جو انسان خود خواہی سے محسوس کرتا ہے۔ یعنی انسان چیزوں کو اپنی خواہش کی بنا پر طلب کرتا ہے۔ انہیں استعمال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انہیں حاصل کر کے اپنے وجود

تمام پر قربان کرتا ہے۔ میان بیوی کا تعلق یہ کہ دونوں ایک دوسرے کی خوش نصیبی و راحت کی فکر میں رہتے ہیں خود فراموشی اور ایک دوسرے پر جاں نثاری سے لذت یاب ہوتے ہیں۔

خواہشات بلند تر رشتہ بعض حضرات "شہوت" اور "رافت" (خواہش و دل جوئی) میں فرق نہیں کرتے۔ تعجب تو اس پر ہے۔ ان کے

میان میں بیوی کو صرف لالچ اور شہوت کا رشتہ جوڑتا ہے۔ نفع اندوزی و حسن خدمت جیسے آدمی، کھانے، پینے، پہننے اور سوار یوں سے ربط رکھتا ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ خلقت و فطرت میں خود خواہی اور نفع اندوزی کے علاوہ اور بھی رابطے موجود ہیں۔ یہ رابطے خودی کے جذبے سے نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے علاوہ سرچشموں سے ابھرتے ہیں، وہ رشتے، جان نثاری، غفور و درگزر، اپنی تکلیفوں کو بھولنا، غیر کی راحت و آرام کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رشتے انسان کی انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں جانوروں کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہیں جب وہ اپنی جفت یا بچوں پر وقت آنے یا حفاظت کے لمحے ان کا اظہار کرتے ہیں۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ مرد ہمیشہ عورت کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے بے شادی مردہ جو ان ایک ہر جائی عورت کو کبھی دیکھ لے۔ یعنی دونوں کا تعلق شہوت کا ہے اور بس۔ حقیقت ایسا نہیں یہ رشتہ، شہوت سے بالاتر ہے۔ اور وہی بلند بند صن دونوں کا پیوند ہے، وہ رشتہ عالی قرآن مجید کی زبان سے "موت و رحمت کہنا چاہئے؛

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم/۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں جوڑا پیدا کیا کہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرو اور تم دونوں میں "مودتہ" (پر خلوص محبت) اور رحمت (مہربانی) پیدا کی۔

کتنی بڑی غلط فہمی ہوگی، اگر ہم تاریخ روابط زن و شوہر فقط خدمت حاصل کرنے اور استحصال اور تنازع بقاء کے نام سے تعبیر کریں اور کیا کیا مہمل باتیں اس سلسلے میں کہی گئی ہیں۔ سچ عرض کرتا ہوں بعض اوقات ان تحریروں کو پڑھتا اور دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ زن و مرد کے روابط کی تاریخ میں صرف ایک اصل اور ایک قانون استعمال کرتے ہیں "نظارہ" زن و مرد سماجی دو طبقوں کی طرح الگ الگ برسر پیکار رہنے والے دو طبقے ہیں۔ ان کے مفروضے برتھنگ اور ان کی جہالت و نادانی پر غم کھاتا ہوں۔ اگر والدین اور اولاد کی تاریخ روابط کو استثمار اور حسن خدمت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو روابط زن و مرد کی تاریخ بھی اس نظر سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ مرد ہمیشہ عورت سے زیادہ زور آور تھا۔ لیکن قانون خلعت نے مرد کے خمیر کو ایسا بنایا ہے کہ وہ غلاموں اور کینڑوں اور کمزوروں کی طرح اپنی بیوی پر ظلم و ستم کو روانہ رکھے، جیسے وہ سلوک اپنی اولاد پر جائز نہیں جانتا۔

مرد، عورتوں پر ستم کرتے ہیں۔ میں اس کا منکر نہیں ہوں۔ ہاں، وہ تشریح نہیں مانتا جو اس رویت کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مردوں نے پوری تاریخ میں عورتوں پر بہت ستم ڈھائے ہیں، لیکن ان مظالم کی بنیاد وہی اسباب تھے، جن کی وجہ سے اکھوں نے اپنی محبوب اولاد پر ستم ڈھائے تھے۔ بلکہ انھیں اسباب کی بنا پر خود انسان نے اپنے اوپر بھی ظلم کیے۔ اس کی بنیاد تہمی جہالت و عادت یا تعصب، اس کا حسن فائدہ طلبی سے کیا تعلق۔ اگر کبھی مناسب وقت ملا، تو تاریخ تعلقات زن و شوہر پر تفصیلی گفتگو کروں گا

گھریلو رابطہ ہی عورت و مرد میں مختلف چیزوں کے روابط میں فرق پیدا نہیں کرتا، بلکہ خود ان دونوں کا باہمی تعلق بھی مشابہ نہیں رہتا۔ مرد کا عورت سے رابطہ اور اس کی نوعیت ویسی نہیں ہوتی جو نوعیت عورت کی رشتے کی بنیاد پر مرد سے ہوتی ہے دونوں میں دونوں طرف سے فرق ہوتا ہے۔ طرفین میں کشش کے باوجود لیکن اجسام بے جان کے برعکس چھوٹا

زن و مرد کے باہمی

نفیات و احساسات

بڑے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، کیونکہ قوت تخیل نے مرد کو منظر طلب و عشق اور عورت کو منظر محبوب و معشوقیت بنایا ہے، مرد کے احساسات نیاز مندانه، عورت کے احساسات ناز آفرینی ہے، مرد کے احساسات طالبانہ اور احساسات زن مطلوبانہ ہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک روزنامے میں اس روسی لڑکی کی تصویر چھپی تھی جس نے خودکشی کی تھی۔ اس نوجوان نے ایک تحریر چھوڑی جس میں تھا کہ مجھے اب تک کسی مرد نے نہیں چھوا اس لیے مجھے زندگی برداشت نہیں۔

ایک لڑکی اگر کسی مرد کی محبوب نہیں بن سکتی تو اپنے اندر بہت بڑی شکست محسوس کرتی ہے۔ اسے کسی مرد نے چھوا نہیں۔ نوجوان لڑکا زندگی سے کب مایوس ہوتا ہے؟ جب اس کو کسی لڑکی نے چوما ہو؟ نہیں۔ وہ مایوس اس وقت ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو چوم سکے۔

طویل اور جامع بحث کے دوران "ویل ڈیورنٹ" لکھتا ہے، اگر شوہر کے حصول میں دقت رہے، تیار فقط علم و فکر میں ہوتا، دل ربائی و بھول پن اور چالاکاں بے کار ہوتی تو ساتھ فی صد اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں بن بیاتی نہ رہیں۔۔۔۔

اعلیٰ درجے کی مفکر و تعلیم یافتہ خاتون بیگم مونیہ کو الوسکی شکایت کرتی تھیں، کوئی شخص ان سے شادی نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا: مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟ میں دوسری عورتوں سے بہتر ہو سکتی ہوں، باوجود اس کے بے حیثیت و کم اہمیت عورتوں سے عشق کیا جاتا ہے مگر بچے سے نہیں۔

آپ نے دیکھا، یہ محترمہ کس طرح کے احساس شکست میں مبتلا ہیں اور وہ بھی مرد کے مقابلے میں۔ کہتی ہیں، مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟

مرد، اس وقت شکست محسوس کرتا ہے جب شادی کے مرحلے میں وہ اپنی محبوبہ کو حاصل نہ کر سکے یا محبوبہ تول جائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئے۔

ان سب چیزوں کا ایک فلسفہ ہے۔ گہرا، اور مضبوط اتحاد و تعلق۔ یہ رشتہ استوار کیوں

درکار ہے؟ تاکہ زن و مرد، زندگی سے زیادہ لذت حاصل کر سکیں؟ نہیں! فقط یہی نہیں۔ انسانی معاشرے کی اساس اور نسل آئندہ کی نیواسی سطح پر استوار ہوتی ہے۔

رسالہ ”زن روز“ شمارہ ایک سو ایک میں ”کلوڈا السن“ کے قلم سے ایک نفسیاتی بحث شائع ہوئی ہے۔

ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ

یہ محترمہ خاتون کہتی ہے:

ایک خاتون نفسیاتی ماہر کے طور پر، میرا سب سے زیادہ رجحان مردوں کے نفسیات کے مطالعے کی طرف تھا۔ کچھ دن پہلے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں زن و مرد کے نفسیاتی عوامل پر تحقیق کروں، اس تحقیق کے نتیجہ میں مجھے معلوم ہوا:

۱۔ تمام عورتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی شخص کی نگرانی میں کام کریں، انھیں محکوم ہونے اور نگران کار کے ماتحت کام کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔

۲۔ عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ لوگ ان کے وجود کو موثر اور ان کو نیاز مند کی کام کر رہا۔

اس کے بعد یہ محترمہ اپنی رائے کا اظہار یوں کرتی ہیں:

میرے خیال میں ان دونوں نفسیاتی احساسات کی بنیاد یہ ہے کہ خواتین جذبات کی تابع اور مرد عقل کے تابع ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خواتین ہوشمندی میں مردوں کے برابر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس معاملے میں وہ برتر بھی نکلتی ہیں۔ خواتین کا نقطہ کمزوری فقط ان کے جذبات کی شدت ہے۔ مردوں کی سوچ ہمیشہ عملی ہوتی ہے، وہ بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔ اچھے قسم کا نظم و نسق قائم کرتے ہیں، ان کی رہنمائی اچھی ہوتی ہے۔ لہذا مردوں کی برتری کا سبب خود فطرت کی اساس ہے۔ اس حقیقت سے عورتیں جتنی بھی ٹکریں۔ فائدہ مند نہ ہوگا۔ خواتین، مردوں سے زیادہ حساس ہیں، لہذا انھیں یہ باور کرنا چاہیے کہ انھیں زندگی میں مردوں کی سرپرستی درکار ہے۔ خواتین کا مقصد زندگی ”حفاظت“ ہے۔ جب انھیں یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے

سی وقت کم سے ہاتھ روک لیتی ہیں۔ اس مدعا کو حاصل کرنے کے لیے خطرات کا سامنا کرتے بچکچاتی ہیں، ان کا احساس خوف ایک ایسا احساس ہے جسے دور کرنے کے لیے مدد کی ضرورت پڑتی ہے، جس کاموں میں لگتا رہا سوچنا پڑتا ہو، عورتوں کو تنہا دینے والے کام ہیں....“

جلد بازی کا انقلاب : عورتوں کے پامال شدہ حقوق کی بحالی کے لیے جو انقلاب برپا ہوا اس میں بہت زیادہ بے حواسی اور جلد بازی سے

اگرچہ وجہ تھی کہ انہیں یہ خیال ہی دیر میں آیا۔ ان کے جذبات نے مہلت نہ دی کہ علم ان سے اپنا فیصلہ کتنا دور اسے رہنا بناتا۔ آخر کار خشک و تر سب کچھ جل گیا۔ اس سلسلے سے عورتوں کی کچھ محرومیاں کم ہوئیں مگر حقوق کچھ زیادہ دے دیے گئے۔ بند دروازے کھولے۔ مگر بد سختیاں اور سبکدوشیاں بدلے میں زیادہ ملیں۔ یہ سب کچھ خواتین ہی کو نہیں بلکہ معاشرے کے مقدر کو بھی ملا۔ طے شدہ بات سے گزرتی جلد بازی نہ ہوتی تو خواتین کے حقوق بہت اچھے انداز میں ملتے اور حالات کی تہری سے دانشوروں کی چیخ پکار، حال اور مستقبل کے واسطے ان کی یہ گھبراہٹ اور فریاد فلک تک پہنچتی البتہ۔ مسدوداتی ہے۔ علم و دانش راہ نکالے گی۔ انقلاب خواتین جذباتیت کے بجائے علم و دانش پر قائم ہوگا۔ یورپ کے دانشوروں کے نظریات کا اظہار اس بارے میں امید افزا ہے۔

یہ دعائی دے رہا ہے۔ جز، اتوں نے مقلدین مغرب کو نشے میں مدھوش کر رکھا، خود اہل مغرب اس نشے کے خمار اور آخری مہر پہنچا پہنچ رہے ہیں۔ ان کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔

ویل ڈیورینٹ کا نظریہ : لذاتِ فلسفہ حصہ چہارم میں ویل ڈیورنٹ نے جنسی واپی مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم اس کتاب سے اپنے

پیشہ کے لیے کچھ اقتباسات لکھیں گے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مغربی افکار کے رعب سے انھیں اور جلد بازی کے فیصلوں سے احتیاط کریں۔

حصہ چہارم، فصل ہفتم میں ”عشق“ کا عنوان قرار دے کر کہتا ہے :

”غشق کا پہلا صاف نغمہ، آغازِ بلوغ میں شروع ہوتا ہے۔ (PUBERTY) پیو برٹی جس کے معنی انگریزی میں ”بلوغ“ ہیں، لاطینی اصل کی بنا پر اس کا مطلب ہے ”بالوں کا سن“ وہ عمر جب لڑکے کے بدن پر بال اگنے شروع ہوتے ہیں، خاص کر سینے کے بال جن پر لڑکے ناز دکھاتے ہیں اور پہرے کے بال ترشوانے میں سی سی پوس (SISYPHUS) کی طرح جبر اٹھاتے تھے۔ بالوں کی ترشیش خارش دونوں پہنوں کے بالوں کی چھوٹ۔ بظاہر قوتِ تولید و تناسل سے وابستہ ہے۔ اس کی بہترین شکل اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب نشا طِ زندگی اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ بڑھوتری کا یہ زمانہ بالوں کے ساتھ اچانک آواز میں سختی بھی لے آتا ہے۔ جنس کی ثانوی صفات ہے جو لڑکوں کے بلوغ پر انھیں عارض ہوتی ہے۔ اسی عمر میں لڑکیوں کو فطرت کی طرف سے اعضا و حرکات میں لوج اور لچک عطا ہوتی ہے جس سے آنکھوں میں خیرگی آتی ہے، ان کے کولھے چوڑے ہو جاتے ہیں کہ ماویا نہ عمل آسان ہو۔ سینہ بھر جاتا ہے، پستان ابھر آتے ہیں کہ بچوں کو دودھ پینے میں سہولت ہو۔ ان ثانوی خصوصیات کے نمودار کی علت کسی کو معلوم نہیں۔ پروفیسر اسٹر لنگ کے نظریے نے کچھ حامی پیدا کیے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بلوغ کے دوران نہ صرف تناسلی خلیے لطف پیدا کرتے ہیں بلکہ ایک نوع کے ”ہرمون“ بھی بتاتے ہیں جو نمون نہیں داخل ہو کر جسمانی نفسیاتی تبدیلیاں بھی لاتے ہیں۔ اس عمر میں جسم میں نئی قوتِ توجہم لیتی ہی ہے، خود روح اور مزاج و عادات میں بھی ہزاروں قسم کے تاثرات کروٹ لینے لگتے ہیں۔ رومن رولانڈ کے بقول: زندگی کے برسوں میں ایک زمانہ وہ آتا ہے جب جسمانی تبدیلیاں آہستہ سے ایک مرد کا وجود مرد میں اور ایک عورت میں بدل دیتی ہیں یہی بڑی تبدیلیاں ہیں۔۔۔۔۔ دیری و توانائی نرم دلوں کو گرم کر کے پگھلاتی ہے اور نرمی و لطافت زور آوری کی ہوس کو بھڑکاتی ہے۔

لے سی سی پوس ایک قدیم فسانوی بہادر جس کا صبر مشہور تھا مصنف کا مصعب یہ ہے کہ اس زمانے میں بال کٹوانے اہل مندوانے میں بڑی سختی سمیٹنا پڑتی تھی کیونکہ خطا بنانے کے اوزار دستیاب نہ تھے۔ اس کے باوجود لڑکے صبر و بکامیاب رہ کر تھے اور خطا نہ کرتے تھے۔

ہی ہوسا کہتا ہے :

سب مرد، جھوٹے، مکار، شینخی خورے، دورے، جھگڑالو ہوتے ہیں اور تم

عورتیں خود پسند، دکھاوے اور خیانت کی عادی ہوتی ہیں۔ اہا، دنیا میں فقط

● ایک چیز بلند و مقدس ہے اور وہ ہے ان دونوں ناقصوں کا بندھن.....“

جوڑے کی تلاش، بڑی عمر کے آدمیوں میں، ایک طرف تو مردوں پر تسلط طلبی کے لئے

ہوتا ہے اور دوسری و دل ربائی سے فرار کی خاطر عورتوں کے لیے۔ (مگر یہ مکمل کلیہ نہیں ہے)

● چونکہ مرد فطری طور پر جنگ جو اور شکاری جانور واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس کا عمل مثبت

اور تملد آوری ہے۔ اس کے لیے عورت، العام ہے جو اسے حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اسے اڑا لینا

● اس کا مالک بننا چاہتا ہے۔ بیوی کی تلاش جنگ و پیکار ہے اور شادی، شریک زندگی

● تلاش اور اقتدار ہے۔

● عورت میں پاک دامنی کی فراوانی تو والد و ناسل کی خدمت انجام دیتی ہے، کیونکہ پردہ نشینی

● عورت میں مددگار ہوتی ہے پاک دامنی، عورت کو قوت بخشتی ہے وہ اپنے عاشق کی جستجو میں

● بہت مشکل اٹھاتی ہے۔ عاشق سے مراد اس کا وہ ساتھی جو اس کی اولاد کے باپ بننے کا فخر

● حاصل کرے۔

● عورت کی زبان سے گروہ اور نوعِ نواتین کے فائدے کی بات ہوتی ہے اور حلقومِ مرد سے

● کے فائدے پر گفتگو۔

● عشق کے کھیل میں، عورت مرد سے زیادہ ماہر ہے۔ کیونکہ اس کے رجحان میں اتنی شدت

● ہوتی کہ عقل کی آنکھ اسے دیکھ سکے۔

● ڈارون نے مطالعہ کیا ہے کہ ماہِ جان داروں میں دنیا کے عشق سے تعلق رکھنے والی مخلوق

● ہے۔

● ویسے اور کرافٹ ایبینگ کہتے ہیں :

● عورتیں، مردوں کی مکھم تعریفوں کے پیچھے ہولیتی ہیں، وہ مردوں سے اپنی خواہشات

زیادہ توجہ کی طلب گار ہوتی ہیں، اس کا سبب ان کا جنسی لذت گہرا تعلق ہے۔

لمبرزو کہتا ہے :

عورت میں عشق کا عنصر ایک ثانوی صفت ہے جو اس نے ماں سے لی ہے۔ اس کے علاوہ تمام جذبات و احساسات جو ایک عورت کو مرد سے ملاتے ہیں۔ وہ جسمانی اسباب کے پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کے خیر سے سراٹھاتے ہیں جن میں یہ حس پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ کسی کی تابع اور کسی کی سپردگی میں۔ مرد کی حمایت اسے حاصل ہو۔ وہ اپنے حالات کو اپنے وجود کے معاملات کو اسے منطقی کرنا چاہتی ہے۔

دل ڈیورینٹ نے "مرد و عورت" کے عنوان سے ایک فصل میں لکھا ہے :

- عورت کا خاص کام تہادِ نورع کی خدمت ہے۔
- مرد کا خاص کام عورت اور بچے کی خدمت ہے۔ اور دونوں اس اساسی کام کے لیے حکمت و تدبیر کے پابند کیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی مقصد ہیں۔ مگر آدمی مخلوق بے خبر ہے۔ حالانکہ انسان و خوش نصیبی کی روح اس میں پوشیدہ ہے۔
- عورت کی فطرت میں زیادہ رجحان پناہ جوئی کا ہے جنگ طلبی کا نہیں۔ کچھ مادہ مخلوق ایسی دیکھی ہے جس میں جنگ کا اندرونی محرک موجود ہی نہیں ہے۔ مادہ اگر کہیں لڑتی ہے تو اپنی اولاد ہی کے لیے لڑتی ہے۔

- عورت، مرد سے زیادہ صابر ہوتی ہے، اگرچہ بڑے بڑے کام اور بہادری کے معاملے اور زندگی کے بحران میں مرد کی شجاعت زیادہ کام دکھاتی ہے۔ لیکن لگاتار تحمل و برداشت، چھوٹے چھوٹے پریشان کن حالات اور تکالیف میں عورت کا صبر زیادہ ہے۔ عورت کی جنگ جوئی ایک دوسرے وجود میں ہوتی ہے۔ عورت فوج پسند کرتی ہے۔ سپاہی اسے اچھا لگتا ہے۔ دلیری کے مظاہروں میں اس کے اندر ایک عجیب محرک پیدا ہوتا ہے۔

● جب عورت اپنے سرگردان مفکر شوہر کو، گھر کا فدائی، اور اپنے بچوں کا پابند بنالیتی ہے تو اصل میں اس کا سبب احساسِ حفظ و بقا، نوعِ ہوتا ہے۔

● عورت کا عشق گھر اور بچوں سے ہوتا ہے۔ اگر وہ ان کی نگہداشت میں کامیاب ہو گئی تو اسے دولت و حکومت کی پروا نہیں رہتی۔ جو لوگ اس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں، یہ عورتان کا مذاق اڑاتی ہے، آج کی عورت فطرتاً اگر خاندان اور بچوں کی دیکھ بھال میں کمزور نظر آتی ہے تو اس کا سبب اس کا شہری ہونا ہے وہ اپنی فطرت کو بھول گئی ہے لیکن فطرت کی شکست دائمی نہیں ہوتی۔ وہ جب چاہے اپنے اندر کے ذخیروں اور دہنیوں کے سہارے پلٹ سکتی ہے۔

● دنیا میں پھیلاؤ اور عدد کے اعتبار سے بہت سی قومیں اور نسلیں ہم سے زیادہ موجود ہیں۔ ان قوموں نے اپنی فطرت کے قوانین محفوظ اور باقی لا محدود رکھے ہیں۔

زن و مرد کا یہ مختصر سا تعارفِ اختلاف جو ہم نے اس مسئلہ کے ماہرین کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا۔

”رازِ تفاوتہا“ نامواری کے راز پر کچھ تاریخی عوامل کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا کہ کس حد تک اس کے اثرات ہیں؟ مگر مطالب کا دامن موضوع سے آگے نکل جائے گا اس لیے نظر موڑتا ہوں، گفتگو کے ضمن میں کچھ باتیں روشن ہوتی جائیں گی۔

لے ایک مٹائے کا سروے اور زمین پر پھیلی ہوئی کردروں قبیلوں اور نسلوں کو چھوڑ کر نتائج پر بحث

اور ان پر اپنے فلسفہ و قوانین کی عام بنیاد رکھنا غلط ہے۔

آٹھواں حصہ :

مہر اور نان و نفقہ

- ● مہر و نفقہ، عورت کی کینیزی کے دور کا بقیہ ہے ؟
- ● قرآن مجید نے مہر کو مرد کی طرف سے عورت کو ہدیہ اور اس کے خلوص کی نشانی کہا ہے۔
- ● مہر کا نقطہ اول افطرت کا وہ تقاضہ ہے جو عشق کی بنیاد پر مرد اور عورت سے دو الگ الگ چیزیں چاہتا ہے۔
- ● اسلام نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں۔
- ● عورت کا عشق اگر خود اس کی طرف سے شروع ہو تو عشق بھی نہ سکتا کھاتا ہے اور عورت کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔
- ● ہمیں ان مردوں کی اصلاح کرنا چاہیے جو اسلامی قانون پر عمل نہیں کرتے۔
- ● قانون کو خراب کرنے کی ضرورت کیا ہے ؟
- ● مہر کا سسٹم اسلام سے مخصوص ہے، اس کو ہر سسٹم سے الگ ہو کر دیکھنا چاہیے۔
- ● یورپ نے سو سال اور اسلام نے چودہ سو برس پہلے عورت کو اقتصادی آزادی دی ہے۔
- ● فقہ اسلامی کے نقطہ نظر سے نفقہ کی تین قسمیں۔
- ● یورپ کی خواتین مشین کی شکر گزار ہوں، قانون سازی کی نہیں۔

اسلام نے اقتصادی آزادی دی، خانہ بربادی نہیں۔

عورت، سرمایہ مرد سے کم حاصل کرتی ہے اور سرمایہ استعمال زیادہ کرتی ہے۔

آج کہ مرد چاہتا ہے، نفقہ کا حق ختم کر کے، عورت سے فکری قید کا انتقام لے

عورت کا حق نان و نفقہ شوہر سے ختم کرنا، شکاری مردوں کی راہ ہموار کرنا ہے۔

کیا، منشور حقوقِ انسانی نے عورت کی توہین کی ہے؟

مہر اور نفقہ

(۱)

شادی کے مرحلے میں مرد "مہر" مانے۔ اور اپنی ملکیت مال یا املاک میں سے کچھ رقم لڑکی کے باپ یا ماں کو دے۔
جب تک میاں بیوی کے تعلقات باقی رہیں، شوہر، بیوی بچوں کے تمام اخراجات پورے کرے۔

خانگی رشتوں کے بارے میں انسانوں کی یہ پرانی رسم چلی آرہی ہے۔
اس رسم کی بنیاد کیا ہے؟ یہ رسم کیوں اور کیسے شروع ہوئی؟ یہ مہر کی مد کیا ہے؟ عورت، کو نفقہ دینا، یعنی چہ؟

اگر زن و مرد، اپنے فطری و انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوں اور ان میں عادلانہ و انسانی رشتے برقرار ہوں، بیوی سے انسان جیسا روڈ یہ حکمران ہو تو بھی مہر و نان و نفقہ کا سوال پیش آسکتا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ مہر و نان و نفقہ اس زمانے کی یادگار ہو جب بیوی شوہر کی مملوک ہو کرتی تھی؟

عدل اور حقوق انسانی کی برابری۔ خصوصاً بیسویں صدی کا۔ تقاضہ یہ ہے کہ مہر و نان و نفقہ کا سسٹم ختم کیا جائے۔ شادیاں، بلا مہر ہوں، نفقہ کا مسئلہ ختم کیا جائے، عورت خود اپنی مالی ذمہ داریاں برداشت کرے، اولاد کے معاملات میں بھی دونوں برابر کے کفیل ہوں۔

تو ہم مہر سے بات شروع کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں، مہر، کیسے پیدا ہوا، اس کا فلسفہ کیا ہے؟

اور ماہرین معاشرتی علوم نے مہر کی وجہ کیا بیان کی ہے؟

مہر کا تاریخی پس منظر

کہا جاتا ہے: قبل از تاریخ، انسان وحشیانہ زندگی گزارتا، قبیلوں کی صورت میں رہتا، اور نامعلوم اسباب کی بنا پر اپنے خون شریک سے شادی کرنا جائز نہیں جانتا تھا۔ شادی کے خواہش مند جوان، مجبوراً دوسرے قبیلے سے معشوقہ و شریک زندگی مانگنے جاتے تھے۔ ان دنوں مرد اولاد کی پیدائش میں اپنا کردار نہیں جانتا تھا۔ اسے واقفیت نہ تھی کہ جنسی شل، پیدائش اولاد میں موثر ہے۔ اولاد کو بیوی کی اولاد سمجھتے تھے اپنی اولاد نہیں جانتے تھے۔ سب باپ کے بجائے ماں کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ بچوں میں آپا سے مشابہت محسوس تو کرتے تھے مگر اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔ ان کے نزدیک مرد قوت تولید سے محروم مخلوق تھی، شادی کے بعد شوہر ایک ضمنی شخصیت کے طور پر بیوی کے ساتھ اسی کے قبیلے میں رہتا اور بیوی اس کی جسمانی قوت اور رفاقت سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ اس عہد کو "ماں کی حکومت" کا دور کہتے ہیں۔

جلد ہی مرد کو عمل تولید میں اس کا حصہ معلوم ہو گیا اب وہ فرزند کا اصل مالک بن گیا۔ اسی وقت سے اس نے عورت کو اپنا تابع بنالیا اور خود گھر کا سربراہ بن گیا۔ یہاں سے "باپ کی حکومت" کا عہد شروع ہوا۔

اس پیرائے میں بھی خونی رشتوں سے شادی جائز نہ تھی۔ مرد کو دوسرے قبیلے میں بیوی ڈھونڈنا، پھر اسے اپنے قبیلے میں لانا پڑتا تھا۔ قبائل میں عموماً جنگ تھی لہذا، لڑکی کو لے بھاگنا پڑتا، یعنی جو، نوجوان لڑکی، لڑکے کو پسند آتی اسے اس کے قبیلے سے نکال لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ جنگ کے بجائے صلح کا راج ہوا، اور مختلف قبائل مل جل کر جینے کے دھمکنگ سیکھ گئے۔ اب لڑکی کو بھاگ لے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ لڑکا اپنی پسندیدہ لڑکی حاصل کرنے، دوسرے قبیلے جاکر، لڑکی کے باپ کی خدمت مزدوری کرتا، باپ اس کی محنت مزدوری کے بجائے اپنا داماد بنالیتا اور لڑکا اسے اپنے قبیلے لے جاتا۔

دولت میں اخلافہ ہوا تو مردوں نے سوچا، مدتوں منگیتر کے باپ کی خدمت کرنے سے تیریہ ہے کہ مناسب ہدیہ لے پیش کر کے منگیتر لے لی جائے۔ یہاں سے ”مہر“ ایجاد ہوا۔ اس ترتیب کی بنیاد پر پہلے دور میں شوہر، بیوی کا کچھ لگو اور خدمت گار تھا عورت مرد پر حکومت کرتی تھی۔ اس کے بعد، حکومت مرد کے ہاتھ آئی، مرد، دوسرے قبیلے سے عورت اٹھالتے تھے۔ تیسرا دور وہ آیا جب لڑکا منگیتر کے گھر جاتا، باپ مل کر بات کرتا اور منظوری کی صورت میں یہ لڑکا خدمت گاری بجاتا اور محنت مزدوری کر کے ہونے والے سسرے کو راننی کرتا تھا۔ چوتھا مرحلہ وہ تھا جہاں مرد، ایک مہینے رقم پیش کش کے طور پر لڑکی کے باپ کو دیتا تھا، یہاں سے ”مہر کا سلسلہ شروع ہوا۔

کہتے ہیں، مرد نے جب ”ماں کی حکومت“ کا دور ختم کر کے ”پدر شاہی“ کا عہد شروع کیا تو عورت کم از کم، مزدور بنائی گئی، اسے ایک اقتصادی ذریعہ سمجھ لیا گیا، اس سے کبھی کبھی جنسی تسکین بھی حاصل کی جاتی تھی۔ اس نے عورت کو معاشرتی و اقتصادی آزادی نہیں دی اس کی محنت مزدوری کا ثمر، باپ یا شوہر کو ملتا تھا۔

- عورت اپنی پسند سے شوہر نہیں چن سکتی تھی۔
- عورت خود مختار اقتصادی و مالی حیثیت کی مالک نہ تھی۔

دراصل مہر جیسی چیز اور نان و نفقہ کے نام سے جو اخراجات ہوتے تھے اس کے صلے میں بیوی سے یک جانی کے زمانے تک جو محنت مزدوری لیتا تھا اس کا عوض نہ تھا۔

انسانی معاشرے کی ترقی کا پانچواں دور جسے علوم معاشرہ کے ماہرین

مہر۔ نظام قانون اسلامی میں

نے فراموش کر دیا اور اہل نظر خاموش گذر گئے۔ یعنی وہ دور جب شادی کے وقت اپنی طرف سے براہ راست عورت کو کچھ ”پیش کش“ کرنے لگا۔ لڑکی کے ماں، باپ اس ”پیش کش“ پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ عورت پیش کش قبول کرتے ہی اپنی معاشرتی

۱۔ اقتصادی آزادی محفوظ کر لیتی ہے۔

اولاً: وہ اپنا شوہر خود اپنے ارادے سے منتخب کرتی ہے، ماں اور باپ کے ارادے سے نہیں۔

ثانیاً: جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر چلے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

مرد، عورت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں فقط یہ حق رکھتا ہے کہ رشتے کی مدت میں اس کے وسائل سے بہرہ مند ہو۔ اس پر ذمہ داری ہے کہ جب تک رشتہ ازدواج باقی ہے اس سے وسائل کرتا رہے اور اس کی زندگی کی نگہداشت رکھے۔

اس نظام کو قرآن نے قبول کیا ہے۔ اس نے شادی کی اساس یہی مانی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد آیتیں بتاتی ہیں کہ مہر۔ عورت کا مال ہے کسی کا اس پر حق نہیں۔ مرد کو شادی کی پوری مدت تک بیوی کے اخراجات کی ذمہ داری پوری کرنا ہوگی اس زمانے میں محنت مزدوری کام کاج کر کے جو کچھ کھائے وہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ باپ یا شوہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں پہنچ کر ”مہر و نفقہ“ معائنہ جاتا ہے۔ جب مہر، باپ کی ملکیت ہوتا تھا، اس وقت لڑکی اپنے شوہر کے گھر میں لونڈی کے طور پر آتی اور شوہر اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس وقت مہر کا فلسفہ تھا، باپ لڑکی کی خرید و ضروری اخراجات نان و نفقہ کا فلسفہ تھا وہ اخراجات جو ہر مالک اپنی مملوکہ چیز پر کیا کرتا ہے۔ یہ صورت کہ باپ کو کچھ نہ دیا جائے، شوہر کو استثمار کا حق نہ ہو، بیوی سے اقتصادی فوائد نہیں لے سکتا بیوی، اقتصادی پہلو سے مکمل طور سے آزاد ہے۔ اسے حقوق کے لحاظ سے بھی کسی

مسمومت "سربراہی و سرپرستی و اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر مہر دینا اور مان
بلفقہ ادا کرنا کیا ہے؟

تاریخ پر ایک نظر: | پانچویں مرحلے میں "مہر و مان و نفقہ" کے فلسفے کی چھان

کے وقت ہمیں گزشتہ چار دوروں پر تھوڑی توجہ
دینا ہوگی۔ دراصل اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غیر یقینی مفروضے اور تخمینے
پر مبنی ہیں۔ وہ تاریخی حقائق ہیں نہ علم و تجربہ کے نتائج۔ قبل از تاریخ انسانی زندگی کے
بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے ان کی بنیاد کچھ علامات و قرائن ہیں اور کچھ فلسفیانہ مفروضے
اس کے انسان اور کائنات پر گفتگو کی جاتی ہے۔

"مادر شاہی"۔ ماں کی حکومت کا عہد۔ ایک اصطلاح ہے، اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا
ہے وہ آنکھیں بند کر کے تو ماننے والی باتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح باپ کا لڑکیاں بیچنا، یا
خوشروں کا عورت سے ناجائز فوائد حاصل کرنا ان کا استثمار، جلدی مانی جانے والی
چیز تو نہیں ہے۔

ان اندازوں اور مفروضوں کے اندر دو چیزوں پر نظر جمتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے
کہ پوشش ثابت کیا گیا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان حد سے زیادہ سخت دل اور درست
نہ تھا، احساسات انسانی تو تھے ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ فطرت اپنے مقاصد
حاصل کرتے کے لیے جو حیرت انگیز تدابیر اختیار کرتی ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس قسم کی تشریح اور اس طرح کے نظریے، انسان و فطرت کے بارے میں اہل مغرب
پر یسے تو ممکن ہیں، لیکن اہل مشرق کے لیے۔ اگر ان پر مغرب کا جادو نہ چل گیا ہو۔
تو یسے نہیں۔ یورپ میں خاص اسباب کی وجہ سے انسانی جذبات سے بیگانہ ہے۔ وہ مجبور
ہے اس سے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنیادی تاریخ میں جذبات اور انسانیت کی جھلکیاں
دیکھے اور مانے۔ وہ تو اگر اقتصادیات کے مسائل چھوڑ کر اٹھتا ہے تو روٹی دیکھتا ہے

اس کی نظر میں تاریخ مشین کا نام ہے جب اسے کچھ کھانے کو نہ دیا جائے (فیڈ نہ کیا جائے) پچھلے ہی گئی نہیں۔ اگر جنسی مسائل کے گیسر میں گیا تو انسانیت و تاریخ بشریت اپنے تمام ثقافتی و صنعتی، اخلاقی و مذہبی، تجلیوں اور روحانی جاہ و جلال سمیت صرف جنس کی بدلتی صورتوں میں کھیل کھلونے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اور اگر سرداری اور بڑی کے گیسر میں جڑ گیا تو سرگزشت بشریت ان کے نزدیک کیسر، خون ریزی و بے رحمی ہے۔ اہل مغرب گزشتہ و سبھی عہد میں مذہب اور مذہب کے نام پوواؤں کے ہاتھوں بڑے شکنجے میں رہے، بہت دکھا اٹھائے زندہ آگ میں ڈالے گئے راسی وجہ سے لوگ خدا اور مذہب، بلکہ اس کی پورے کھنے والی چیز سے بھی ڈرتے ہیں۔ چنانچہ تمام علمی علامات و آثار دیکھنے کے باوجود طبیعت کے ہا مقصد ہونے اور کائنات کے لیے ایک مدبر ہونے کا اعتراف یا "علت عالی" کے وجود کا اقرار کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔

ہم ان تئیں سے یہ نہیں چاہتے کہ پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے پیغمبران خدا کو مان لیں ان پیغمبروں کے عدالت و انسانیت کا لغو بند کیا، انحرافات کا مقابلہ کیا، ان مقابلوں کے اچھے نتائج حاصل کیے، ہم یہ منوانا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا تو ضرور چاہتے ہیں کہ یہ لوگ کم از کم طبیعت کے باخبرانہ و آگاہانہ اثر کو نظر انداز نہ کریں۔

تعلقات مرد و زن کی تاریخ میں یقیناً بہت ظلم اور بڑی بے رحمیاں ہوئی ہوں گی۔ قرآن مجید نے اس بے رحمی کی بدترین مثالیں بھی بیاں کی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سراسر تاریخ میں قسوت اور سختی کا انداز ہی رہا۔

ہمارے عقیدے میں، "مہر، ایک ماہرانہ تدبیر" کا نتیجہ ہے۔ **مہر کا حقیقی فلسفہ :** آغاز فطرت و تخلیق سے زن و مرد کے روابط اور ان کے رشتے کو زیادہ مستحکم کرنے کے واسطے "مہر" ایجاد کیا گیا۔

اصل خلقت میں زن و مرد کا مسئلہ عشق الگ الگ ہے عورت کا عشق کچھ اور مرد کا

کا ہے اور مرد کا کچھ اور۔ مہر۔ کی ضرورت و ایجاد اسی مرحلے میں ہوئی۔
 صوفی، اس قانون کی پوری ہستی میں کارفرما مانتے ہیں۔ ان کا تو عقیدہ ہے کہ عشق و جذبہ
 و انجذاب تمام موجودات و مخلوقات پر حکمران ہے، خصوصیت یہ ہے کہ موجودات میں سے
 ہر ایک کا کام الگ ہے ذمہ داری الگ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے مقام میں فرق ہے۔ ایک
 جگہ سوز سے ایک کے لیے ساز، فخر الدین عرقانی نے کہا:

سازِ طرب عشق کہ داند کہ چہ است؟ عشق کے طرب انگین ساز کو کوئی کیا جانے
 گز زخمِ آن نہ فلک اندر تگے و تاز است بس مختصر ہے کہ اس کے زخمے کی چھیڑنے تو
 آسمان رواں کر رکھے ہیں۔

رازیّت دریں پردہ کہ گران راہ شناسی اس پردے کے پیچھے ایک راز ہے اگر وہ راز
 دانی کہ حقیقتِ نچہ در بندہ مجاز است معلوم ہو جائے تو سمجھ میں آئے گا کہ حقیقت کو
 مجاز کا پابند کیوں رکھا گیا ہے۔

عشق است کہ ہر دم بدگر رنگ در آید عشق ہر آن سے رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔
 نماز است بجائی و بیکٹائی نیاز است وہی ایک جگہ ناز اور دوسری جگہ نیاز نظر آتا ہے۔

در صورتِ عاشق چہ در آید ہمہ سوز است عاشق کے سراپا میں جو کچھ سمایا ہوا ہے
 در کوتِ معشوق چہ آید ہمہ نیاز است وہ "سوز" ہے اور معشوق کے لباس میں
 "ساز" ہی ساز ہے۔

زن و مرد کے اختلاف پر گفتگو کے دوران (گذشتہ صفحات میں ملاحظہ ہو) ہم نے
 کہا ہے زن و مرد کے جذبات کی نوعیت اور ایک دوسرے کے بارے میں احساسات
 ایک طرح کے نہیں ہیں۔ قانونِ تخلیق نے حسن و غرور و بے نیازی، عورت کے حصے
 میں۔ اور۔ نیاز مندی و طلب، عشق و تغزل مرد کے حصے میں رکھا۔ اسی تقسیم کی وجہ عورت

کے کمزور پہلو کی تلافی مرد کی بدنی قوت سے ہوگئی۔ ترازو کے پلے برابر ہو گئے جب ہی تو مرد طلب کے لیے عورت کے دروازے پر جاتا ہے۔ معاشرہ شناس ماہرین کے تادہ شاہی "عہد میں بلکہ "پدر شاہی" دور میں بھی یہی دیکھا اور بتایا گیا ہے کہ مرد نے عورت کے گھر جا کر رشتہ مانگا ہے۔

دانشور حضرات کہتے ہیں :

مرد، عورت سے زیادہ شہوانی ہے۔ اسلامی روایت میں اس کے برعکس ہے۔ لیکن عورت بہ نسبت مرد کے جنسی خواہش پر زیادہ قابو رکھتی ہے۔ وہ زیادہ خود دار پیدا ہوئی ہے۔ دونوں باتوں کا نتیجہ ایک ہے یعنی بہر حال مرد اپنے خیمہ کے مقابلے میں عورت کی بہ نسبت زیادہ کمزور ہے۔ اس خصوصیت نے عورت کو موقع دیا ہے کہ مرد کے پیچھے بھاگنے سے بچے اور آسانی سے اس کے قابو میں نہ آئے، اس کے برخلاف، مرد کو فطرت مجبور کرتی ہے کہ عورت سے نیاز مندی کا اظہار کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع استعمال کرے، ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ جو اس کی رضا اور رفاقت حیات پر آمادگی کی راہ ہوا کرتا ہے وہ ہے "بہرہ" جو اس پر نثار کیا جائے۔

جنس نر کے افراد، رفاقت کے لیے افراد جنس مادہ کا تعاقب کیوں کرتے اور باہم رفاقت کیوں رکھتے ہیں؟ کیوں آپس میں لڑتے اور خون ریزی کرتے ہیں؟ اس کے مقابلے میں جنس مادہ نے لالچ، حرص اور نر کے ساتھ رفاقت کے لیے از خود رفتگی ظاہر نہیں کی۔ اس کا سبب دونوں جنسوں کے فطری تقاضے مختلف ہیں ایک نہیں ہیں۔ نر میں ہمیشہ "تقاضا و طلب کا جذبہ رہتا ہے جنس مادہ میں یہ جذبہ نہیں ہے۔ جنس مادہ نر کے لالچ اور از خود رفتگی کو دیکھ کر اس کے پیچھے نہیں دوڑی بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور بے خیالی کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

مہر کا حیا اور عورت کی پاک دامن سے گہرا رشتہ ہے۔ عورت اپنے فطری الہام

یہ جان چکی ہے کہ اس کی عزت و حرمت اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے سس گھر کے لئے اختیار نہ دے دے۔۔۔۔۔

اسی اسباب ہیں کہ عورت باوجود جسمانی نزاکت کے مرد کو درخواست گزار کے لئے آستانے پر کھینچ بلاتی ہے۔ مردوں کو رقابت میں برسرِ پیکار کھڑا کرتی، اور مردوں اور عشق کے بہانے مرد کے پنجے سے نکل جاتی ہے۔ کتنے مجنون ہیں جو لیلاداس کے کچھ سرگرداں ہیں، اور وہ اس وقت تک کسی سے رفاقت کا بندھن نہیں باندھتی کہ کسی کو اتھاپتے دامن تک نہیں آنے دیتی جب تک اس سے عطیہ و پیش کش صداقت و سچائی کی سندیں حاصل نہ کر لے۔

کہتے ہیں، کچھ وحشی قبیلوں میں یہ دستور تھا کہ جو لڑکی کئی امیدواروں اور عاشقان سے فرار سے دوچار ہوتی وہ ”ڈول“ کا پیام بھیجتی تھی۔ وہ رقیب آمنے سامنے زور سے کہتی کرتے جو شخص موت یا شکست سے بچ جاتا تھا وہی اس لڑکی کے شوہر بننے کی اہلیت رکھتا تھا۔

کچھ روز ہوئے کہ تہران کے روزناموں میں خبر چھپی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے دو سنگاروں سے ”ڈول“ کو کہا۔ وہ دونوں اس کے سامنے چھری بنجر لے کر ایک دوسرے سے چپٹ پڑے۔

جن کی نظر میں قوت فقط زور بازو کا نام ہے اور زن و مرد کے رشتے شروع سے عورت پر ظلم اور استعمار مرد پر منحصر ہے۔ یہ لوگ باور نہیں کر سکتے کہ عورت و نازک جنس بھی درشت و سخت گیر مرد کو یوں ایک مرد کے خون کا پیاسا بنا سکتی ہیں، جو شخص عورت کی تخلیق میں ماہرانہ تدبیریں اور عجیب عجیب نسوانی قوتیں کار میں دیکھ سکتا ہے اسے معلوم ہے اسے باور آئے گا کہ بے شک وجود زن میں نہ ہرگز چپا رکھی ہیں اور ایسے امور عجیب نہیں ہیں۔

عورت، مرد پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ عورت کی مرد پر اثر آفرینی مرد کے اثرات سے زیادہ ہے۔ ہنر مرد کی نمود، اس کی دلاوری و بہادری اس کی شخصیت کا ابھار اور بڑا پن بہت کچھ عورت کی خوبصورت خود داری و ہمت افزائی اس کی پاک دامنی و حیا کی بدولت ہے۔ مرد کی بڑائی عورت کی گراں بہا ہونے کی حیثیت ہے۔ ہمیشہ عورت نے مرد کا کردار بنایا ہے وہ مرد جس کا معاشرے سے تعلق ہے اور جب پاک دامنی و حیا اور خود داری، عورت سے الگ ہو جاتی ہے اور عورت جب بھی مرد کے کردار کا مظاہرہ کرتی ہے تو سب پہلے تو وہ اپنا مہر کا استعلا غلط کرتی ہے۔ پھر سرد اپنی مردانگی بھول جاتا ہے اور معاشرہ کا ایوان ڈھ جاتا ہے۔

عورت کی وہ قوت جو پوری تاریخ میں اپنی شخصیت کو محفوظ رکھ سکی، اور مرد کے پیچھے دوڑنے سے روکتی رہی اور مرد کو اپنے آستانے پر طلب گار کی حیثیت سے طلب کرتی رہی جس نے اپنی خاص مردوں کو رقابت و جنگ میں ابھایا، وہ مقابلے میں جان کی بازی لگا چکے حیا اور شفقت کو اپنا کردار بنائے، اپنا بدن لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے اور اپنے تئیں پر اسرار بنا کر رکھے۔ سرد کو الہام اور اس میں شفق کو جنم دے۔ اسے شجاعت و ہنرمندی میں شخصیت کے درجے پر پہنچائے، مرد میں غزل کا جذبہ، خاکساری و ناجائزی کا احساس پیدا کرنے کے پتے سامنے بھٹکائے۔ اس عالم میں مرد کو خوشی بھی ہو۔ عورت کی یہی قوت سرد کو تادی کے وقت مہر کے نام سے عطیہ و ہدیہ پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ مہر، وہ عمومی آئین کی قانونی شق ہے جس کی تحریر تین تخلیق میں قلم قدرت نے فطرت کے قلم سے لکھوائی ہے۔

ہم نے کہا ہے کہ سماج کے پانچویں دور میں مہر کی ایک شکل ابھی کر سامنے آئی، یہ صورت فطرت کی ایجاد ہے، قرآن مجید نے سماجی آلودگیوں سے اسے پاک صاف کر کے فطرت کا صحیح روپ نکھار دیا، قرآن کریم

قرآن میں مہر

ی بے مثال لطافت و خوش اسلوبی کے انداز میں کہتا ہے:

وَأَلْقَى النِّسَاءَ صَدَقَاتٍ مِّنْ نَّحْلَةٍ (النساء ۴۴)

یعنی عورتوں کا مہر جو انھیں کا ہے دباپ یا بھائی کا اس سے کوئی تعلق نہیں (عطیہ و پیش کش کے طور پر خود ان کو دے دو۔

قرآن مجید نے اس چھوٹے سے جملے میں تین نکتوں کی طرف اشارے کیے ہیں:

۱۔ مہر کو مہر کے بجائے ”صَدَقَہ“ (دال پر پیش) کے نام سے یاد کیا۔ صَدَقَہ کا دہ۔ صدق۔ ہے۔ مہر کو صَدَقَہ اس لیے کہا کہ وہ مرد کے رشتے کو سچا قرار دیتا ہے شاف کے تفسیر نگار (زمخشری) جیسے حضرات نے اس نکتے کی تشریح کی ہے۔ اور رغب عثمانی کے بقول (مفردات الفاظ القرآن) ”صَدَقَہ“ (دال پر زبر) کو صَدَقَہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایمان کی دلیل ہے۔

۲۔ صدقات ”هن“ میں ضمیر کے الحاق نے یہ اشارہ کیا ہے کہ ”مہر“ براہ راست عورت کو ملتا ہے۔ ماں باپ کا کوئی حصہ نہیں کہ انھوں نے دودھ پلایا، پالا پوسا، بڑا کیا لہذا یہ بچہ کا عوضانہ ہو۔ نہیں۔

۳۔ آیت میں ”نَحْلَہ“ سے مزید توضیح ہو گئی کہ مہر صدیہ اور پیش کش کے علاوہ کوئی چیز نہیں قبول کر سکتا۔

حیوانات میں احساسات کا فرق

انسان ہی نہیں، تمام جانداروں میں جہاں بھی روحانی کا عمل موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ جنسِ نر میں نیاز مندی زیادہ ہے۔ اس کے خیالات و احساسات میں نیاز مندانہ رجحان زیادہ ہے اسی وجہ سے وہ اپنی ضرورت کے لئے مادہ کی خوشی اور رضا مندی حاصل کرنے کی خاطر آگے بڑھے۔ اسی بنیاد پر دونوں جنس کے تعلقات میں برابری ہو۔ جنسِ نر اپنی طاقت و قوت کی وجہ سے غلط فائدہ

نہ اٹھانے پائے لے عاجزی و فروتنی میں رہنا چاہیے۔

غیر شرعی شادیوں میں بدیہ اور کھنے: شرعی طور پر ہونے والی شادیوں کے خاص ربط نہیں غیر شرعی شادیوں

میں بھی، جہاں ایک دوسرے کے وجود سے آزاد و لطف اندوزی اور آزاد و عشق بازی کی جاتی ہے۔ وہاں بھی مرد کو ایک بدیہ نذر کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے اگر کہیں چائے، کافی یا کھانے کو دل چاہے تو ہوٹل کا بل مرد کو ادا کرنا فرض ہے۔ مرد کے لیے عورت پیسے خرچ کرے تو مرد اپنے لیے ایک فہم کی توہین سمجھتا ہے۔ لڑکے کی عیش پرستی کے لیے امکانات اور دولت ہونا ضروری ہے۔ عورت کی عیش پرستی بدیوں اور تحفوں کے جمع کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ غیر قانونی اور ناجائز روابط ظن و مرد میں یہ رسم موجود ہے۔ اس کی بنیاد زن و مرد کے غیر مشابہ جذبات میں۔

فرنگی کا عشق اس کی شادی سے بہتر ہے: مغربی دنیا میں، جہاں "حقوق انسانی" کی بڑا بڑی کا نام لے کر

"گھریلو زندگی" کے حقوق کو فطری طور طریقوں سے دور کر دیا گیا ہے۔ جہاں قانون فطر کے خلاف کوشش جاری ہے کہ زن و مرد کو ایک دوسرے کا مشابہ بنا دیا جائے۔ اور گھریلو زندگی میں بیوی اور شوہر کو برابر کا مشابہ کردار اپنانا ہوگا۔ جہاں، عشق کا آزاد قدم گھڑیں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود، زن و مرد کے مقررہ قوانین فطرت اپنی رفتار سے باہر نہیں جاسکے وہاں اب بھی مرد اپنا فطری فریضہ ادا کرتا ہے یعنی اظہار نیاز، طلب و درخواست، دولت بچھاؤ کرنا، دولت نذر کرنا۔ عورت کو بدیہ پیش کرنا، بلکہ اس کے اخراجات برداشت کرنا۔ آج بھی یورپ میں رائج ہے۔

فرنگی شادی میں مہر کا وجود نہیں ہے۔ نفقہ و اخراجات کا بوجھ بیوی کو اٹھانا پڑتا ہے یعنی فرنگی معاشرہ، فرنگی شادی سے فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

مہر۔ ایک مثال ہے جو ہمیں اس گہرائی تک پہنچاتی ہے کہ زن و مرد غیر مشابہ انداز
میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور قانونِ تخلیق نے فطری و طبیعی صلاحیتوں کے لیے غیر مشابہ و متاثر
کے اسے ہتھوں میں دے دی ہے۔

مہر اور نفقہ (۲)

گزشتہ فصل میں مہر کی ایجاد کا فلسفہ اور اس کی علت کا بیان ہم نے کیا ہے اور بتایا کہ مہر کی ایجاد کا سبب دونوں جنسوں کے رشتے قانون تخلیق کے ہاتھوں دو الگ الگ ذمہ داریوں کا باعث ہیں یہ بھی آپ جان چکے کہ مہر "مرد کے نرم اور محبت آمیز جذبات کی پیداوار ہے۔ سخت اور مالکانہ احساسات کا اس میں دخل نہیں۔ عورتوں کی طرف سے جو جس زیادہ اثر ڈالتی ہے وہ اس کی خاص خود داری ہے یہاں اس کی کمزوری یا ارادے کی ناپختگی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مہر قانون تخلیق کی طرف سے عورت کی قدر بڑھانے کے لیے اور اسے ایک بند درجہ دینے کے لیے ہے۔ "مہر" عورت کو شخصیت عطا کرتا ہے "مہر" کی حقیقی قیمت عورت کی نظر میں اس کی مادی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔

جاہلیت کے رسم و رواج
اسلام نے منسوخ کر دیے

قرآن مجید نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی
رسمیں منسوخ کر دیں اور اسے اپنی پہلی اور فطری
حالت میں بحال کر دیا۔

جاہلیت میں ماں باپ مہر کو حق زحمت اور اپنا حق "شیر بہا" جانتے تھے۔ تفسیر کشاف
وغیرہ میں لکھا ہے کہ عرب میں لڑکی کی ولادت پر مبارک باد دینے والے کہتے تھے ہنیئاً لک

لے "شیر بہا" وہ رقم ہے جو دولہا لڑکی کے والدین کو پیش کرتا ہے۔ یعنی "دودھ کی قیمت" یہ رسم اب بھی عراق اور دوسرے
علاقوں میں بطور رسم جاری ہے۔

ابو القاسم محمود بن عمر، جابر اللہ زبختی متوفی ۵۳۸ھ جن کی تفسیر کا نام "الکشاف من حقائق التفسیر" ویموان الاقادیل فی وجوہ
التاویل" یہ عربی تفسیر جڑی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور الکشاف کے نام سے مشہور ہے۔

”سنا فجہ“۔ یعنی۔ انفرائش دولت کی اساس مبارک ہو۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ خدا کے
پس لڑکی کو بیاہیں اور اس کا مہر پائیں۔

جامیت میں، باپ و دہ نہ بول تو بھائی، چونکہ ولی ہونے کے دعویدار تھے، تیمومت
در سر ہائی کہ حق انھیں حاصل ہوتا تھا۔ لہذا وہ اپنی پسند کا شوہر لاتے تھے، لڑکی کی رائے ضروری
نہ تھی۔ اسی طرح مہر خود دیتے تھے، لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ترکیوں کا تباہ کر رہے تھے
یعنی ایک مرد دوسرے مرد سے کہتا تھا وہ اپنی لڑکی یا بہن دیتا ہے بشرطیکہ فرقی مقابلس بھیجی
لڑکی یا بہن اس کے ازدواج میں دے۔ اس طرح ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پاتی تھی
اور یہ مہر باپ یا بھائی دیتے تھے۔ اس طریقہ ازدواج کو نکاح شغار کا نام دیا گیا ہے۔

اسلام نے اس رسم کو منوخ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کاشغار فی الاسلام اسلام میں لڑکی یا بہن کا عوض معاوضہ ممنوع ہے۔

اسلامی روایات کے مطابق صرف یہی نہیں کہ باپ کو مہر پر کوئی دست رسی نہیں
بلکہ اگر شادی کے شرائط میں مہر کے علاوہ کوئی چیز مان لی جائے (زمین دی جائے گی یا کچھ
دوسرے) تو اس میں باپ حق دار و حصہ دار نہیں ہوگا۔

اسلام نے وہ رسم منوخ کر دی جس میں داماد اپنے خسر کی خدمت کرتا تھا۔ معاشرہ شناس
علمائے نزدیک یہ اس دور میں ہوتا تھا جب انسان کو نقد بنادے کا علم نہ تھا۔

داماد، اپنے خسر کی خدمت فقط اسی لیے نہیں کرتے تھے کہ باپ اپنی لڑکی کے رشتے
سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، بلکہ اس کے اور اسباب بھی تھے اور ان میں بسا اوقات تمدن
کے رتقا کا بھی دخل ہوتا تھا۔ اور بجائے خود ظالمانہ انداز نہ تھا۔ بہر حال قطعی طور پر
دنیا میں یہ رسم موجود تھی۔

واقعہ موسیٰ اور شعیب، علی نبیا وعلیہما السلام قرآن مجید میں موجود ہے اس کے ذکر بالا

۱۔ پھر واقعہ موسیٰ اور شعیب، علی نبیا وعلیہما السلام قرآن مجید میں موجود ہے اس کے ذکر بالا

رسم کے وجود کا سراغ ملتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام بمصر سے نکلتے وقت "مدین" کے کنوئیں پر پہنچے، اس وقت شعیب علیہ السلام کی لڑکیاں اپنی بھیڑیں لیے ذرا دور کھڑی تھیں، کسی کو ان کی باری کا خیال نہ تھا، موسیٰ کو رحم آیا، انہوں نے ان لڑکیوں کی بھیڑ بکریوں کے پینے کے لیے پانی کھینچا اور انھیں سیراب کیا۔ لڑکیاں باپ کے پاس آئیں، اور قصہ بیان کیا، شعیب نے آدمی بھیج کر موسیٰ کو اپنے گھر بلایا، ایک دوسرے تعارف ہوا۔ ایک دن شعیب نبی نے موسیٰ سے کہا، میں اپنی دو لڑکیوں میں سے ایک کی تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں، مگر تمھیں آٹھ سال میرے یہاں کام کرنا ہوگا، پھر اگر تمہارا دل چاہے تو مزید دو سال اور کام کرنا۔ یعنی دس سال تک۔ حضرت موسیٰ نے بات مان لی، اور وہ حضرت شعیب کے داماد بن گئے۔ یہ رسم اس زمانے میں بہر حال تھی۔ اس کی بنیاد دو باتوں پر نظر آتی ہے۔

- ۱۔ سرمایہ نہ ہونا۔ داماد اپنے خسر یا بیوی کی جو خدمت کر سکتا تھا وہ کرتا تھا۔
- ۲۔ جہیز دینا۔ علم معاشرہ کے ماہر سمجھتے ہیں کہ جہیز کی رسم یعنی لڑکی کی طرف سے باپ کا کچھ ساز و سامان دینا پرانے زمانے سے چلا آتا تھا۔ اس ضمن میں داماد کو بطور اجیر کے لے لیتا یا اس سے کچھ مال وصول کرتا۔ عملی طور پر باپ جو کچھ داماد سے لیتا وہ لڑکی کے مفاد اور لڑکے کام کے لیے ہوتا تھا۔

اسلام نے یہ آئین ختم کر دیا۔ خسر، مہر کو اپنا مال نہیں سمجھ سکتا، خواہ اس کا یہ ارادہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس مال کو لڑکی کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ حق فقط لڑکی ہی کو ہے جسے اپنے مال کا اختیار ہے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اسلامی روایات میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اس طرح مہر مقرر کرنا درست نہیں۔

جاہلیت میں ایک اور رسم تھی جو عملاً لڑکی کو مہر سے محروم کر دیتی تھی۔ دستور تھا کہ مرنے والے کے ترکے میں اس کی بیوی بھی شمار ہوتی تھی۔ جب کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کے وارث مثلاً اولاد یا بھائی جیسے مرنے والے کے سرمایے سے ترکہ لیتے اور مالک بنتے، اسی طرح

اس بیوی کی زوجیت بھی ترکے میں پاتے مرنے والے کا لڑکا یا بھائی اس کا مختار ہوتا اور جسے چاہتا وہ عورت نکاح میں دیتا اور مہر کا خود مالک بنتا۔ یا نیا مہر مقرر کیے بغیر اپنی بیوی قرار دے لیتا تھا۔

قرآن کریم نے زوجیت کی میراث کا دستور منسوخ کر دیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا
 بَغْمِمْ وَأَوْ قُرْآنٍ بِإِيمَانٍ لَانِ وَالْوَالِدُ يَأْذُرُكُمْ تَحْهَارَ سَ لِيَّ جَائِزٌ هُنَّ كَرِهَ لِيَّ
 مَوْرَثُوكِ بِيُورِ يُولُوكِ مِيرَاثُ بَنَاءُ، دَرَا لِيَّ مَالِ كَرِهَ لِيَّ وَهُ عَوْرَتِي تَحْهَارَ رِيَّ بِيُورِ
 زَبْنَا چاہیں۔

قرآن کریم کی دوسری آیت میں کلی طور پر باپ کی بیوی سے شادی پر پابندی لگا دی گئی ہے خواہ وہ میراث کے طور پر نہ بھی ہو۔ آزادانہ اور رضامندی سے کرنا چاہیں، جب بھی حکم ہے کہ:

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ
 جن سے تمہارے باپ شادی کر چکے ان سے تم نکاح نہ کرنا۔

جو رسم بھی عورتوں کے حق مہر کو نقصان پہنچاتی تھی اسے قرآن مجید نے ختم کیا۔ ان میں سے ایک وہ موقع جب آدمی کا دل ایک عورت سے بھر جاتا تھا، توجہ نہ رہتی تھی، تو وہ شخص بیوی پر تنگی اور سختی کرتا طلاق پر تیار کیسے دیے ہوئے مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر واپس مانگتا تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا:

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ
 یعنی عورتوں کو کچھ دیا مال مہر واپس لینے کی خاطر تنگ نہ کرو۔

ایک رسم یہ بھی تھی کہ آدمی کبھی بھاری مہر دے کر شادی کرتا پھر عورت سے دل سیر ہو جاتا

تو بیچا چھڑنے اور نئی شادی رچانے کی خاطر دیا ہوا بھاری مہر واپس لینے کی فکر میں عورت پر بھتان باندھنا اس کی آبرو پر داغ لگانا اور یہ بتانا تھا کہ عورت پہلے ہی سے شادی کے لائق نہ تھی اس کا نکاح منسوخ ہونا اور میرا مہر واپس ملنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس رسم کو بھی منسوخ کر دیا۔

مہر کا نظام خاص اسلام کا نظام ہے

دین اسلام کے مسلمات میں ایک بات ہے کہ مرد، عورت کے مال اور کاروبار سے سروکار نہ رکھے۔ وہ بیوی کو کام کرنے کا حکم نہیں دے سکتا کہ یہ کام میرے لیے کرو وہ نہ کرو۔ اگر عورت

کوئی ایسا کام کرے جس سے اسے پیسہ حاصل ہو تو مرد کو عورت کی مرضی حاصل کیے اس ریت میں تصرف کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس محبت سے مرد و زن میں برابری ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک مسیحی رسم اس کے برخلاف تھی۔

اسلام کی نظر میں شوہر و بیوی اپنے حقوق معاملات میں شوہر کی سرپرستی سے آزاد ہے، وہ اپنے کاروبار خود کر سکتی ہے۔ عین اس اقتصادی آزادی کی صورت حال میں بھی جبکہ اسلام نے شوہر کو مال اور کاروبار زوجہ پر حق نہیں دیا۔ مہر کی معافی نہیں کی، یہ حکم بجائے خود بتاتا ہے کہ مہر، اسلام کی نظر میں اس لیے نہیں ہے کہ مرد کچھ عرصے بعد عورت کی ذات سے مالی فائدہ اٹھائے اور اس کی جسمانی قوت کا استعمار کرے۔ اسی وجہ سے اسلام کا نظام مہر اس کے خصوصیات سے ہے۔ مہر کے اس سسٹم کو دوسرے نظام اور فلسفے سے مخلوط نہ کرنا چاہیے جو اعتراضات و دلائل ہوتے ہیں اسلام کے نظام مہر پر نہیں ہو سکتے۔

آئین فطرت

ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید نے مہر کو ”مخلد“ عقیلہ کہا ہے۔ قرآن نے اس عقیلہ و پیش کش کو لازمی کر دیا۔ قرآن نے بڑی باریک بینی

سے فطرت کی گہرائیوں کو پیش نظر رکھا۔ زن و مرد کے فاسد رویوں کے بارے میں جو فطرت نے دونوں میں چھپا رکھے ہیں، اسلام نے دوستی کا رشتہ برقرار رکھنے کے سٹے مخلوط رکھتے ہوئے مہر کو نظر انداز نہ کرنے کی تاکید کی۔ عورت کا رویہ، مرد کی محبت کا شکریہ

ہونا چاہیے۔ عورت کی محبت ہی اچھی ہے اس کے رد عمل میں مرد کی محبت ہوگی ابتدا میں نہیں۔ (دیکھئے)۔ عشق میں عورت کی پہل۔ یعنی جو عشق عورت کی طرف سے شروع ہوا اور مرد کی درخواست ابتدا کی شریک نہ ہو وہ ہمیشہ شکست پاتا ہے اور عورت کی شخصیت پر مر جاتی ہے۔ اس کے برخلاف عورت کا جو عشق مرد کی محبت کے جواب میں ہو، ایسا عشق نہ خود ناکام ہوتا ہے نہ عورت کی شخصیت کو نقصان و شکست دے دیا کرتا ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عورت بے وفا ہوتی ہے؟ عورت کی محبت کمزور ہوتی ہے؟ عورت کے عشق پر اعتبار نہ کرنا چاہیے؟

یہ بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی سچ ہے، اگر عشق کی ابتدا عورت کی طرف سے ہو۔ اگر کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جائے، کسی کو دل دے دے تو عشق کی آگ جلدی بجھ جاتی ہے۔ ایسے عشق پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ جھوٹ ہونے کی صورت وہ ہے جہاں عورت کے دل میں آگ بڑھ سکے اور عشق بطور عشق مرد کے رد عمل میں شعلہ فشاں ہو۔ مرد کے عشق صادق کے جواب میں جذبہ محبت عورت کے دل میں بیدار ہوا ہو۔ عشق عملاً نسج ہو جائے، بعید از حقیقت ہے۔ ہاں، مرد کا عشق ٹھنڈا ہونے لگے تو عورت کا جذبہ عشق بھی تمام ہو جائے گا، عورت کا فطری عشق اس نوع کا ہوتا ہے۔

عورت کی وفائی کی شہرت نوع اول (پہلی قسم) کی محبت و عشق سے متعلق ہے۔ اور جہاں عورت کی وفاداری مشہور ہے وہ عشق کی دوسری قسم سے وابستہ ہے۔ معاشرے کو اگر زن و شوہر کے رشتے میں مضبوطی کی ضرورت ہے تو وہ ایسے راستہ پر چلنے کے لیے مجبور ہے جو قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔ یعنی قوانین فطرت کی نگہداشت۔ جس میں ایک مسئلہ محبت میں زن و مرد کا فطری رویہ ہے۔ اس رویہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ قانون مہر بھی فطرت کے ہم نوا ہے۔ مہر، زمین ہوا کرتا ہے وہ نشانی ہے کہ عشق و محبت مرد کی طرف سے شروع ہوئی ہے، عورت اس محبت کی جوابدہ ہے اور مرد نے اس کے احترام میں ایک ہدیہ شمار کیا

ہذا قانون مہر کو۔ جو کئی و مجموعی آئین اساسی کی دفعہ ہے۔ اور خالقِ فطرت کی طرف سے تدوین یافتہ ہے۔ حقوقِ مرد و زن کی برابری کا بہانہ بنا کر کا اعدام قرار دینا غلط ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن نے مہر کے سلسلے میں، جاہلیت کے رسم و رواج کو اس عہد کے مردوں کی خواہش کے باوجود بدل دیا۔ قرآن مجید میں مہر کے بارے میں جو کچھ ہے وہ جاہلیت کی رسم نہیں تھی جو ہم یہ کہہ سکیں کہ قرآن، مہر کے ہونے نہ ہونے کو براہِ راست کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ قرآن مہر کو یکسر منسوخ کر سکتا تھا وہ مردوں کو اس پابندی سے بچا سکتا تھا مگر اس نے یہ نہ کیا۔

نقد و نظر مہر کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر آپ نے سمجھ لیا، یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں مہر کا فلسفہ کیا ہے۔ اب مناسب ہے کہ اسلامی قوانین اس مسئلہ پر نقد کرنے والوں کی بات میں سنیں۔

خانم منوچہریان نے اپنی کتاب "استفادہ بر قوانین اساسی و مدنی ایران" میں مہر کے اوپر ایک فصل میں لکھا ہے:

"جیسے باغ، مکان، گھوڑے یا خچر کے لیے مرد کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح بیوی خریدنے کے واسطے جیسے پیسے نکالنا پڑتے ہیں اور جس طرح گھڑ، باغ اور خچر کی قیمت بڑے چھوٹے، خوبصورت اور بد شکل ہونے کے گھٹتی بڑھتی ہے۔ یونہی عورت بھی بد صورتی، زیبائی، دولت مندی اور غربت کی بنیاد پر کم و زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ ہمارے مہربان و جوانمرد قانون ساز حضرات نے، عورت کی قیمت پر بارہ دفعات قلمبند کیے ہیں۔ فلسفہ ان کا یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے رشتے میں رویے کا ذکر نہ ہو تو یہ رشتہ کمزور اور جلد ٹوٹ جاتا ہے۔"

اگر مہر کا قانون کسی اجنبی نے بنایا ہو، کیا اس وقت بھی اتنی ہی بے توجہی و تہمت و افترا کا سبب ہوگا؟ کیا جب بھی اور جو بھی روپیہ پیسہ کوئی کسی کو دیتا ہے تو وہ اسے خریدنا چاہتا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو افش و ہدیہ و تحفہ کی رسم کو ختم کر دینا چاہیے۔ قانونِ مدنی میں

مہر کی بات قرآن مجید کی اساس پر ہے۔ قرآن نے صاف صاف کہا ہے کہ مہر، نسطہ و پیش کش کے عداوہ اور کوئی عنوان نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ اسلام نے اقتصادی قوانین سمجھ اس طرح بنائے ہیں جن میں شوہر کو بیوی کے مال سے اقتصادی فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں مہر کو قیمت زن کے نام سے کیوں یاد کیا جاسکتا ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی مرد اپنی بیویوں سے اقتصادی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں بھی مانتا ہوں، واقعاً، بہت سے ایرانی مرد بیوی کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کا مہر سے کیا تعلق ہے۔ مرد یہ تو نہیں کہتے کہ چونکہ ہم نے مہر دیا ہے لہذا ہم اپنی بیویوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ایرانی مردوں کی اپنی بیویوں پر حکمرانی کا مرکزی نکتہ کچھ اور ہے۔ مردوں کی اصلاح کے بجائے قانون فطرت کو بگاڑنے، اور مزید خرابیوں کو جنم دینے کی وجہ کیا ہے؟ اس پوری گفتگو میں صرف ایک بات پردے کی ہے اور وہ ہے کہ ایرانی، مشرق کے باشندے اپنے انسانی معیار، اور زندگی کا فلسفہ بھول جائیں اور جنسی رنگ و شکل بنالیں تاکہ ان کا نگلنا آسان ہو جائے خاتم منوچہریاں کہتی ہیں؛

”اگر عورت اقتصادی حیثیت سے مرد کے برابر ہو تو اس کے لیے نان و نفقہ و لباس

و مہر کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے اور بہت سی پیش بندیاں اور مرد سے معاملات کو پکا کرنے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔

اگر اس گفتگو کی چھاں پھٹک کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا، جن تاریخی ادوار میں عورت کو حق مالکیت اور اقتصادی آزادی حاصل نہ تھی اس دور میں مہر و نفقہ کی کسی حد تک معقول و موجود تھی، مگر جب عورت کو اقتصادی آزادی دے دی گئی۔ جیسے اسلام میں، تو اب مہر و نفقہ کا جواز باقی نہیں۔

ان لوگوں کے خیال میں مہر کا صرف فلسفہ یہ ہے کہ عورت کے اقتصادی حقوق چھین کر فقط مہر دے دیا جائے۔ بہتر موہنا کہ یہ حضرات مختصر مطالعہ قرآن بھی کر لیتے اور مہر کی جو

تعبیر یہ ہے کہ اس کی گئی ہے ان پر غور کر کے مہر کا اصلی فلسفہ دریافت کرتے اور جب انہیں اس کتاب کے اعلیٰ منطقی دلائل معلوم ہوتے تو بہت خوش ہوتے کہ ان کے ملک کی آسمانی کتاب ایسی عالی مرتبہ ہے۔

چالیس لکائی تجویز کے مختلف نے رسالہ "زن روز" کے شمارہ ۸۹ صفحہ ۷۱ پر "جائزہ" میں عورت کے نفسی حالات اور اس بارے میں اسلامی خدشات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: "چونکہ عورت و مرد مساوی پیدا کیے گئے ہیں لہذا قیمت یا اجرت کی یکطرفہ ادائیگی عقلی دلیل و منطق کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے مرد کو عورت کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کو بھی مرد کی ضرورت ہے۔ تخلیق میں ان کو ایک دوسرے کا محتاج پیدا کیا گیا ہے۔ دونوں برابر کی ضرورت کے محتاج ہیں۔ لہذا ایک کو کسی چیز کا پابند کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا بے دلیل بات ہے۔ اس نقطہ نظر سے کہ طلاق مرد کے اختیار میں ہے اور عورت کی مشترک زندگی محفوظ نہیں تھی لہذا مہر کا حق عورت کو دے کر شوہر کی شخصیت پر بھروسے کے ساتھ ایک مالی مطالبے کا بھی وثیقہ بنکا گیا۔۔۔۔۔"

صفحہ ۷۲ پر فرماتے ہیں:

"اگر دفعہ ۳۳ قانون مدنی، جس میں تصریح ہے: "مرد جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔"

اس کی اصلاح کر دی جائے اور مرد کی خواہش و رائے پر طلاق نہ ہو تو مہر و صداق کا فلسفہ وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اس قسم کی باتوں کی وقعتی ہماری سابقہ گفتگو کے بعد واضح ہو چکی۔ مہر، قیمت یا اجرت نہیں، منطق و عقلی بات بھی کہی جا چکی۔ زن و مرد باہم برابر کی محتاجی نہیں رکھتے۔ فطرت نے دونوں کو مختلف بہتوں میں رکھا ہے۔

سب سے زیادہ بے اساس یہ بات ہے کہ مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں مہر کا فلسفہ

ستا ویز بیان کیا گیا ہے اور دعویٰ ہے کہ اسلام نے اسی بنیاد پر مہر مقرر کیا ہے۔

اس قسم کے حضرات سے پوچھنا چاہیے :

اسلام نے مرد کو حقیقی طلاق کیوں دیا جو عورت کو مالی و ستا ویز کی ضرورت پڑی؟

اس کے علاوہ آپ کی بات کا تو مطلب یہ ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی

زوجہ محترمہ کا مہر اس لیے مقرر کیا کہ حضرت اپنے مقابلے میں مالی و ستا ویز دینا چاہتے تھے۔

اور حضرت علی و حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہما کے درمیان مہر اس وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہ کو

مالی و ستا ویز دے کر علی کے بارے میں ذہنی اطمینان حاصل کر لیں۔

اگر حقیقت یہ ہوتی تو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کو یہ نصیحت کیوں فرماتے

اپنا مہر شوہروں کو بخش دیا کریں۔ اور ان بخشش کے ذیل میں ثواب کیوں بیان فرماتے؟

بہرہ یہ کہ نصیحت کیوں فرماتے کہ حتی الامکان مہر زیادہ نہ رکھا جائے؟ کیا، رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک شادی کا ہدیہ مرد کی طرف سے عورت کے نام مہر کے طور پر دیا جائے

عورت کی طرف سے مہر یا اس کے مساوی بخشش الفت اور رشتہ ازدواج میں استحکام

کو باعث نہ تھا؟

اگر اسلام کی نظر میں مہر مالی و عتیقہ و ستا ویز ہوتا، تو آسمانی کتاب میں "وَأَقْرَبُ

مَسَاكِنَ صَدَقَاتِهِنَّ فَخُلَّةٌ" کیوں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہ "وَأَقْرَبُ النِّسَاءِ صَدَقَاتِهِنَّ

نِسَقُهُ"

ان باتوں سے بڑھ کر۔ مصنف مذکور نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صدر اسلام میں رسم

مہر ایسی ہی تھی جیسے آج ہے۔ آج کل کی رسم کے مطابق، مہر میں نمایاں پہلو مرد کی ایک

نفسی داری و فریضہ ہے۔ یعنی مرد ایک رقم معین عقد و ستا ویز کے مطابق قبول

کرتا ہے۔ عموماً اس رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا، البتہ، لڑائی جھگڑے کے وقت مطالبہ

کرتا ہے، تو اس قسم کا مہر و ستا ویز حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ صدر اسلام میں دستور

تھا کہ مرد، مہر کے نام سے جس کا وعدہ کرتا تھا وہ نقد داکر دیتا تھا۔ لہذا، مہر کو اسلام کے نزدیک دستاویز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی، مہر کے بغیر کسی زوجہ کو شوہر کے حوالے کرنے پر خوش نہ ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کتابوں میں مذکور ہے :

ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حاضرین بزم کے سامنے کھینے لگی :

۔ یا رسول اللہ ! مجھے اپنی زوجیت میں قبول فرمالیں۔

آنحضرتؐ نے سکوت اختیار فرمایا، کوئی جواب نہ دیا، وہ عورت بیٹھ گئی، ایک صحابی نے کھڑے ہو کر عرض کی۔

۔ یا رسول اللہ ! اگر آپ مائل نہیں تو میں حاضر ہوں !

آنحضرتؐ نے پوچھا :

۔ مہر کیا دو گے ؟

۔ میرے پاس کچھ نہیں۔

۔ یوں تو نہیں ہو سکتا، گھر جاؤ، شاید کچھ مل جائے، جو ملے وہ لے آؤ اور اس

بانی کا مہر دے دو۔

وہ آدمی گھر گیا، واپس آیا، اسے گھر میں کچھ نہ ملا۔

۔ اچھا دوبارہ جاؤ، ایک سو ہے کی انگوٹھی مل جائے تو وہی لے آؤ کافی ہے۔

دوسری مرتبہ گیا، گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔ عرض کرنے لگا، بس یہی کپڑے

ہیں جو پہنے ہوئے ہوں۔

ایک صحابی نے سے پہچان لیا اور کہا، یا رسول اللہؐ بخدا اس شخص کے پاس

اس لباس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی کے نصف کو مہر قرار دے دیجئے۔
آنحضرتؐ نے فرمایا:

اگر اسے دو حصے کر دیا جائے تو کسی کا بھی جسم تو نہ ڈھکے گا۔ نہیں، نہیں ہو سکتا۔
وہ شخص بیٹھ گیا۔ عورت اسی انتظار میں دوسری طرف بیٹھی تھی۔ محفل میں باتیں ہونے
لگیں اور دیر ہو گئی۔ وہ شخص اٹھا کہ جائے، آنحضرتؐ نے آواز دی:

— دھر آؤ! — وہ حاضر ہوا۔

— اچھا یہ بناؤ، قرآن آتا ہے؟

— جی ہاں! پیارے رسول اللہؐ، فلاں فلاں سورہ آتا ہے۔

— زبان سنا سکتے ہو!

— جی ہاں، سنا سکتا ہوں۔

— اچھا، ٹھیک ہے، یہ عورت تمہارے عقد میں دیتا ہوں، اور مہر یہ ہے کہ اسے قرآن کی
تعلیم دے دو۔

اس شخص نے بیوی کا ہاتھ ہاتھ میں لیا اور دونوں چلے گئے۔

مہر کے بارے میں اور بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مگر اب ہمیں پر شہر ہا ہوں۔

مہر و نفقہ

(۳)

نفقہ :

ہم مہر کے بارے اسلام کا نظریہ و فلسفہ بیان کر چکے ، اب "نفقہ" کے متعلق بحث باقی ہے۔ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین میں نفقہ بھی "مہر" کی طرح ایک خاص نہج و انداز کی چیز ہے اس کو ان معنوں میں نہ سمجھنا چاہیے جو غیر اسلامی دنیا میں تھے یا آج بھی اس کا کوئی مفہوم کہیں مراد لیا جاتا ہو۔

اگر اسلام نے مرد کو یہ حق دیا ہو تا کہ عورت کو اپنی خدمت گزاری کے لیے رکھو، بیوی کی محنت، کاروبار اور اس کی دولت کو اپنا مال سمجھو۔ تو نفقہ دینے کے معنی عیاں تھے۔ واضح یہی بات ہے، جب انسان کسی جانور یا آدمی سے اقتصادی فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اخراجات زندگی بھی پورے کرے گا۔ گھوڑے والا اپنے گھوڑے کو دانہ پانی نہ دے گا تو جانور بھی گاڑی نہ کھینچے گا۔

اسلام، مرد کے اس حق کو نہیں مانتا، اس نے عورت کو حق ملکیت دیا ہے۔ وہ دولت کما سکتی ہے۔ مرد کو حق نہیں کہ بیوی کی خاص دولت میں تصرف کرے اور لازم قرار دیا کہ گھر کا بجٹ پورا کرے بیوی بچوں کا خرچہ نوکر چاکر، کام کاج، گھر وغیرہ کے اخراجات ادا کرے۔ کیوں، علت و سبب کیا ہے؟

افسوس ہے، مغرب نواز ایک لمحہ کے لیے ان معاملات پر ذرا بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ آنکھیں بند کر کے بعینہ وہی اعتراض کرتے جو یورپ والے اپنے قانونی سسٹم پر کرتے ہیں۔ اور وہ صحیح بھی ہیں۔ یہ لوگ انھیں اعتراضات کو اسلامی قوانین

اگر دیتے ہیں۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ مغرب میں بیوی کا نان و نفقہ انیسویں صدی میں وظیفہ خواری و تنخواہ کی نشان کنیسی تھا تو غلط نہیں کہتا، سچ کہتا ہے۔ آخر ایک عورت بے معاوضہ پابند ہو کر مرد کی گھریلو زندگی کی دیکھ بھال کرے اور ملکیت سے محروم بھی ہو تو جو درو لو سے دیے جائیں گے وہ تنخواہ و وظیفے سے زیادہ کیا ہوں گے، جیسے قیدی یا، بارکش جانور کا رتبہ۔

اگر دنیا میں کوئی قانون ایسا موجود ہو، جو خاص طور پر جو مرد کی گھریلو زندگی کی ذمہ داریوں کا بطور فرض والا بوجھ بیوی کی گردن سے اٹھالے، اسے دولت کمانے کا حق اور اقتصادی آزادی دے، گھریلو بچٹ میں شرکت سے معاف رکھے، جب تو یقیناً کوئی فلسفہ جدا کا نہ ہوگا۔ اور اس کے اوپر غور کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر شایگان نے ”شرح قانون مدنی ایران کے صفحہ ۳۶۲ پر لکھا ہے:

”عورت اپنی ملکیت میں جو خود مختاری

انیسویں صدی کے آخری حصے تک فرنگی عورت کی محرومی۔

کہتی ہے وہ فقہ شیعہ میں ابتدا سے تسلیم شدہ ہے۔ یونان، روم، جاپان اور کچھ عرصہ پہلے اکثر ممالک کے قوانین میں یہ بات مذکور نہ تھی۔ یعنی بیوی، نابالغ اور دیوانے کی طرح اپنی ملکیت سے ”مجبور“ یعنی وہ اپنی جائداد و املاک میں تصرف سے محروم تھی۔ انگلستان میں ایک زمانہ تھا کہ بیوی کی حیثیت، شوہر کے وجود میں محو تھی۔ ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء میں باری باری دو قانون وضع ہوئے جن کا نام شوہر رکھنے والی خواتین کا قانون ملکیت اس کی وجہ سے کورٹ آف وارڈس سسٹم کا خاتمہ ہوا۔

اٹلی میں یہ قانون ۱۹۱۹ء میں اور ۱۹۲۹ء میں جرمن کے قانون مدنی (سول لایو) نے ۱۹۰۰ء میں سویزر لینڈ کے قانون نے بیوی کی اہلیت و حق ملکیت و تصرف کو تسلیم

کیا جیسے شوہر کو یہ حق حاصل تھے۔

لیکن پڑنگال و فرانس میں، با شوہر بیوی مجبور شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ ۱۹۳۸ء کی ۱۸ فروری کو فرانس میں حجر (کورٹ آف وارڈس) کے ضابطے کو مہوار کر دیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ، صدی کی بات ہے یعنی بیوی کو شوہر کے مقابلے میں حق ۱۸۸۲ء میں ملا۔ وہ بھی۔ انگلستان میں یا بیوی کی ملکیت سے یہ اصطلاح قانون "کورٹ آف وارڈس" شپ ختم ہوئی۔

یورپ نے عورت کو اپنا ایک اقتصادی خود مختاری کیوں دے دی؟

ایک صدی پہلے یہ حادثہ رونما ہوا کیسے؟ کیا مردوں کے انسانی حذباً میں جوش آیا اور انھیں اپنے

ظالمانہ رویے کا احساس ہوا؟

ویل ڈیورینٹ نے اس کا جواب دیا ہے، اس نے کتاب "لذاتِ فلسفہ" میں وجوہ و اسباب، کے عنوان سے ایک بحث کی ہے۔ یورپ میں آزادی خواتین کے اسباب و علل پر اس میں تفصیل مہیا کی ہے۔ افسوس ناک بات جو وہاں ملی وہ یہ ہے کہ یورپ کی آزادی و حق ملکیت عورت کو مشین کا شکر گزار ہونا چاہیے آدمیوں کا نہیں۔ اسے بڑی بڑی مشینوں کے پہیوں کے سامنے جھکنا چاہیے۔ مغربی مردوں کے سامنے نہیں۔ یہ تو کارخانہ داروں کی حرص تھی، انھوں نے عورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر مزدوری کم اور کام زیادہ کے نقطہ نظر سے انگلستان کی قانون ساز اسمبلی میں مسودہ قانون آزادی اقتصادی خواتین قابل پیش کر دیا۔

ویل ڈیورینٹ کہتا ہے :-

"رسم و رواج قدیم کی دگرگوئی کا کیا سبب بناؤں وہ رسم و رواج جو تاریخ مسیحیت سے بھی پرانے تھے؟ ایک عام سبب اس تبدیلی کا، مشینوں اور

کارخانوں کی فراوانی ہے۔ ”آزادی خواتین“ منقعی انقلاب کی پیداوار ہے۔۔۔۔۔“
 ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کاروبار میں مشکل ہو گیا تھا۔ مگر روزانہ
 اعتباروں میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اپنی بیوی بچوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ کارخانہ داروں
 اپنے منافع اور حصّوں کی فکر تھی وہ حکومت کے اخلاق و رسم و رواج سے اپنا ذہن پریشان
 کر سکتے تھے۔ جن لوگوں نے بے خبری کے عالم میں ”گھر بھونکنے“ کا منصوبہ بنایا وہ وطن
 دوست، انیسویں صدی کے وطن پرست کارخانہ دار تھے۔“

”ہماری پرانی ماؤں کی آزادی کے لیے پہلا قدم ۱۸۳۲ء کا قانون تھا۔ اس قانون کی رو
 سے تنظیم برطانیہ کی خواتین نے بے مثال امتیازات حاصل کیے۔ وہ جو پیسے حاصل کریں اپنے
 لیے محفوظ کر سکتی تھیں۔ اس اعلیٰ درجے کا اخلاقی و سچی قانون، کارخانہ داروں نے مجلس
 ہم میں پیش کیا تاکہ انگلستان کی خواتین کو فیکٹریوں میں کھینچ سکیں، اس وقت سے آج تک
 یہ قابل متقابلہ نفع اندوزی تے غلامی، جان کنی، گھروں سے نکالنے کی مہم جاری ہے۔ عورتیں
 دنیا کی میں گرفتار، نزع کے عالم میں بڑی دوکانوں اور کارخانوں میں زندگی گزار رہی ہیں۔“
 آپ نے دیکھا کہ سرمایہ داروں اور مالکان کارخانہ نے انگلستان میں اپنے مادی
 نفع کی خاطر عورتوں کے حق میں یہ قدم اٹھایا تھا۔

قرآن اور خواتین کی اقتصادی آزادی || اسلام نے چودہ سو برس پہلے ایک قانون
 دیا:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

مرد جو کچھ کماتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کماتے ہیں وہ ان کا
 حصہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں قرآن مجید نے مردوں کو ان کے نتائج کار و کوشش کا مالک اور
 عورتوں کو ان کے نتائج کار و کوشش کا مقدار قرار دیا ہے۔

دوسری آیت مبارکہ میں ارشاد ہے :-

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

جو مالی باپ یا ماں یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں مردوں کا
حصہ ہے اور جو مال ماں باپ یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس
میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اس آیت سے نواہین کی وارث ہونے کی حیثیت ثابت ہوتی ہے۔ عورت کے وارث
ہونے نہ ہونے کی تاریخ بھی تفصیل طلب ہے جسے انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔ جاہلیت کا عرب
عورتوں کو میراث دینے پر تیار نہ تھا۔ قرآن نے عورتوں کا یہ حق ثابت کر دیا۔

ایک مناظرہ: قرآن کریم نے تیس سو برس پہلے یورپ میں عورتوں کو اقتصادی
آزادی عطا کی فرق یہ تھا:

- ۱۔ اسلام کا نواہین کو اقتصادی آزادی عطا کرنے کا سبب، اسلام کی انسانی جہت عمل
و دوستی و اہلیت کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ نہ انگلستانی کا خانہ داروں کی ہوس نفع اندوزی
تھی جس نے اپنے پیٹ بھرنے کے لیے یہ مسودہ قانون پیش کیا ہو۔ اس کے بعد وہ ڈھواں
پیٹنے کہ ہم نے عورت کے حقوق کو قانونی طور پر منوایا، ہم نے زن و مرد کے حقوق کو برابر تسلیم کیا۔
- ۲۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی بخشی، لیکن بقول ویل ڈیورینٹ، "خانہ براندازی"
نہیں کی۔ گھر میں آگ نہیں لگائی۔ خاندانوں کی نیو نہیں اکھیڑی، بیویوں کو شوہروں،
بیٹیوں کو باپوں کے خلاف کشتی پر نہیں ابھارا۔ اسلام نے ان دو آیتوں سے ایک عظیم سماجی
انقلاب برپا کیا مگر پرسکون، بے ضرر اور بے خطر۔

یورپ نے جو کچھ کیا وہ بقول ”ویل ڈیورانت“ یہ تھا کہ عورت کو گھر کی بندگی و جان کنڈی سے آزاد کر کے دوکانوں اور کارخانوں کی بندگی و جان کنڈی میں ڈال دیا، یعنی مغرب نے ایک تنہکڑی بیٹری، عورت کے ہاتھ پاؤں سے کھولی اور دوسری تنہکڑی بیٹری ڈال دی۔ اسلام نے عورت کو مرد کی بندگی و کنیزی سے گھر اور کھیت دونوں جگہ آزادی بخشی اور مرد کو گھر و اجتماعی زندگی کے اخراجات کا ذمہ دار بنایا، عورت کے کاندھوں سے اپنے اور گھر کے اخراجات اور ہر قسم کا جبر و پابندی کا بوجھ اتار دیا۔ اسلام کی نظر میں عورت انسانی خمیر کے مطابق دولت کے حصول، اس کی حفاظت و اضافہ کی سعی کر سکتی ہے۔ اسے زندگی کا جبر نہیں دیا سکتا اور اس کی خودداری و جمال و زیبائی ہمیشہ اطمینان خاطر کے ساتھ اس کے ہمراہ رہ سکتی ہے زندگی کا جبر اسے نہیں چھین سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے ہمارے کچھ لکھنے والوں کی آنکھیں اور کان بند ہو چکے ہیں کہ ان مسلم تاریخی و فلسفی حقائق کو سوچیں۔

انتقاد اور جواب خانم منوچہریان نے ”انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے:

”ہمارا سوال لا، ایک طرف تو مرد کو اپنی بیوی کا نفقہ دینے پر تیار کرتا ہے۔ اس کے لیے کپڑے، تہ، خوراک اور مکان دے، جیسے مالک اپنے گھوڑے گدھے کے لیے خوراک اور تھان مہیا کرتا ہے اسی طرح بیوی کو کم از کم زندگی کے یہ اسباب فراہم کرے دوسری طرف نہ معلوم کیوں سول لاکھ دفعہ ۱۱۱۰ میں لازم قرار دیتا ہے کہ عدہ و نفات میں بیوی کو نفقہ کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ وفات شوہر کے وقت عورت مہربانی تسلی کی محتاج ہوتی ہے، وہ اپنے مالک کو ہاتھ سے کھو بیٹھنے پر پریشاں حال و آشفتمند خاطر ہو، ہمدردی و غم خواری چاہتی ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ تم تو آزادی کا دم بھرتی ہو، ہر منزل میں مرد کے برابر ہونا چاہتی ہو یہاں وظیفہ خوار و راتب دار بننے کی آرزو کیوں ہے۔ یہ امید کیوں کرتی ہو کہ شوہر کے بعد بھی زندگی و تنخواہ جاری ہے۔ جواب یہ ہے

کہ فلسفہ کنیزی زن کے مطابق جو ”سول“ کا سانچہ ہے۔ بقول سعدی اچھا ہوتا کہ ”مالکانِ آدمی“ اپنے بعد کے لیے بھی بیوی کے لیے نفقہ مقرر کر جاتے۔ اور قانون اس پہلو کی نگہداشت کرتا ہے۔ ہم محترمہ سے پوچھتے ہیں، قانون مدنی اور قانون اسلام یا بقول آپ کے ”فلسفہ کنیزی زن“ میں کہاں سے آپ نے یہ دریافت کیا ہے کہ مرد، بیوی کا مالک ہے؟ اور مرد کا نفقہ دینا اس سبب ہے کہ عورت اس کی مملوک ہے۔ یہ کون سی ملکیت ہے کہ مالک اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ”پانی کا گلاس اٹھا دو“ یہ ملکیت کیسی ہے کہ مملوک جو کام کرے وہ مملوک ہی کا ہے مالک کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کیسی ملکیت ہے کہ مملوک چھوٹا سا کام بھی مالک کے لیے انجام دے۔ اگر اس کی خواہش ہو۔ تو مزدوری طلب کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ کیسا مالک ہے جو اپنے زیر دست سے اپنے بچے کو مفت دودھ نہیں پلا سکتا، حالانکہ مالک کے گھر میں بچہ اسی نے بنا ہے۔

دوسرے یہ کہ۔ جو بھی کسی کا کھانا پیتا ہو وہ مملوک ہو اگر تا ہے؟ اسلام ہو یا کوئی بھی قانون ہو، اولاد باپ یا ماں باپ دونوں کے واجب النفقہ ہیں۔ تو اس دلیل کے مطابق تمام دنیا کے قوانین اولاد کو باپ کی ملکیت مانتے ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر ماں باپ غریب ہوں تو اولاد پر ان کا نان و نفقہ واجب ہے، یعنی اسلام نے باپ اور ماں کو اولاد کا مملوک قرار دیا ہے؟

تیسرے یہ کہ۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے کہ فرماتی ہیں۔ بیوی کا نفقہ عدہ وفات میں کیوں واجب نہیں؟ اس وقت بیوی اپنے میاں کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے وہ شوہر کے روپے کی زیادہ محتاج ہے۔

جیسے محترمہ، سو سال پہلے کے یورپ میں رہتی ہیں، عورت کی احتیاج، شوہر کے نفقہ دینے کی اس میں نہیں ہے۔ اگر اسلام کی نظر میں عورت اپنے شوہر کی شریک حیات ہوتے ہوئے حق ملکیت سے محروم ہوتی تو یہ مطالبہ صحیح تھا کہ وفات شوہر کے بعد اس کا انتظام کیا

ہائے کیونکہ اس کی زندگی کی وضع بدل گئی۔ لیکن جو قانون بیوی کو حق ملکیت دے چکا ہے اور بیویاں اپنے اس حق کی بنا پر اپنا پیسہ شوہر کی زندگی میں محفوظ کر سکتی ہیں تو آتشیا نہ اچڑنے کے بعد کیا ضرورت ہے ایک مدت کے لیے ہی سہی وہ نفقہ لیں۔ نفقہ کا حق مرد کے آتشیا کی زیرائش کے لیے تھا، آتشیا کی ویرانی کے بعد کوئی ضرورت نہیں یہ حق جاری رکھا جائے۔

اسلام میں نفقہ تین نوع کا ہے،

نفقہ کی تین قسمیں

۱۔ مملوک کو مالک کی طرف سے دیا جانے والا نفقہ، وہ اخراجات

جو حیوانات کے مالک ان جانوروں پر کرتے ہیں اس نفقہ کی بنیاد مالکیت و مملوکیہ ہے۔

۲۔ وہ نفقہ جو کم سن اور محتاج اولاد کو دیا جاتا ہے یا وہ اخراجات جو غریب ماں باپ

پر ہوتے ہیں۔ اس نفقہ کی بنیاد مالکیت و مملوکیہ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد وہ فطری حقوق

جو اولاد اپنے وجود میں لا والوں پر رکھتے ہیں اور والدین کے وہ حقوق ہیں جو تولید میں شرکت اور بچے کی پرورش و

تربیت میں کالیف برداشت کرنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس نقطہ کے وجہ کی شرط یہ ہے کہ واجب النفقہ عاجز و غریب ہو۔

۳۔ وہ نفقہ جو شوہر اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ اس نفقہ کی بنیاد نہ مالکیت ہے، نہ مملوکیہ،

نہ وہ فطری حق جو نوع دوم میں بتایا گیا ہے، نہ اس کی بنیاد بیوی کا غریب و عاجز ہونا ہے۔

بیوی، عیالوں کی مالک اور بے حد و حساب آمدنی کی مالک ہو، اور شوہر کی آمدنی

کم ہو جب بھی گھر کے اخراجات جن میں بیوی کا بھی خرچ بھی شامل ہے۔ مرد کے ذمے ہے۔

پہلی اور دوسری نوع و قسم کے نفقے سے اس نفقے کا فرق یہ بھی ہے کہ ان دونوں

مقامات میں اگر آدمی اپنی ذمہ داری پوری نہ کرے اور نفقہ نہ دے تو گنہگار ہو گا مگر وہ قرض

نہیں جس کی ادائیگی یا مطالبہ کیا جاسکے۔ یعنی اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے، تیسری قسم کے

نفقے میں اگر آدمی غفلت کرے تو بیوی کو قانونی چارہ جوئی کا حق ہے وہ دعویٰ کر سکتی ہے

و ثبوت کے بعد وہ عدالت کے ذریعے اپنے واجبات وصول کر سکتی ہے۔ اس نفقہ

کی بنیاد کیا ہے؟ اس پر آئندہ فصل میں ہم بحث کریں گے۔

کیا آج کی بیوی مہر نفقہ نہیں چاہتی؟

میں نے کہا ہے: اسلام کی نظر میں گھر و بھیت کی فراہمی جس میں بیوی کے ذاتی اخراجات

بھی ہیں، مرد کے ذمے ہے، اس کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے۔ خواہ بیوی بہت بڑی سرمایہ دار اور شوہر سے کئی گنا زیادہ مال رکھتی ہو، اسے اخراجات میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ روپے کے لیے نہ کسی کام کے لیے فقط اور فقط وہ خود اپنے ارادے اور خواہش سے جو کرنا چاہے وہ کرے۔

اسلام کی نظر میں باوجودیکہ زندگی کے اخراجات جن میں عورت کے مصارف بھی داخل ہیں، مرد کے ذمے ہیں، پھر بھی مرد کو کسی قسم کا اقتصادی تسلط اور بیوی کی فری قوت اور کام سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے وہ استعمار نہیں کر سکتا۔ بیوی کا نفقہ اس حیثیت سے نفقہ والدین سے مشابہت رکھتا ہے کہ وہ بھی خاص حالات میں اولاد کو دینا پڑتا ہے اور اس کے عوض میں وہ مال یا باپ سے خدمت نہیں لے سکتا۔

مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت

اسلام نے بے مثال انداز میں عورت کی مالی حیثیت سے نگہداشت کی ہے۔ ایک

طرف سے اقتصادی آزادی دے کر مرد کی دست رس و بالادستی کو کم کیا ہے، عورت کے معاملات میں مرد کی قیودیت کو۔ جو پرانی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یورپ میں بیسویں صدی تک باقی رہی۔ شوہر سے لے لی۔ دوسری طرف گھر و بھیت کی اخراجات کی فراہمی کا بوجھ اس کے کاندھے سے اتار کر اسے پیسے کے پیچھے دوڑنے اور ہر قسم کے جبر و پابندی اور دوا و دش سے معاف کر دیا۔

مغرب پرست جب خواتین کی حمایت کا نام لے کر اس قانون پر تنقید کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجبور ہو کر شاخ در شاخ دروغ بے فروغ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ نفقہ کا فلسفہ ہے مرد کا اپنے تئیں عورت کا مالک سمجھنا اس سے اپنی خدمت لینا۔ جیسے جانوروں

کی مالک اپنے مملوکہ جانوروں کا خرچ برداشت کرنے پر مجبور ہے کہ وہ چوپائے اسے اپنی داری دے سکیں اس کے لیے بار برداری کر سکیں، قانونِ نفقہ زن بھی اسی لیے ضروری ہے کھاؤ، مرو نہیں۔

جو شخص ان معاملات میں قانونِ اسلام پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام حد سے زیادہ عورت پر نوازش کی ہے اور مرد پر دباؤ ڈالتا ہے، اسے بیگار میں پکڑ کر عورت کی مزدوری کروائی ہے۔ تو یہ کہنے والا اپنی بات کو بڑا آب رنگ دے کر پیش کر سکتا ہے نہ یہ کہ عورت کا نام اور اس کی حمایت کا ڈھونگ رہا کر اس قانون پر حملہ کرے۔

درحقیقت اسلام عورت کے مفاد اور مرد کے خلاف یا مرد کے مفاد اور عورت کے خلاف، قانون نہیں بنانا چاہتا۔ اسلام نہ مرد کا حامی ہے نہ عورت کا، اسلام اپنے قوانین میں انسانی معاشرے کی بہبود کو ملحوظ رکھتا ہے، میاں بیوی اور ان کی آغوش میں پرورش پانے والے بچے خوش و خوشحال رہیں۔ اسلام کی نظر میں، میاں بیوی اور اولاد کی فلاح و بہبود کا راستہ یہ ہے کہ فطرت نے جو قوانین اور قواعد دیے، جو رویے اور طریقے قادر و توانا خالق سے حاصل کیے ہیں ان سے چشم پوشی نہ کی جائے۔

ہم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اس کلیہ کی نگہداشت کی ہے کہ مرد کو خریدار اور عورت کو مالکِ مال و اسباب جانتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مشترک زندگی و وصال میں مرد اپنے آپ کو فائدہ اٹھانے والا سمجھ کر اس عمل کا خرچ برداشت کرے۔ زن و مرد یہ نہ بھولیں کہ ان دونوں کی فطرت نے عشق کے دو جدا گانہ رویے انھیں بخشے ہیں شادی اس وقت پائدار و لذت بخش و مستحکم رہ سکتی ہے جب عورت و مرد اپنے اپنے فطری رویے کے مطابق سامنے آئیں۔

۲۔ مرد پر عورت کے نفقہ کا فرض اس علت و وجہ سے بھی ہے کہ فطرت کی طرف سے تولید نسل کی روح فرسا اور رنج و زحمت کشی کی ذمہ داری عورت کے ذمہ رکھی گئی ہے۔

اور اس سلسلے میں مرد کا ایک آن کے لیے لذت بخش عمل ہے اور بس، عورت ہے کہ (کم سنی اور بڑھاپے کے عداوہ) ماہواری کی بیماری جیسے، حمل کے دنوں کا بوجھ اٹھائے، پھر ان دنوں کی مخصوص بیماری سے گزرے، بچہ جنمے اور اس کے عوارض و مشکلات سے دوچار ہو بچے کو دو دھڑ دے، اس کی دیکھ بھال کرے۔

ان مرحلوں میں بدنی اور اعصابی قوت صرف ہوتی ہے، کام کاج کے لیے اس کی توانائی میں کمی آتی ہے۔ ان اسباب و وجوہ کے بعد بھی اگر قانون زن و مرد کو اخراجات زندگی میں مشابہ صورت خانی میں قرار دے اور عورت کی حمایت نہ کرے تو خواتین کی حالت بڑی مظلومانہ ہو جائے۔ یہی معاملات ہیں جن کی بنا پر جانوروں میں جنس نہ، جنس مادہ کی حفاظت کرتی ہے، اور نر اپنی مادہ کو زمانہ حمل و تولید میں خوراک و آذوقہ مہیا کرنے میں مدد دیتا۔ زن و مرد، محنت و ثروت، اقتصادی، اور تولیدی جیسے سخت کام میں ایک دوسرے کے مشابہ پیدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر بیگانگی کی بات آئے اور شوہر، بیوی سے کہے کہ میں اپنی آمدنی سے ایک پیسہ بھی تم پر خرچ نہیں کروں گا تو بیوی ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ مرد کے ہم پلہ کھڑی ہو سکے۔

ان باتوں سے قطع نظر عورت کو مرد سے کہیں زیادہ پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیم و زینت عورت کی زندگی کا حصہ ہے وہی اس کی اصلی ضرورت ہے۔ ایک عورت اپنی عام زندگی میں اپنی زیم و زینت شان و شوکت پر خرچ کرتی ہے وہ کئی مردوں کے خرچ کے برابر ہوتا ہے۔ زیبائش و آرائش کے رجحان سے عورت میں خود بخود رنگینی و تنوع پیدا ہوتا ہے۔ ایک مرد کے لیے ایک جوڑا جب تک پہنا جاسکے، پھٹ جائے قابل استعمال ہے مگر ایک عورت کے لیے؟ عورت کے لیے ایک جوڑا اس وقت تک قابل استعمال ہے جب تک کہ وہ اسے نئے لباس میں ملبوس دکھائے۔ بہت سے زیور آلات عورت کے لیے ایک دفعہ سے زیادہ پہننے کے قابل نہیں رہتے۔

حصول دولت کے لیے عورت کی محنت و کوشش مرد سے کم، مگر دولت کا استعمال مرد سے کہیں زیادہ ہے۔

پھر یہ کہ عورت کا عورت رہنا یعنی حسن و جمال، نشاط و غرور زن کی بقا، زیادہ تلاش، زیادہ راحت چاہتی ہے اس کے لیے محنت کم اور اطمینان خاطر زیادہ درکار ہے۔ اگر عورت مرد کی طرح دائمی طور پر تلاش معاش اور فکر روزی میں، سرگرداں اور پیسے کے پیچھے دوڑے ہوئے مجبور ہو، تو اس کا غرور ٹوٹ جائے، مرد کی طرح مالی پریشانیوں سے اس کے ماتھے پر بل اور پیشانی پر شکن پڑ جائے اس کی بھویں تنی ہوگی اور چہرہ شکستہ نظر آنے لگے۔ اکثر لوگوں سے سنا ہے، یورپ کی عورت تلاش معاش کے لیے کارخانوں اور دفاتروں میں مجبوراً جاتی ہے اسے مشرقی زندگی کی تمنا رہتی ہے۔ صاف سی بات ہے جس عورت کو ذہنی سکون نہ ہوگا اسے موقع ہی ملے گا کہ وہ مرد کے لیے سرمایہ مسرت و خوشی مہیا کر سکے۔

لہذا، فقط عورت کا مفاد نہیں، مرد، اور گھر کی مرکزیت کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ عورت تلاش معاش کی تھکادینے والی جبری محنت سے معاف رکھی جائے۔ مرد بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے گھر کا مرکز، آسائش اور تھکاوٹ دور کرتے بلکہ بیرونی پریشانیوں کو بھلا دینے کا مرکز ہو عورت کے امکان میں ہے وہ گھر کو ماحول کو آرام محل اور فراموش خانہ افکار تباد سے کس قدر بد نصیب دے تو ہر جو تھکا، ماندا، گھر میں قدم رکھے اور اپنے سے زیادہ تھکی باری بیوی کا سامنا کرے۔

یوں، مرد کے لیے بہت ضروری ہے کہ بیوی، صحت و نشاط اور اطمینان خاطر سے رہا کرے۔

اسی نکتے کی خاطر، مرد تیار رہتے ہیں کہ جان پر کھیل کر روپیہ کمائیں اور دونوں ہاتھ پر دولت رکھ کر بیوی کی نذر کریں کہ وہ کھلے ہاتھ اسے اپنے جسم و جان پر خرچ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو اپنی روحانی طلب کا احساس ہے، وہ سمجھ چکا ہے کہ اللہ نے عورت کو

سربایہ آرام و آسائش روح بنایا ہے :

وَجْعَلْ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا۔ ۱۷

اور اس سے اس کا جوڑا بھی بنایا تاکہ اس کے پاس رہے اور سکون حاصل کرے۔

سو ہر سمجھتا ہے کہ اپنی بیوی کو جس قدر اطمینان خاطر عطا کرے گا اسی قدر بواسطہ اپنی بھلائی حاصل کرے گا، گھر کے ماحول کو بارونق بنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ جوڑے میں کم از کم ایک توافق و آلام سے آزاد رہے کہ دوسرے روح کو سکون اور دل کو خوشی دے سکے۔ تقسیم کار کے وقت بہتر بھی ہے کہ معرکہ حیات میں مقابلے کے لیے مرد کا باہر نکلنا ہی بہتر ہے اور کن راحت روح کا سامان کرنے کے لیے دوسرا شریک حیات۔ بیوی۔ کو ہونا چاہیے۔

مالی اور مادی معاملات میں عورت کو مرد کا نیاز مند پیدا کیا گیا ہے اور مرد کو روحانی و نفسیاتی پہلو سے عورت کا نیاز مند بنایا گیا ہے، عورت، مرد کا بہار ایسے بغیر، مرد سے کئی گنا ضروریات کو پورا کرنے اور مالی اختیاجات سے فائدہ اٹھانے سے عاجز ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے عورت کے قانونی شریک حیات کو۔ فقط اس کے قانونی شریک زندگی۔ اس کے مرکز اعتماد بنایا ہے۔

عورت اگر اپنی پسند کی شان و زیبائش چاہنے لگے اور اپنے قانونی شوہر پر ہر بھروسہ نہ کرے دوسرے مردوں پر بھی توجہ دینے لگے تو۔ بعد افسوس۔ یہ وہی حالت ہوگی جو آج کل مشاہیر بن کر روز افزوں ہوتی جائے گی۔

نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈا ۱۸

سکاری مردوں کو راز معلوم ہو گیا ہے۔ نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک سبب یہ ہے کہ جب بیوی کی شوہر کے پیسے غرضی ختم کر دی جائے گی تو وہ آسانی سے تسکاری کی

دریں بیٹھ کے گی کمپنیوں میں خواتین کو زیادہ رقم کی ادائیگی پر غور کیجئے تو میری بات کو بہتر سمجھیں گے۔

کسی بیوی کے بے کیسے ممکن ہے کہ اپنی زندگی کا رابطہ شوہر سے توڑ لے پھر یہ چاہے کہ وہ اپنے معاملات کو جس طرح چاہے چلائے۔

اگر سچی بات سمجھنا چاہتے ہیں تو۔۔۔ نان و نفقہ کی پابندی اڑانے۔۔۔ کی مہم میں ان مردوں کی ملک جچی ہے جو خواتین کی زینت و آرائش اور فضول خرچیوں سے عاجز آچکے ہیں۔ یہ لوگ آزادی و مساوات کے نام سے فائدہ اٹھا کر فیشن پرست فضول خرچ بیویوں سے اپنا انتقام لے رہے ہیں ویل ڈیورینٹ نے اپنا کتاب "پلیٹرفل سنی" میں نئی شادی کے بیاں میں لکھا ہے:

"قانونی شادی، قانونی طور پر حمل سے دوری، اور صرغین کی رضامندی سے طلاق، اور اولاد و نفقہ نہ ہونے کی ذمہ داری کا نام ہے۔"

..... فیشن پرست، متوسط طبقے کی خواتین، محنت کش مردوں کے لیے بہت جلد انتقام کا باعث بنیں گی جس کا نشانہ جنس خواتین ہوگی۔ شادی کے معنوں میں ایسی تبدیلی آئے گی کہ ایسی عورتیں ناپید ہو جائیں گی جو سرمایہ زینت اور بڑے مصارف رکھنے والے گھروں کی وحشت کا سبب بنیں۔ مرد، مطالبہ کریں گے کہ بیویاں خود پودے کریں۔ دوستانہ شادی (نئی شادی) کا تقاضہ ہے کہ بیوی حمل کے وقت تک کام کرے۔ یہاں ایک نکتہ ہے جو عورت کی آزادی کو مکمل کرنے کا۔ وہ ہے کہ عورت شروع سے آخر تک اپنے اخراجات خود ہی پورے کیا کرے۔ صنفی انقلاب اپنے ظالمانہ نتائج۔ عورت کے بارے میں۔ دکھا رہا ہے۔ عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ کارخانے میں کام کرنا چاہئے۔ بیوی کا کمرے میں اکیلے بیٹھے رہنا اور مرد کا بیوی کے بے کار رہنے کے عوض میں دو گنا کام کرنا کیوں ضروری ہے۔ بیوی کو بھی کام اور محلے، تنخواہ اور محنت کشی میں میاں کے برابر ہونا چاہیے۔"

شوہر کی جگہ دولت | تولیدِ نسل کی فطری ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ مالی و اقتصادی لحاظ سے کسی نقطہ اعتماد سے وابستہ ہو۔ یہ حقیقت قابلِ انکار نہیں ہے۔

آج پورپ میں ایسے افراد ہیں جنہوں نے آزادی نسوان کو دہاں پہنچا دیا ہے کہ ”مادری“ آجملے گا اور باپ، خاندان سے بالکل جدا کر دیا جائیگا۔ عورت کی مکمل اقتصادی آزادی، اور تمام حالات و معاملات میں مرد کی برابری کے بعد باپ، عضوِ زائد بن کر خاندان سے نظر انداز ہو جائے گا۔

یعنی اسی ماحول میں یہ لوگ باپ کی جگہ دولت کو بٹھاتے ہیں دولت کو باپ کی جانشینی قبول کرنے کی درخواست دیتے ہیں، وہ اس پر تیار نہیں ہوں گے کہ عورت تنہا خاندان بنائے اور ساری ذمہ داریاں لے دیں کہ وہی مالی امداد بھی فراہم کرے اور حمل و تولید نسل سے دور ہو جائے۔ انہیں معاشرے اور نسل کے ختم ہو جانے کا بھی خیال ہوگا یعنی گھریلو عورت اگر گزشتہ دور میں ”نفقہ خور“ اور بقولِ معترض ”مرد کی مملوکہ تھی، تو مستقبل میں وہ نفقہ خور اور دولت کی باندی ہوگی اور باپ کا منصب اور اس کے فرائض اُسے منتقل ہو چکے ہوں گے۔

کائنات! جو لوگ آنکھیں بند کر کے کنبہ کے مقدس ماحول کو جو قوانینِ مقدس آسمانی پر استوار ہے، کدیاں مار مار کر گرا رہے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں کے نتائج اور اس دور رس اثرات کو بھی سوچ لیں۔

برٹریٹڈ رسل نے ”میرج اینڈ مورل“ میں ایک فصل کا عنوان رکھا ہے۔ کنبہ اور حکومت۔ اس میں بچوں کی تعلیم اور صحت کے بارے میں حکومت کی مداخلت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”بظاہر باپ بیاہوجیکی وجود کے تمام اسباب، اُتھ سے کھو چکا ہے.....“

بپ کو نکالنے میں ایک مؤثر عامل اور ہے اور وہ عتقوں کا مادی طور پر آزاد ہونے کا رجحان ہے۔ جو خواتین آج کل ایکشن میں دھڑکتی ہیں۔ عموماً گھروالیاں نہیں ہیں۔ گھروالیوں کے اغراضات بھی مجرد خواتین سے زیادہ ہیں۔ اور باوجود قانونی امتیازات کے کہ میں مقابلے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہیں... گھروالیوں کیلئے دو راستے ہیں جن سے وہ اپنی اقتصادی آزادی برقرار رکھ سکتی ہیں۔

۱۔ اپنے کام میں مصروف رہیں رد فتر جائیں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کھدائیاں نوکر رکھیں اور بچوں کو ان کے حوالے کر دیں اس کے نتیجے میں پرورش کا اتصال اور کنڈرگارڈن نامی اداروں کی فراوانی ہوگی۔ آخر کار غیبتی بچے سے بچے کا نہ باپ رہے گا نہ ماں۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ جوان بیویوں کو مالی امداد، ماہانہ خرچ دیں کہ وہ خود اپنے بچوں کی دیکھ بھال کریں۔

آخری طریقہ، بجائے خود اس وقت تک مفید نہ ہوگا جب تک اس کی نئی ذمہ داری یعنی بچے کی معین عمر تک پرورش کے بارے میں قانون وضع نہ ہو۔ مگر یہی ایک راستہ ہے جس میں خصوصیت یہ ہے کہ ماں خود اپنے بچے کو پالے گی بڑا کرے گی۔ اور اس عمل میں کسی طرح بھی مرد کی نظر میں حقیر نہ ہوگی۔

اس قانون کی تکمیل کے بعد کنبس کے اخلاق پر اس کے رد عمل کا انتظار کرنا ہوگا ممکن ہے قانون یہ بات کہے کہ غیر قانونی بچہ جننے والی ماں شوہر کی مالی امداد کی مقدار نہ ہوگی یا پھر ماں کی زنا پر موجود دلائل کے بعد خود باپ کو مالی امداد کی تجویز سامنے آئے۔ اس صورت میں مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ گھروالی خواتین کی نگرانی کرے۔ اس قانون کے نتائج بہت روشن نہ ہوں گے۔ اور یہ خطرہ بھی ہے کہ جو لوگ اس اخلاقی ارتقا کا مزاح کچھ رہے ہیں اور اس موجد

• مادرانہ جذبات کا زوال۔

ماں کا جذباتی رنج کے بجائے نوکری اور فن کار رنج اختیار کرنا۔
ان باتوں کا واضح نتیجہ انسانیت کا خاتمہ ہے۔ ہر بات ٹھیک ہو جائے گی، بس ایک بات
رہ جائے گی اور وہ ہے سعادت، خوشی اور وہ روحانی لذت جو کہنے کی مرکزیت سے
حاصل ہوتی ہے۔

بہر حال میرا مقصد تو یہ ہے کہ۔ عورت کی مکمل آزادی و خود مختاری کے حامی بھی،
باپ کو کہنے کی فضا سے نکال کر، عورت کے فطری فریضے، تولید نسل، کو ایک حق اور امداد
کا سبب مانتے ہیں اور کبھی تو اسے مزدوری اور کرایے کے طور پر حکومت پر ذمہ داری
ڈالتے ہیں کہ وہ اس حق کو ادا کرے۔ برخلاف شوہر کے جس کا فطری فریضہ اس کے جواب
میں کوئی حق طلب نہیں کرتا۔

دنیا بھر کے مزدوروں کے لیے جو قانون ہے اس میں مزدوری کی کم سے کم مقدار
میں بھی بیوی بچوں کے خرچ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی۔ دنیا بھر کے قوانین میں
بیوی بچوں کا نفقہ قانونی طور پر مانا جاتا ہے۔

کیا حقوق انسانی کا منشور
عورت کی توہین کرتا ہے؟
”جو بھی کام کرے اسے منصفانہ مزدور
ہے“

اور قابلِ رضامندی حق دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے کہنے کی
زندگی انسانی طریقوں سے محفوظ رہ سکے۔

دفعہ ۲۹، جر ۱ میں ہے:

”ہر شخص کا حق ہے کہ اس کی زندگی کا معیار، خود اس کی اور اس کے خاندان
کو غوراک، مکان، طبی امداد اور دوسرے معاشرتی ضروریات کی کفالت
کی جائے۔“

ان دونوں دفعات میں ضمنیہ بات مانی گئی ہے کہ جو مرد کنہہ بنائے اسے زن و فرزند کا نفقہ برداشت کرنا ہوگا۔ اور ان کے اخراجات مرد کے ضروری اخراجات میں محسوب ہوں گے۔ منشور حقوق انسانی نے باوجودیکہ تو صحیح کر دی ہے کہ مرد و زن کے حقوق مساوی ہیں پھر بھی شوہر کا بیوی کو نفقہ دینا مخالف مساوات حقوق مرد و زن نہیں قرار دیا ہے۔ بنا بریں جو لوگ ہمیشہ منشور حقوق انسانی کی تائید کرتے ہیں اور فخر یہ سند پیش کرتے ہیں کہ ملک کے دونوں ایوانوں نے اس کی تائید کی ہے وہ۔ نفقہ کے مسئلے کو حل شدہ اور مسلمہ مسئلہ سمجھ لیں۔ اور کیا مغرب پرست حضرات جو اسلام کے رنگ سے ہر رنگی ہوئی چیز کو رجعت پرستی اور غیر ترقی یافتہ بات کہتے ہیں، وہ اجازت دیں گے کہ منشور حقوق انسانی کے آئینہ محترم کی بھی تو بین قرین اور اسے بھی مرد کی مالیت اور عورت کی ملکیت کی دستاویز قرار دیں گے۔

اور آگے بڑھیے منشور حقوق انسانی پچیسویں دفعہ ہے :

”ہر شخص کا حق ہے کہ بیکاری، بیماری، اعضا کی کمی، بیوگی، بڑھاپے یا اور دوسرے مقامات کہ جہاں ارادہ انسانی سے باہر ہونے کی وجہ سے معاشی انتظام ہاتھ نہ آ سکے، وہاں آب و زندانہ زندگی سے فائدہ اٹھائے۔“

اس مرحلے میں منشور حقوق انسانی نے اس سے قطع نظر کہ شوہر کی موت کو بیوی کے لیے ذریعہ معاش کا خاتمہ مانا ہے۔ بیوگی کو بیکاری، بیماری اور نقص اعضا کی فہرست میں رکھا ہے یعنی خواتین کو بیکاروں اور بیماروں، بوزخوں اور افراد ناقص الاعضا کے برابر لکھا ہے کیا یہ خواتین کی بہت بڑی توہین نہیں ہے؟ طے ہے، اگر مشرق کے کسی علاقے میں کسی کتاب یا قانون کے اندر اس قسم کی تعبیر لوگوں کے ہاتھ آجائی تو اعتراضات و احتجاجات کا ہنگامہ آسمان تک جاتا جس کی مثال ہم اپنے بعض قوانین کے بارے میں دیکھ چکے ہیں۔

ایک حقیقت پسند اور متعاقب پر نظر رکھنے والا آدمی جو ہنگامہ آرائی سے نہ ڈرے، وہ تو بات کے تمام پہلو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ :

انسانی
نہ قانونِ تخلیق نے مرد کو، عورت کے لیے وسیلہٴ معاش بنایا ہے۔ نہ منشورِ حقوق
نے مرد کو وسیلہٴ معیشت مانا ہے اگرچہ اس نے بیوہ کو وسیلہٴ کھوپٹھنے والی کہا ہے۔ نہ قانونِ
مذمبے جو بیوی کو مرد کے لیے واجب النفقہ سمجھتا ہے کسی نے عورت کی توہین نہیں کی ہے۔
اس بات یہ ہے کہ فقیر کا ایک پہنویہ ہے کہ عورت مرد کی نیازمند پیدا ہوئی ہے اور مرد عورت
کے لیے نقطہٴ اعتماد ہے۔

زن و مرد کو زیادہ بہتر و بیشتر انداز میں باہم رہنے سے اور کہنے کے ماحول کو سعادت
و خوشحالی بشر سے استوار کرنے کی خاطر قانونِ خلقت نے ایک دوسرے کا نیازمند پیدا کیا
اس نے اگر مرد کو مالی اعتبار سے عورت کا مرکزِ اعتماد بنایا تو عورت کو نفسیاتی سکون کے
اعتبار سے مرد کا نقطہٴ اعتماد خلق کیا۔ ان دو مختلف نیازمندیوں کے سبب ایک کو دوسرے
سے قریب اور متحد رہنے میں مدد ملتی ہے۔

نواں حصہ :

مسئلہ میراث

- اسلام نے عورت کی میراث میں عدم توازن کو ختم کیا۔
- بیوی کے وارث ہونے کا پہلو، مہر و نفقہ کی بنیاد پر ہے، اس کی علت وجہ نہیں ہے۔
- اگر فقط اقتصادی پہلو زیر نظر ہوتا تو، زن و مرد کی میراث میں اسلام فرق کا قائل نہ ہوتا۔
- مرد کی میراث کا دوگنا ہونا اسی وجہ سے ہے کہ مرد کے بچے پر دوسرے بوجھ بھی پڑتے ہیں۔

خدمتہ مطاب از مولف

مسئلہ میراث

قدیم دنیا میں یا تو عورت کو ترکہ بالکل نہیں دیا جاتا تھا یا ترکہ دیتے تو تھے مگر اس سے بچوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ یعنی اسے آزادی اور قانونی حیثیت نہ دیتے تھے۔ پرانی دنیا قوانین میں کہیں لڑکی کو میراث دی جاتی تھی مگر اس کی اولاد محروم رہتی تھی، برخلاف لڑکے کے، وہ خود بھی ترکہ لےتا اور اس کی اولاد کو بھی داد کا ترکہ لینے کا حق تھا۔ دنیا کے کچھ حصوں میں عورت کو مرد کی طرح ترکہ دیتے تھے، مگر کوئی قطعی حصہ معین نہ تھا، بلکہ قرآنی تعبیر کے مطابق نصیب مفروض۔ فرض کردہ حصہ۔ صورت یہ تھی کہ مورث کو قی تھا وہ اپنی لڑکی کے بارے میں اگر چاہے تو وصیت کر دے۔

میراث قوانین کی تاریخ بہت طولانی ہے، محققین اور باخبر حضرات نے بڑی بڑی نخیں لکھی اور تحریریں چھوڑی ہیں ان کی لکھی اور کہی ہوئی باتوں کا دھرا نا ضروری نہیں سمجھتا کہ انہیں نقل کر دیا، بحث، خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔

میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب عورتوں کی میراث سے محرومی کا اصل سبب تو یہ تھا کہ دولت یک

خاندان سے دوسرے خاندان میں نہ جانے پائے، قدیم عقائد کے مطابق تولید فرزند میں لڑکے کا حصہ کم سمجھا جاتا تھا، ماں، ایک ظرف تھی جس میں باپ کا نطفہ رہتا اور پرورش پاتا اور اولاد کی صورت بن جاتا۔ لہذا وہ لڑکے کی اولاد کہلاتے اور اسی کے خاندان کا جز بنتے۔ لڑکی کی اولاد، لڑکی کے خاندان کے افراد ہونے کے بجائے اس کے شوہر کے خاندان سے متعلق مانے جاتے تھے۔ لہذا، جب لڑکی وارث ہوتی تو اس کی وراثت اس کے بچوں کو ملتی اور

جائداد دوسرے خاندان میں چلی جاتی۔

”ارت در حقوق مدنی ایران“ تالیف، ڈاکٹر موسیٰ عمید مرحوم کے صفحہ آٹھ پر یہ گفتگو ہے کہ قدیم ادوار میں خاندانوں کی بنیاد مذہب بناتا تھا، فطری روابط کا اثر نہ تھا۔ آگے لکھتے ہیں :

”مذہبی سربراہی کنہوں کے اندر ”پدر شاہی“ تھی جو بڑے باپ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے بعد مذہب کے رسم و رواج و آداب کی ادائیگی اولادِ ذکور میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی، گزشتہ زمانے کے لوگ بقائے نسل کا سبب مرد کو جانتے تھے۔ اور کنہ کا باپ جس طرح اپنے بیٹے کے لیے زندگی بخش ہوا اسی طرح اپنے رسم و رواج و مذہبی آداب، آگ کی نگہداشت، خاص بھجن بھی اسی کے سپرد ہوتے تھے۔ ہندوؤں کی وید، اور یونان و روم کے قوانین میں درج ہے کہ۔ قوتِ تولید فقط مردوں کے پاس ہے۔ اس قدیم عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانوں کے مذہب مردوں سے مخصوص ہو گئے۔ اور خواتین باپ یا شوہر کے بغیر مذہب کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی تھیں۔۔۔۔۔ چونکہ مذہبی امور انجام دینے سے محروم تھیں لہذا خاندانی امتیازات سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ اس کے بعد والے مرحلے میں جب ”وراثت“ ایجاد ہوئی تو عورتیں اسی حق سے محروم ہو گئیں۔“

خواتین کی وراثت سے محرومی کے اسباب و علل اس کے علاوہ بھی ہیں، ایک ان میں سپاہی و فوجی بننے کے لیے طاقت کی کمی ہے جس تمدن میں پہلوانی و دلاوری کی بنیاد راز و اختیار ملتا تھا، ایک فوجی کو ہزاروں غیر فوجیوں پر برتری دی جاتی تھی، یہاں عورت دفاعی اور فوجی کام نہ کرنے کی بنا پر وراثت سے محروم کی گئی۔

جاہلیتِ رد و قبل از اسلام کے عرب بھی اسی بنیاد پر میراثِ زن کے خلاف تھے اور جب تک وہ مرد کی طرح ثابت قدمی نہ دکھاتی تھی اس وقت تک ترکہ نہیں دیتے تھے۔ لہذا جب آیتِ ارث نازل ہوئی :

لِلْحَرِّ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ
أَوْ كَثُرَ نِصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ (القرآن الکریم / سورۃ النساء / ۷)

ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں مردوں کا حصہ ہے، اور والدین
واہل قرابت کے ترکے میں عورتوں کا حصہ ہے۔ خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ،
یہ حصہ عین شدہ ہے۔

عربوں کو بڑا تعجب ہوا۔ انھیں دنوں مشہور شاعر حسان بن ثابت کے بھائی
کا انتقال ہوا انھوں نے اپنے پسماندگاں میں بیوی اور کئی لڑکیاں چھوڑیں، اس کے چچا
زاد نے ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ بیوہ اور یتیموں کو کچھ نہ دیا، بیوہ اپنی شکایت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر حاضر ہوئی، آنحضرتؐ نے سب کو طلب فرمایا۔ ان
لوگوں نے کہا کہ ہم ہیں پوشمشیر کج ہوتے اور اپنا نینران عورتوں کا دفاع کرتے ہیں،
دولت بھی ہمیں ملنا چاہیے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم الہی سنایا
اور فرمانِ خدا نافذ کیا۔

منہ بولا لڑکا وارث ہوتا تھا ۱۱ جاہلیت میں عرب کسی کو بیٹا بنا لیتے تھے اور آخر
میں وہی منہ بولا لڑکا مرنے والے کا حقیقی وارث

قرار پاتا تھا۔ منہنی کی رسم دوسری قوموں میں بھی تھی، جیسے ایران، قدیم روم.....
اس رسم کے مطابق منہنی کو وہ امتیازات حاصل ہو جاتے تھے جو حقیقی بیٹوں کو حاصل نہ ہوتے
تھے۔ مثلاً منہنی کی ایک اہمیت یہ تھی کہ وہ ترکہ حاصل کرتا تھا، یا بیٹا بنانے والا منہ بولے
بیٹے کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتا تھا یہ بھی ایک امتیازی بات تھی، قرآن کریم نے اسے
بھی ختم کیا۔

ہرم پیمان کا ترکہ
(صامن الجریک)

عربوں میں یہ رسم بھی تھی کہ دو اجنبی آدمی آپس میں معاہدہ کرتے تھے :-

میرا خون تمہارا خون ہے۔ مجھ سے ٹکرتے سے ٹکرتے

میں تمہاری وراثت لوں گا تم میرے وارث بننا۔“

اس معاہدے کی رو سے یہ دونوں غیر آدمی ایک دوسرا کا دماغ کرتے، حفاظت جان و مال کرتے اور ان میں جو پہلے ملتا دوسرا اس کا وارث بنتا تھا۔

ہیوی ترکہ کا حصہ بھی

کبھی کبھی عرب، مرنے والے کی بیوہ کو بھی مال و زاد میں شمار کرتے اور میراث کا ایک حصہ سمجھ کر اس سے ہی معاملہ کرتے تھے۔ اگر مرنے والے کا دوسری بیوی سے کوئی لڑکا ہوتا تھا تو اس لڑکے کو حق تھا، وہ بیوہ کے منہ پر دو مال یا چادر ڈال دیتا اور اسے اپنے قبضہ میں لیتا، یہ اسے اختیار تھا کہ اس سے شادی کر لے یا کسی دوسرے شخص سے اس کی شادی کر دے اور اس کا مہر خود حاصل کرے۔ یہ رسم بھی عربوں کے علاوہ دوسری قوموں میں موجود تھی۔ سلام نے اسے بھی منسوخ کیا۔

ہندوستانی، جاپانی، رومی، یونانی اور ایرانی قوموں کے قوانین میں میراث کے مسئلے میں جتنی بندی بہت تھی، اگر صاحبان علم کے اطلاعات ہم نقل کرنا شروع کریں تو کئی مقالے تیار ہو جائیں گے۔

ساسانی عہد کے ایران
میں عورت کا وارث ہونا

سعد نفیسی مرحوم نے ”تاریخ اجتماع ایران از زمان ساسانیان تا انقراض امویاں“ میں صفحہ ۴۲ لکھا ہے :-

”خاندان کی تشکیل کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ نکتہ جو ساسانی تمدن میں دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جب لڑکا بالغ و دانش مند ہوتے لگتا تو باپ اپنی متعدد بیویوں

میں سے ایک کی اس سے شادی کر دیتا تھا۔ ایک اور نکتہ۔ ساسانی تہذیب میں عورت کو قانونی حیثیت حاصل نہ تھی۔ باپ اور شوہر کے اختیارات اس کی ملکیت کے بارے میں بہت وسیع تھے۔

• لڑکی پندرہ برس کی ہوتی اور جوانی آجاتی تو باپ یا خاندان کا سردار سے بیاہنے کا پابند تھا۔ لیکن لڑکے کی شادی بیس سال میں ضروری سمجھتے تھے۔

• شادی میں باپ کی رضامندی شرط تھی۔

• جو لڑکی بیاہ جاتی وہ باپ یا اپنے سربراہ کی وارث نہیں ہو سکتی تھی۔

• شوہر کے انتخاب میں لڑکی کے کسی حق کو نہیں مانتے تھے۔

• بالغ ہونے کے بعد اگر باپ شادی کرنے میں کوتاہی کرنا تو لڑکی کو ناجائز

شادی کا حق تھا مگر وہ باپ کی میراث سے محروم ہو جاتی تھی۔

• ایک مرد لا تعداد بیویاں بنا سکتا تھا، یونانی دستاویزات میں تو یہ بھی ملتا ہے

کہ ایک ایک آدمی کی کئی کئی سو بیویاں تھیں۔

• ساسانی دور میں، زرتشتی مذہبی کتابوں کے موجب شادی کے بڑے

پیچیدہ اصول تھے، اور پانچ طرح کی شادیاں عام تھیں:

۱۔ جو عورت، ماں باپ کی اجازت سے شوہر کے گھر جاتی اور اس کے یہاں بچے ہوتے

تھے تو وہ بچے اس دنیا اور دوسری دنیا میں اسی کی اولاد ہوتے۔ اسے "بادشاہ زن" کہتے تھے۔

۲۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی۔ "اوگ زن" کہلاتی یعنی، یگانہ عورت۔ اس کے یہاں

جو پہلا بچہ ہوتا وہ نانا، نانی کو دے دیا جاتا تھا کہ ان کے بیٹے کی جگہ لے لے گا۔ گویا وہ بچہ انہیں

کے گھر سے گیا تھا اور میاں بنایا تھا۔ اس کے بعد یہ عورت بھی "بادشاہ زن" کہی جاتی تھی۔

۳۔ اگر آدمی بالغ ہونے کے بعد بن بیاہر جاتا تو اس کا خاندان اجنبی عورت کو جہیز

دیتا اور غیر آدمی کے ساتھ بیاہ دیتا۔ اس عورت کو "سز زن"۔ منہ بولی بیوی۔

تھے۔ اس کی اولاد آدمی اس مردہ آدمی کی قرار پاتی اور اس دنیا میں اس کی اولاد کبھی جائے یقین تھا، اور آدمی اولاد زندہ شوہر کی ہوتی۔

۴۔ بیوہ اگر دوسرا شوہر کر لیتی تو اسے "چغرزَن" نام دیتے۔ یعنی چاکر زن، نوکر بیوی سن اگر پہلے شوہر سے اولاد رکھتی ہو تو۔ سذر زن۔ جانتے تھے۔

۵۔ ماں باپ کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر جانے والی عورتیں بہت پست سمجھی جاتی تھیں اور اس قسم کی بیوی کو "خود سری زن"۔ خود سر۔ بیوی کہتے تھے۔ لے ماں باپ کی میراث نہیں ملتی تھی اور اسے "اوگ زن" کے طور پر نکاح میں لاتے تھے۔

اسلام کی نظر میں عورت کا حصہ میراث

میراث کے سلسلے میں قوانین اسلام کے اندر گزشتہ دور میں کوئی ناہمواری موجود نہیں ہے۔ جو چیز قانون اسلام میں معترضین کے قابل اعتراض ہے وہ مرد کے مقابلے میں

عورت کا نصف ہم ہے۔ یہاں مرد و زن کی مساوات کا دم بھرنے والے بولتے ہیں۔

روکا۔ دو لڑکیوں کے برابر حصہ دار ہے۔

بھائی۔ دو بہنوں کے برابر حصہ پائے گا۔

شوہر۔ کا حصہ دو بیویوں کے برابر ہوگا۔

فقط ماں باپ کا حصہ الگ ہے، یعنی اگر مرنے والا/والی اولاد چھوڑ کر جائے اور اس کے ماں باپ بھی زندہ ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ میت کے مال سے ملے گا اس کا سبب علت کہ اسلام نے ہم وراثت عورت کو، مرد کے ہم میراث سے آدھا رکھا، خاص حالات سامنے رکھنا ہوں گے۔ جیسے، عورت، مہر، نفقہ، فوجی خدمت اور قانون سزا میں جدا گانہ قوانین رکھتی ہے۔ یعنی عورت کی میراث لینے میں خصوصی حیثیت (مطلوب) مہر و نفقہ وغیرہ کی بنیاد (علت) پر مبنی ہے۔

اسلام۔ گزشتہ مقالات میں دلائل دیے جا چکے کہ مہر و نفقہ کو رشتہ ازدواج کے

استحکام میں موثر اور کنبے کی آسائش میں ضروری عنصر اور زن و شوہر میں اتحاد کے ذرائع سمجھتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مہر اور نفقہ علی الخصوص نفقہ کو ختم کر دینا، کنبے کی نیوٹلانے اور بیوی کو فحشا و منکرات کی طرف کھینچنے کا سبب ہے۔ اس طرح عورت کی زندگی کا بچٹ کم ہو جاتا ہے اور مرد پر ایک بوجھ آ پڑتا ہے۔ اسلام جانتا ہے کہ اس بوجھ کا تدارک میراث سے کر دے۔ لہذا، شوہر کو بیوی کا دو گنا حصہ دیا۔ یعنی مہر و نفقہ نے عورت کے ہم ارث کو کم کر دیا۔

مغرب پرستوں کا اعتراض | کچھ مغرب پرست جب اس موضوع پر داد سنی دیتے ہیں اور میراث میں عورت کے حصے کو بنیاد بنا کر اسلام کے خلاف غوغا برپا کرتے ہیں۔ مہر و نفقہ کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ میراث میں عورت کا حصہ کم رکھ کر، مہر و نفقہ سے اس کا تدارک کریں؟ کیوں سیدھے کام کریں۔ کیوں گردن کے پیچھے سے ہاتھ لاکر لقمہ کھالیں ہیں پہلے عورت کا حصہ میراث مرد کے برابر کرنا چاہیے تاکہ مہر و نفقہ سے اس کا تدارک نہ ڈھونڈنا پڑے۔

اول تو ان ماں سے زیادہ محبت کرتے والی کھالوں نے علت کو معلول سمجھ رکھا ہے۔ ان کے خیال میں مہر و نفقہ، میراث خواتین کے لیے معلول ہے، ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میراث میں عورت کی حالت و خیت خاص معلول مہر و نفقہ ہے۔

دوسرے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہے وہ مالی و اقتصادی پہلو ہے اور بس ظاہر ہے کہ اگر فقط مالی اور اقتصادی پہلو ہی زیر نظر ہوتا تو کوئی دلیل نہیں تھی کہ مہر و نفقہ زیر نظر نہ آیا، پر عورت کا حصہ مرد سے مختلف ہوتا۔ جیسا کہ ہم گزشتہ مقالے میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام نے بہت سے پہلو سامنے رکھے ہیں۔ طبعی و فطری اور نفسیاتی زاویے۔ ایک طرف ضروریات اور تولید کے پہلو سے اس کی بے اندازہ مشکلات و تکالیف، جبکہ مرد اس مشکل سے آزاد ہے۔ دوسری طرف، تولید اور دولت کمانے میں مرد کی نسبت عورت میں قوت کم ہے۔ تیسری طرف، وہ مرد سے زیادہ سرمایہ استعمال کرتی ہے۔

نیز نفسیاتی اور روحانی کیفیات یعنی مرد و زن کے احساسات جدا جدا ہیں مثلاً مرد
 بیشہ عورت پر روپیہ صرف کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ اور سبب آخر میں معاشرتی و نفسیاتی
 دقیق مطالعات جو خاندانی بندھن کو مضبوط بناتے ہیں۔ اسلام نے سب باتوں کو ملحوظ رکھ
 کر مہر و نفقہ کو لازم قرار دیا۔ یہ ضروری و لازمی امور مرد کے اخراجات میں خاص ذمہ داروں
 کے بوسلٹ اسباب ہیں۔ اس کے بعد اسلام نے حکم دیا کہ ذمہ داریوں کی تلافی کے لیے مرد
 حصے کو عورت کے حصے دگن رکھا جائے۔ تو فقط مالی پہلو ہی نہیں ہے کہ سوال اٹھایا
 جائے کہ ایک جگہ عورت کا حصہ کم کر کے دوسری جگہ اس کا مداوا کرنے کی ضرورت کیا ہے۔
 ہم نے کہا ہے۔ اسلام کی نظر میں مہر و نفقہ علت
 (سبب) اور عورت کی میراث میں صورت حال معلوم
 (مُسَبَّب اور نتیجہ) ہے۔ یہ بات دورِ اول میں بھی
 موضوع بحث رہی ہے، کوئی نئی بحث نہیں ہے جو آج سامنے آئی ہو۔

میراث کے مسئلہ پر زندگیوں کا اعتراض

دوسری صدی ہجری میں ایک شخص ابن ابی العوجا گذرا ہے، یہ نہ خدا کو مانتا تھا نہ
 مذہب کا معتقد، اس دور کی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے محمدؐ عقائد کا پروپیگنڈا
 کرتا تھا، ہر جگہ پہنچتا حتیٰ کہ مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ میں بھی علما سے بحث کرنے جاتا اور تومید
 و معاد اور دوسرے اصول اسلام پر جرح و جدح کرتا تھا۔ اسدم پر اعتراضات میں اس کا
 ایک اعتراض یہ تھا:

مَا بَالُ الْمَلَائِكَةِ الْمُسْكِنَةِ الضَّعِيفَةِ تَأْخُذُ سَهْمًا وَيَأْخُذُ الرَّجُلُ

سَهْمَيْنِ۔

غریب و کمزور عورت تو ایک "ہم" (حصہ) لیتی ہے اور مرد جو اس سے زیادہ

مضبوط ہے وہ دوہرا حصہ کیوں لیتا ہے؟

یہ بات اسلامی عدل کے خلاف ہے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :
 وجہ یہ ہے کہ اسلام نے جنگجو سپاہی کی ڈیوٹی عورت اٹھالی ہے اور بعض نادانستہ
 حرم جن میں دیت ٹینا پڑتی ہے عورت کی سزا، دوسرے کی شرکت کے ساتھ معاف کر دی ہے۔
 لہذا ترکے میں عورت کا حصہ مرد سے کم رکھا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے واضح بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ میراث میں عورت کی خاص
 نوعیت معلول (نتیجہ) ہے مہر و نفقہ کا شوہر پر واجب ہونے اور فوج میں بھرتی ہونے اور
 دیت دینے سے معافی کا۔

اس قسم کے سوال تمام ائمہ علیہم السلام سے کیے گئے اور ان حضرات نے اسی انداز میں
 جواب دیے ہیں۔

دسواں حصہ :

طلاق

- — طلاق میں روز افزون اضافہ - بیسویں صدی کی بیماری -
- — آج کی دنیا ایک طرف سماجی طور طلاق کے اسباب پیدا کر رہی ہے - دوسری طرف قانون کے زور سے اسے روکنا چاہتی ہے -
- — طلاق کے بارے میں پابندی مفرور تھی -
- — شادی کا تقدس کا تقاضہ کیا یہی ہے کہ طلاق کی راہ بند کر دی جائے؟
- — سماجی مشکلات فقط قانون سے حل نہیں ہو سکتے -
- — طلاق، اسلام کی نظر میں سب سے زیادہ نفرت کی چیز ہے -
- — کیا یہ صحیح ہے کہ امام حسن مطلق بہت دیا کرتے تھے؟
- — جہاں اساسی بنیاد جذبہ ہو وہاں قانون کا جبر کچھ نہیں کر سکتا -
- — شوہر کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا ہو جائے تو کنبے کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور بیوی کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے نیم جان کر دیتا ہے -
- — اسلام، عورت کو زبردستی مرد کے سر تھوپنے کا حامی نہیں ہے -
- — یورپ نے فساد و تباہی و انحراف کو بڑھاوا دینے کی خاطر، میان

- بیوی کو برابر کا حصہ دیا ہے ۔
- مرد کو ہمارے ، بیوی جو بار ، بچے پھول اور کلیاں ۔
- میاں بیوی میں صلح و صفائی ” صلح صلح ، جیسی نہیں ہو سکتی ۔
- اسلام نے حلاق کے لیے کچھ رکاوٹیں رکھی ہیں ۔
- قرآن کی نظر میں کنبے کی عدالت ۔
- جس قانون نے شادی کو ” باہمی رفاقت “ کا روپ دیا وہی طلاق کی حقیقت
- ” سنہ کی “ بھی بنا سکتا ہے ۔
- طلاق کا حق اور اسے فسخ کا حق اور ہے ۔
- طلاق ، قطعی حق کے طور پر مرد ہی سے مخصوص ہے ، لیکن معاہدے
- کے طور پر عورت بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے ۔
- عدالتی طلاق ۔
- طلاق غیر طبعی عمل تو لید کی طرح آپریشن اور عمل جراحی ہے ۔
- اسلام کے پاس کوئی ایسا قانون نہیں جسے سرطاں کہا جائے ۔
- حق ملکیت کی راہیں بند کرنے کے سلسلے میں اسلام کی تدبیریں اور
- نمونے
- اسلامی اصول ” نگہداشت یا بحسن خوبی رانی “

حق طلاق

(۱)

خاندانی شیرازہ بکھرتے کا خطرہ، اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کبھی اس قدر نظر انداز نہیں کیے گئے جیسے اس دور میں کیے جا رہے ہیں، اور تاریخی کے کسی عہد میں آج سے زیادہ انسان عملی طور پر اس طرح خطرے سے دوچار نہیں ہوا۔
قانون بنانے والے، قانون جاننے والے، ماہرین نفسیات، ہر ایک یہی کوشش کر رہا ہے کہ ممکن وسائل سے شادی کی بنیاد استوار و مستحکم تر بنائیں کہ رخنہ نہ پڑنے پائے لیکن
بقول مولانا روم (ؒ) ہے

از قضا سر کسنگین صفر افروزد اتفاق سے سر کے نے صفر بڑھادیا

حالانکہ وہ صفرے کا علاج ہے

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ طلاق میں سالانہ اضافہ ہو رہا ہے اور اکثر خاندانوں پر تباہی کے سایے منڈلا رہے ہیں۔

عام طور سے جب کوئی بیماری خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے تو ذہنی اور مالی وسائل کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس سے مرنے والوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھی وہ بیماری ختم بھی ہو جاتی ہے۔ مگر طلاق کی بیماری اس کے برعکس روز بروز افزوں ہے۔

نئی زندگی اور طلاق میں اضافہ

پرانے زمانے میں، طلاق اور اس کے برے نتائج، اسباب و منحل طلاق، اور اس سے بچنے

کے بارے میں بہت کم توجہ کی گئی، اس کے باوجود طلاق کی اوسط کم تھی، اور زندگی کے آسان کم اجڑتے تھے۔ طے شدہ بات ہے کہ آج طلاق کے علل و اسباب بڑھتے جا رہے ہیں سماجی زندگی نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ گھریلو زندگی کے رشتے ٹوٹنے کے اسباب زیادہ پیدا ہو گئے ہیں، اور خیر خواہوں اور دانشوروں کی سعی ابھی تک کسی منزل پر نہیں پہنچ سکی اور افسوسناک بات یہ ہے کہ آئندہ خطرہ زیادہ ہے۔

نمبر ۱ ایک سو پانچ، "زن روز" میں نیوز ویک سے ایک مقابلہ کا ترجمہ چھپا تھا۔ عنوان ہے: "طلاق در امریکا"۔ سالہ لکھا ہے:

"ٹیکسی حاصل کرنے میں جو آسانی ہوتی ہے وہی آسانی طلاق حاصل کرنے میں ہے۔"

اسی مضمون میں ہے: طلاق کے بارے میں امریکیوں کے یہاں دو کہادیں سب سے زیادہ مشہور ہیں: ۱۔ مشکل ترین سمجھوتہ بھی جو میاں بیوی میں ہو سکے وہ طلاق سے بہتر ہے۔

یہ جملہ۔ تقریباً چار صدی قبل، سروائنٹس نے کہا تھا۔

۲۔ دوسرا عشق زیادہ دل پذیر ہوتا ہے۔

یسویں صدی کے نصف دوم میں "سامی کاہن" نے یہ جملہ کہا ہے بلکہ پہلے محاورے

کے خلاف ایک نعرہ لگایا ہے۔

نامبر ۲ مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری کہادت نے امریکہ میں اثر کیا ہے۔ مقالہ

کہتا ہے:

"طلاق کی سراب نے نہ فقط تازہ پیاسے"

بلکہ ان کی ماؤں اور شوہروں پر لٹے پیاسے لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے بعد سے امریکہ میں طلاق کی تعداد اوسطاً ۲۰۰,۰۰۰ طلاق سالانہ سے کم

نہیں، چالیس فی صد طلاق دس سالہ شادی یا اس سے زیادہ میں، اور بیس سالہ شادی میں

تیرہ فی صدی کی اوسط طلاق عام ہے۔ دو تین (بیس لاکھ) طلاق یافتہ عورتوں کا سن

”باوجودیکہ اطلاق کے بعد امریکی عورت اپنے ”میں آزاد سے زیادہ آزاد سمجھتی ہے، مگر مطلقہ عورتیں شاد کام نہیں رہتیں چاہے جوان ہوں یا درمیانہ عمر کی عورتیں ہوں۔ اور اس بے چینی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب و نفیاتی معاالجین کے پاس جاتی ہیں یا ہر وقت نئے میں دھت رہتے لگتی ہیں، یا ان میں روز افزوں خودکشی کا زحمان نظر آ رہا ہے۔“

یہ مقالہ ضمنی طور پر طلاق کے اسباب پر روشنی ڈالتا اور فراوانی طلاق کے بارے میں سوالات اٹھاتا ہے۔ فراوانی طلاق کا سبب میاں بیوی میں اخلاقی اختلاف ہے یا کوئی اور بات؟

عواب دیتا ہے :

اگر اخلاقی ناسازگاری کو جدائی کا سبب مان لیں تو نو جوان جوڑے کے لیے تو ایک

بات ہو سکتی ہے مگر پرانے رشتوں کے بارے میں کیا وجہ تباہی ملے گی؟ امریکی قوانین نے طلاق لینے والی عورتوں کو جو رعایت دی ہے اور اس کے پیش نظر جواب یہ ہے کہ:

دس یا بیس برس کی شادی کے بعد طلاق کا سبب ناچاقی یا طبیعتوں کا اختلاف نہیں بلکہ برسوں کی پریشانیوں کو برداشت نہ کرنے کا۔ جحان اور نئی لذتوں کی ہوس اور دوسری کامرانیوں کی آرزو ہے۔ مانع حمل گولیوں اور جنسی انقلاب نیز عورتوں کی بڑھتی قدر و منزلت نے خواتین میں یہ رجحان عام کر دیا ہے کہ خاندانی بندھنوں سے آزادی میں لذت اور خوشی زیادہ ایک یوی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ زندگی ایک ساتھ گزارتی ہے بچے پیدا ہوئی خوشی یعنی یہ ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اچانک یوی کو طلاق کی فکر پیدا ہو گئی، شوہر میں ظاہری اور اقتصادی تبدیلی بھی نہیں مگر یوی الگ ہونا چاہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ کل تک تھکا دینے والی زندگی برداشت کر رہی تھی مگر اب وہ ایک طرز کی زندگی نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ آج کی امریکی عورت کل کی عورت سے زیادہ موقع پرست ہے اور اپنی دادی کے مقابلے میں برداشت نہ رکھنے والی عورت ہے۔“

ایران میں طلاق طلاق میں فراوانی امریکہ ہی میں نہیں، یہ اس صدی کی وجہ ہے۔ جہاں بھی یورپ کے رسم و رواج عام ہوں گے وہاں طلاق کے شماریات میں اضافہ ہوگا۔ مثلاً ہم اپنے ایران ہی کو دیکھیں، شہروں میں طلاقوں کی تعداد دیہاتوں سے زیادہ ہے اور تہران جہاں مغرب کے آداب و انداز، زیادہ اثر کر چکے ہیں۔ دوسرے شہروں سے لگے۔

روزنامہ اطلاعات، شمارہ ۱۵۱۲ میں ایران کے نکاح و طلاق کے شماریات چھپے تھے جس میں تھا:

”رجسٹرڈ طلاقوں میں چوتھے سے زیادہ حصہ صرف تہران کا ہے۔ یعنی سائیس فی صد طلاق تہران میں واقع ہوئے ہیں۔ حالانکہ ملک کی آبادی کے لحاظ سے

بہرن کی آبادی دس فیصد کا تناسب رکھتی ہے مجموعی طور پر بہران میں سولہ لاکھ اور سولہ ہزار ہوتے ہیں۔ بہران میں شادیوں کی تعداد پورے ملک کی نسبت سے پندرہ فی صد ہے۔“

امریکہ میں طلاق کی انفرٹش کی ہوا:

اچھا اسے چھوڑیے، امریکہ میں طلاق کی بات آگئی تو سنیے، نیوزویک سے نقل کیا گیا ہے کہ امریکی عورت موقع پرستی اور لذت کو کہنے کی مرکزیت و نگہداشت و استحکام پر نتیجہ دیتی ہے۔ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ امریکی عورت ایسی کیوں بن گئی؟

ٹپ ہے کہ یہ امریکی عورت کی شرت نہیں ہے۔ اس رویے کی علت و وجہ معاشرہ ہے امریکی معاشرے نے امریکی عورت کو احساس درویدہ دیا ہے۔ ہمارے مغرب پرست چاہتے ہیں کہ ایرانی خواتین کو بھی اسی راہ پر ڈال دیں جس پر امریکی عورتیں چل رہی ہیں۔ اگر ان لوگوں کی یہ آرزو پوری ہو گئی تو مسلم ہے کہ ایرانی عورت اور خاندانی مرکزیت کا مقدر وہی بن جائے جو امریکی عورت اور امریکی خاندان کی قسمت ہے۔

بخت روزہ "باشاد" شمارہ ۶ (۲۲/۵/۲۰۱۶) شمارہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا:

”دیکھیے بات کہاں تک پہنچی، کہ فرانسیسی قوم کی اولاد بھی اٹھی کہ امریکیوں نے نئی شورش برپا کی ہے۔“ روزنامہ فرانس سوار کا مقالہ ہے کہ دوسرے زیادہ ریٹورنٹ اوکیسیرے، کالیفورنیا میں ایسے کھلے ہیں جہاں پیش خدہ لڑکیاں کھلے سینوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

اسی مضمون میں تحریر ہے کہ ”مونو کینی“ مایوٹی جو عورتوں کے سینہ بند کھلاتے ہیں یہ صاحب سان فرانسسکو اور لاس انجلس میں لباس کے ماہر مانے گئے ہیں۔

نیویارک میں متعدد ایسے سینماؤں کی نشان دہی کی گئی ہے جہاں کی فلمیں فقط جنسی عمل اور جنسی مسائل اور عریاں تصویریں دکھاتی ہیں۔ ان فلموں کے چند نام یہ ہیں:

”وہ شوہر جو اپنی بیویوں کا باہمی تبادلہ کرتے ہیں۔“

”وہ لڑکیاں جو اخلاق کے خلاف ہیں۔“

”جو کچھ نہیں پہنتیں۔“

ڈیٹریں کی رانبرز بری میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کی پشت پر برہنہ عورت کی تصویر نہ ہو، کلاسیکی اور ادب عالی کے تصانیف بھی اس سے خالی نہیں۔ اس قسم کی کتابیں بکثرت موجود ہیں :

”امریکی شوہروں کی جنسی حالت“

”مغربی مردوں کی جنسی حالت“

”بیس سال سے کم عمر جوانوں کی جنسی حالت“

”نئی اطلاع کی روشنی میں نئے جنسی رویے“

فرانس سوار کا مصنون نگار تعجب و پریشانی کے عالم میں خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔
امریکہ کہاں جانا چاہتا ہے ؟

بامشاد لکھتا ہے :

”ٹھیک ہے جہاں تک جانا چاہتا ہے جائے ہمارا دل تو ان مٹھی بھر

ہم وطنوں کے بارے میں جلتا ہے جن کے خیال میں انھوں نے ایک مناسب

ماڈل اختیار کر لیا ہے اور اس سلسلے میں انھیں اپنے سراپا کا ہوش نہیں

رہا ہے۔“

معلوم یہ ہوا کہ اگر امریکی عورت دیوانی ہو گئی اور کام نکالنے اور ہرجائی بننے کو ایک کی ہو رہے اور وفاداری پر ترجیح دیتی ہے، تو قصور اس کا نہیں، اس کے معاشرے نے خاندان کے مقدس مرکز پر کدال مار کر اسے نقصان پہنچایا ہے۔

”تعجب تو اس مادی گئے نعیموں پر ہے، روز بروز طلاق، اور خاندانی شیرازہ منتشر

کرنے کے معاشرتی وسائل میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے دوڑیں آگے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد غل ہے کہ طلاق کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے؟ یہ لوگ اسباب و عوامل طلاق کو روز افزوں کرتے جا رہے ہیں اور یہ شور بھی مچا رہے ہیں کہ قانون کی جکڑ بند کر کے اسے روکا جائے۔ سی کو کہتے ہیں ”کچھ دار و مرئیہ“

مفروضے:

ہم اصل مقصد پر بحث شروع کرتے ہیں۔ پہلے عقلی طور پر دیکھیں کہ طلاق اچھی چیز ہے یا نہیں؟ کیا طلاق کی راہ مکمل طور پر کھلی رہنا چاہئے؟ کیا خاندانوں کے تیسراڑوں کا لگاتار بکھرتے رہنا اچھا ہے؟ اگر طلاق اچھی چیز ہے تو پھر جو اسباب طلاق میں اضافہ کا باعث ہیں انھیں باقی رہنا چاہئے ان میں کیا برائی ہے۔ یا طلاق کا سلسلہ بالکل بند کرنا چاہئے اور شادی کا رشتہ ابدی بنا دیا جائے اور جو چیز بھی اس مقدس بندھن کو ڈھیلا کرے اسے روکنا ضروری ہے۔ یا پھر کوئی تیسرا حل تلاش کیا جائے۔ قانون کو کلیتاً میاں بیوی کے لیے یہ راستہ بند نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ کبھی کبھی طلاق لازم و ضروری ہو جاتی ہے۔ مگر قانون کی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود معاشرہ کو ایسی تدبیریں کرنا ہوں گی جن وجہ سے میاں بیویوں میں جدائی نہ ہوتے پائے۔ معاشرے کو ان اسباب و علل کا سخت مقابلہ کرنا چاہئے جن کے نتیجے میں میاں بیوی میں علیحدگی اور بچوں کی بے گھری عمل میں آتی ہے۔ یہ توصیف سی بات ہے کہ اگر سماج ایسے اسباب پیدا کرتا رہے جن سے طلاق دبوچ میں آئے تو قانون کوئی کام اور کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ قانون طلاق پر پابندی نہ لگائی جائے تو کیا صورت ہو کہ آزاد برقرار رہے۔؟ یعنی کیا یہ آزادی فقط مرد کو حاصل رہے۔ یا تنہا عورت کو یا دونوں کو حق طلاق حاصل ہو؟ پھر اگر دونوں کو حق حاصل ہو تو کیا جو تدبیر اور جو انداز طلاق

دونوں اختیار کر سکیں وہ ایک جیسا ہو؟ نکاح کے بندھن سے رہائی کا طریقہ ایک ہی قسم کا ہو؟ یا اچھی بات تو یہ ہے کہ میاں بیوی، دونوں کی جدائی کے لیے الگ الگ دو دروازے رکھے جائیں؟

طلاق کے لیے پانچ مفروضے بنائے جاسکتے ہیں،
۱۔ طلاق معمولی چیز ہے، طلاق کی تمام قانونی اور اخلاقی رکاوٹوں کا خاتمہ کیا جائے۔

جو لوگ کام چلاتے اور مزے چکھنے کے لیے شادی کے قائل ہیں، معاشرے میں کنہ کا احترام و تقدس انہیں مانتے، اس کے مقابلے میں ان کی توقع یہ رہتی ہے کہ شادی کا رشتہ جتنی جلدی ہو سکے توڑے اور نیا رشتہ جڑے۔ نئے میاں بیوی نہیں اور نئے مزے لوٹیں۔ وہ تو اسی مفروضہ کو پسند کریں گے۔ جو کہتے ہیں۔ ”دوسرا ہمیشہ زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔“ وہ اسی مفروضے کی حمایت کریں گے۔ اس مفروضے میں خاندان کی بنیادی اہمیت بھی نظر انداز کی گئی ہے اور کسی ایک رشتے کے دوام سے پیدا ہوتے والی مسرت و خلوص، محبت و خوش فہمی کو بھی فراموش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ کمزور اور جلد ختم ہو جانے والا مفروضہ ہے۔

۲۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ نکاح ایک مقدس عہد ہے۔ نکاح نام ہے دل و جان کی وحدت کا وہ دائمی عہد و پیمان کی حیثیت کا حامل ہے۔ اسے محفوظ و باقی رہنا چاہیے، لفظ طلاق انسانی معاشرے کی کتاب لعنت سے نکال دینا چاہیے۔ میاں بیوی شادی کرتے وقت سمجھ لیں اب موت کے علاوہ کوئی چیز دونوں میں جلد نہیں ڈال سکتی۔
کیتھولک چرچ صدیوں سے اسی کا حامی ہے اور کسی قیمت پر اس مفروضے یا عقیدے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اس نظریے کے پرستار پوری دنیا میں رو بہ زوال ہیں اور آج کل صرف اطالیا اور کیتھولک سپانیا میں یہ قانون نافذ ہے

اطالیہ والے اس قانون کے خلاف آواز اٹھاتے اور تحریکیں چلاتے رہتے ہیں کہ یہ قانون ختم ہو اور طلاق کو قانونی حیثیت مل جائے۔ اب وہ اس تکلیف دہ صورت حال کو مزید بدولت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

تیسرے پہر کی اشاعت ڈیلی اسپرس میں ایک مضمون چھپا تھا:

”ازدواج درایتالیا یعنی بندگی زن“

یہ (فارسی ترجمہ) میں نے پڑھا تھا، مضمون میں درج تھا، موجودہ صورت حال میں طلاق نہ ہونے کی وجہ سے اطالیہ میں عملی طور پر بہت سے لوگ خلاف قانون جنسی عمل کرتے ہیں۔ اس مقالے کی تحریر کی بنیاد پر ”موجودہ صورت یہ ہے کہ پانچ ملین اطالوی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی سوائے گناہ اور ناجائز تعلقات کے اور کچھ نہیں۔“

اسی روزنامے (ڈیلی اسپرس) ”تیسرے پہر کے ایڈیشن“ میں اخبار بیکاروسے نقل کیا، کہ اطالیہ کے عوام میں منعیت طلاق سے بڑی شکلیں پیدا ہو گئی ہیں بہت سے لوگ قانون ٹانگ کر وطن چھوڑ چکے ہیں آخری دنوں ملک کی خواتین سے پوچھا گیا تھا۔ ”کیا طلاق کے قانون کا اجرا خلاف اصول مذہب ہے؟ ستانوس فی مدعورتوں نے جواب نفی میں دیا تھا۔“

چرچ اپنے عقیدے پر سختی سے قائم ہے۔ اور نکاح کے تقدس اور اس کی مضبوطی پر زور دیتا اور دیلیس پیش کرتا ہے۔ شادی کا تقدس اور رشتے کا استحکام بجائے خود ابھی بات اور قابل قبول چیز ہے۔ بشرطیکہ میاں بیوی میں یہ بندھن عملی طور پر باقی رہے حقیقتاً، کچھ ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جہاں میاں بیوی میں ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی اس وقت قانون کے زور سے انھیں نہیں چپکایا جاسکتا۔ اسے میاں بیوی کا رشتہ نہیں کہا جاسکتا۔ کلیں کے نظریے کی شکست یقینی ہے وہ دن دور نہیں کہ چرچ مجبوراً اپنے عقیدے پر نظر ثانی کرے، اس لیے میں چرچ اور اس کے موجودہ عقیدے پر اس سے زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ تیسرا مفروضہ ہے۔ نکاح۔ مرد کی طرف سے فسخ ہو سکتا ہے، بندھن کھل سکتا ہے۔ عورت اسے نہیں توڑ سکتی۔ پرانی دنیا میں یہی نظریہ تھا، مگر آج مجھے گمان نہیں کہ لوگ اس کی حمایت کرتے ہوں۔ میرے نزدیک اس پر زیادہ بحث و نظر کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ چوتھا مفروضہ یہ کہ۔ نکاح، مقدس چیز ہے، اور خاندانی مرکزیت قابل احترام ہے۔ لیکن طلاق کے دروازے شرائط اور پابندیوں کے ساتھ میاں بیوی دونوں کے لئے کھلے رہنا چاہیے اور دونوں کو اس بندگلی کے دو دروازوں سے ایک ہی انداز میں نکلنے کی اجازت ہونا چاہیے۔

میاں بیوی اور عورت و مرد کے حقوق میں مشابہت کے حامی۔ جس کی تعبیر غلطی سے مساوات حقوق سے کرتے ہیں۔ اسی نقطہ نظر کے طرف دار ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک جو پابندیاں، جو شرائط عورت پر لگے ہوں وہی مرد پر بھی عائد ہوں، اور جو تدبیر مردوں کے رشتے توڑنے کے کام آئے وہی حل عورتوں کے لیے کارآمد ہو۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظلم اور درجہ بندی ہے اور ناروا ہے۔

۵۔ پانچواں مفروضہ ہے۔ شادی مقدس عمل ہے۔ خاندانی مرکزیت محترم ہے اور طلاق قابل نفرت اور ناپسندیدہ ہے (مفوض ہے)، معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ایسے اسباب و عمل کا قلع قمع کرے جن کی وجہ سے طلاق واقع ہوتے ہیں قانون کو ناکام شادیوں کے لئے الجھن بننا چاہیئے۔ ایسے بندھنوں سے آزادی کے لیے مرد کا راستہ بھی کھلا ہونا چاہیئے اور بیوی کے لیے بھی کوئی حق نہ ہو ضروری بہتر بنانا کام بندھن سے آزاد ہونے کے لیے مرد کو جو راستہ بتایا گیا ہے۔ وہ اور ہے عورت کو جو راہ دی گئی ہے وہ اس سے ہٹ کر ہے۔ اور یہ مسئلہ بھی وہ ہے جہاں زن و مرد کے حقوق تو ہیں مگر ایک جیسے نہیں ہیں۔

یہ نظریہ اسلام ہی نے ایجاد کیا ہے اور اسلامی ملکوں میں ناقص (غیر کامل) طور پر رائج ہے اور سی کی پیروی کی جاتی ہے۔

طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ

(۲)

ہمارے زمانے میں طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے، ہر شخص فریادی ہے، سب کو سکایت ہے، جن لوگوں کے قانون میں طلاق بالکل ممنوع ہے، وہ پریشاں ہیں کہ شادی نبھنے والی نہیں، مزاج ملتے نہیں، طلاق نہیں دے سکتے۔ جن کے یہاں قانون یکس ہے، طلاق کی راہ میاں بیوی دونوں کے لیے برابر سے کٹا رہا ہے، وہ کثرت طلاق اور خاندانوں کے درم برہم ہونے، اور ناپسندیدہ نتائج کے ہاتھوں پیچ رہے ہیں، جن لوگوں نے فقط مردوں کو حق طلاق دے رکھا ہے وہ دو زاویوں سے شکوہ کرتے ہیں:

۱۔ غیر شریفانہ طلاق، کچھ لوگ کئی برس کے بندھن اور اچھے تعلقات کے بعد اچانک نئی دلہن لانے کی ہوس دل میں محسوس کرتے اور اس بیوی کو چھوڑنے پر کمر کتے ہیں جس نے اپنی عمر، جوانی، قوت اور صحت اس کے گھر میں لٹا دی، اسے تصور بھی نہ تھا کہ اس کا نرم و گرم آشیانہ اس سے چھین لیا جائے گا، وہ ایک طلاق نامہ حاصل کرتے ہی خالی ہاتھ اپنے آشیانے سے نکال دی جائے گی۔

۲۔ بعض شوہروں کا شریفانہ انداز سے طلاق نہ دینا اور ان عورتوں کا پیچھا نہ چھوڑنا جن سے ان کا نباہ ہرگز ممکن نہیں۔

اکثر ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ میاں بیوی میں خاص وجوہ سے اختلافات

بڑھتے بڑھتے ناقابل اصلاح ہو جاتے ہیں۔ صلح و صفائی کی سعی بے نتیجہ ہو جاتی ہے، زن و شوہر میں نفرت کی خلیج حاصل ہو جاتی ہے۔ دونوں عملی طور پر ایک دوسرے کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ دونوں الگ الگ زندگی گزارنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہر عقل مند نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہوتا ہے کہ رشتے کو توڑ دیا جائے اور دونوں اپنا اپنا یاشریک زندگی تلاش کر لیں۔ مگر بعض شوہر حریف کو سزا دینے کی خاطر ہمیشہ کے لیے ازدواجی زندگی سے محروم کر دیتے، اور طلاق نہیں دیتے، اور بد نصیب بیوی کو بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی تعبیر ہے ”کُلْفَ لِقَہ“ ”معلق زندگی“۔

یہ لوگ سلمان اور اسلام کا صرف نام ہی جانتے ہیں اور اسلام ہی کا نام لے کر من مائے کام کرتے ہیں لہذا جو حضرات اسلامی تعلیمات کی وسعتوں سے ناواقف ہیں ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ شبہ بیٹھ گیا کہ اسلام طلاق کو اسی طریقے پر باقی رکھنا چاہتا ہے؟ یہی لوگ اعتراض آمیز لہجے میں کہتے ہیں: کیا واقعا اسلام نے مردوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ کبھی طلاق دے کر اور کبھی طلاق نہ دے کر اپنی بیویوں کو سزا دیں اور ذہنی طور پر مطمئن بھی رہیں کہ انھوں نے اپنے شرعی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: یہ ظالمانہ کام نہیں ہے؟ اگر یہ بات ظلم نہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟ آپ تو اسلام کو ہر قسم کے ظلم کا سخت مخالف بتاتے ہیں، آپ کہتے ہیں اسلامی قوانین عدل و حق کی بنیاد پر قائم ہیں؟ اور اگر یہ کام ظلم ہے اور اسلامی قوانین بھی عدالت و حق کی بنیاد پر قائم ہیں تو ذرا ہمیں بھی بتائے کہ ان منطام کے لیے اسلام نے کیا انتظام کیا ہے؟

ان افعال کے ظلم ہونے میں کوئی بحث کی کوئی گنجائش نہیں، ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اسلام نے ان مسائل کو شہ نہیں چھوڑا ہے، اسلام نے اس بارے میں کچھ تدابیر بتائی ہیں۔ مگر ایک بات جسے بھولنا مناسب نہیں ہے وہ اس قسم کے ظلم و ستم کی راہ بند کرنے کی

ہے۔ کیا ظلم کی اس صورتِ حال کا سبب فقط قانونِ طلاق ہے، اور اس قانون کو بدل دینے سے یہ ظلم ختم ہو جائے گا؟ یا ظلم کی جڑیں کہیں اور ہیں ان مقامات کی جستجو کرنا ہوگی کیونکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں قانون کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرنے میں اسلام اور دوسرے نظریات میں فرق ہے، بعض نظریات مشکلات کا حل قانون کو بتاتے ہیں۔ اسلام کی نظر اس نکتے پر ہے کہ قانون فقط خشک اور باجمعی تعلقات میں مہواری تک تو انسان پر اثر انداز ہو سکتا ہے، مگر جب جذبات کا مسئلہ آجائے تو پھر قانون سے کام نہیں چلتا۔ وہاں دوسرے اسباب و علل اور دوسرے تدابیر سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہم ثابت کریں گے کہ ان مسائل میں اسلام نے قانون سے جہاں تک فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا فائدہ اٹھایا ہے اور اس بارے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

غیر شریعہ طلاق | سب سے پہلے ہم آج کی اپنی پہلی مشکل۔ یعنی غیر شریعہ طلاق پر گفتگو کرتے ہیں؛

اسلام طلاق کا سخت مخالف ہے، اسلام تاحقہ امکان طلاق سے روکتا ہے، اسلام نے جذباتی کی بالکل آخری تجویز طلاق قرار دی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ تھا۔ اسلام نے لگاتار بیویاں بنانے اور طلاق دینے والے۔ مطلق۔ کو دشمن خدا کا نام دیا ہے۔

الکافی میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کے پاس پہنچے اور اس سے دریافت کیا:

اپنی بیوی کا کیا کیا؟

بولا : طلاق دے دی !

فرمایا : کوئی برا کام اس نے کیا تھا ؟

جواب : جی نہیں ، کوئی برائی تو نہیں دیکھی تھی !

قصہ ختم ہو گیا ، اس نے دوسری مرتبہ شادی کر لی ، رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا : دوسری بیوی لے آئے ؟

اس نے کہا : جی ہاں !

کچھ دن بعد پھر ملاقات ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا :

اس نئی بیوی کے ساتھ کیا کیا ؟

اس نے جواب دیا : طلاق دے دی ۔

آنحضرت ﷺ نے پوچھا : اس نے کوئی برائی کی تھی ؟

— جی نہیں ، کوئی برائی تو نہیں دیکھی !

یہ بات بھی گئی گزری ہو گئی اور اس نے تیسری شادی کی ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ — شادی کر لی ؟

اس نے کہا — جی ہاں ، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کچھ دنوں کے بعد

حضرت نے اسے دیکھ کر پھر وہی پوچھا :

اس بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا ؟

— اسے بھی طلاق دے دی !

— کوئی برائی نظر آئی تھی ، اس میں ؟

— جی نہیں ، برائی تو کوئی نہیں تھی !

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا : اللہ ، اس مرد کو دشمن رکھتا اور اس شخص پر لعنت کرتا ہے

جس کی آرزو بیویاں بدلنا ہو اور اس عورت پر جس کا دل چاہتا ہو کہ شوہر بدلتی رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے کہا، ابوایوب انصاریؓ اپنی بیوی ام ایوب کو طلاق دینے والے ہیں۔ آنحضرتؐ ام ایوب کو جانتے تھے، اور جانتے تھے کہ ابوایوب کا اقدام طلاق کسی صحیح دلیل کی وجہ سے نہیں ہے۔ لہذا فرمایا:

ان طلاق ام ایوب لحوب

طلاق ام ایوب، بڑا گناہ ہے۔

• پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے خواتین کے بارے میں اتنی مرتبہ تاکید کی جس سے مجھے گھماں ہوا کہ جب تک بیوی فحش کام کا ارتکاب نہ کرے اس وقت تک طلاق مناسب نہیں۔

• امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا، آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:

اللہ کے حضور اس گھر سے زیادہ کوئی محبوب گھر نہیں جہاں شادی کا رشتہ قائم ہو۔ اور اس گھر سے زیادہ مبغوض کوئی گھر نہیں جس میں طلاق کے ذریعے رشتہ توڑا جائے، امام جعفر صادقؑ نے مزید فرمایا: قرآن مجید میں طلاق کا ذکر بار بار آیا اور طلاق کے جزیات پر قرآن نے خاص توجہ کی ہے۔ اسی کی بنا پر اللہ، جدائی سے دشمنی رکھتا ہے۔

• طبرسی نے مکارم الاخلاق میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

”نکاح کرو، مگر طلاق نہ دینا، طلاق سے عرش خدا کا پناہ جاتا ہے۔“

• امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، حضور الہی میں طلاق سے زیادہ مبغوض و قابل نفرت کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ، زیادہ طلاق دینے والے سے دشمنی (نفرت) کرتا ہے۔

شیعہ روایات کی خصوصیت نہیں، حضرات اہل سنت نے بھی اس طرح کی روایتیں لکھی ہیں۔ سنن ابوداؤد میں ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

مَا حَلََّ اللَّهُ شَيْئًا ابْعَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ

اللہ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو اسے طلاق سے زیادہ ناپسند ہو۔

مولانا روم نے مشہور داستان ”موسیٰ اور چرواہے“ میں اسی حدیث نبویؐ کی طرف اشارہ کیا ہے :

”تا تو انی پامنہ اندر طلاق

ابعض الاشیاء عندی الطلاق

رہنمایان مذہب کی سیرت یہاں بھی دیکھا ہے کہ امکان بھر طلاق سے بچتے رہے ہیں۔ اور ان کے یہاں طلاق بہت کم واقع ہوئی ہے، اور جب ایسا ہوا ہے تو کسی منطقی اور عقلی بنیاد پر ہوا ہے۔ مثلاً :

امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک عورت سے شادی کی اور کچھ دنوں بعد طلاق دی۔ لوگوں نے سب پوچھا تو فرمایا : وہ علیؑ کی دشمن تھی، پس آتش جہنم کا ٹکڑا اپنے پہلو میں نہ رکھ سکے۔ یعنی جو عورت حضرت علیؑ کی دشمن ہو، اور امام اس سے تعلقات باقی رکھیں غیر منطقی بات ہے۔ لہذا طلاق ضروری تھی۔

۱۔ دیکھئے سنن ابی داؤد۔ تفریع ابواب الطلاق۔ حدیث ۲۱۷۷ اور حدیث ۲۱۷۸

ابغض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق - ج ۲ ص ۲۵۴

امام حسنؑ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا
(کردار کشی کی مہم)

اس موقع پر اس بے بنیاد پروپیگنڈا کی بات بھی ضروری ہے جسے بنی عباس کے مجرمانہ ہاتھوں نے جنم دیا

اور اسے پھیلایا۔

عوام میں مشہور ہوا اور کتابوں میں لکھا گیا کہ فرزندِ بزرگوارِ حیدرِ کربلا حضرت حسن مجتبیٰؑ بہت شادیاں کرتے اور بہت طلاق دیتے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی تاریخِ امام حسن علیہ السلام کے سو برس بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ خبر ہر جگہ پھیل گئی اس لیے غیروں کے ساتھ اپنوں نے بھی بے تحقیقی سنائی سنائی لکھتے وقت یہ حقیقت بھول گئے کہ طلاق ایک مبنیٰ اور برا کام ہے، یہ عیش پرست و غافل افراد کا عمل ہے۔ اس شخص سے یہ بعید ہے جس کے کردار و اعمال میں سے ایک عمل پیدل حج کرنا تھا جس نے بیس مرتبہ سے زیادہ اپنا مال و متاع فقر میں تقسیم کیا، آدھا مال خود اٹھالیا، آدھا غربا کو دیدیا۔ بھلا اس مقامِ بلند اور اتنی عظیم امامت و عظمت کی حامل شخصیت سے ایسی باتوں کا کیا ربط۔

سب کو معلوم ہے کہ بنی امیہ سے بنی عباس تک انتقالِ اقتدار کے وقت سے اولادِ امام حسنؑ بنی عباس سے ہم آہنگ تھی۔ لیکن اولادِ امام حسینؑ بنی عباس کے سردار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے، خاموش رہے اور انہوں نے بنی عباس کا ساتھ نہ دیا۔ بنی عباس نے سیاسی مجبوری سے شروع شروع میں تو بنی حسنؑ سے عاجزانہ سلوک رکھا، اور انہیں اپنے سے زیادہ موزوں و بہتر ظاہر کیا، لیکن آخر میں بے وفائی دکھائی اور بہت سے ساداتِ حسنی کو قید و قتل کے ذریعے سامنے ہٹا دیا۔

بنی عباس نے اپنے سیاسی مضروبے کو آگے بڑھانے کی خاطر اولادِ امام حسنؑ کے خلاف پروپیگنڈا اور کردار کشی کی مہم چلائی۔ منجملہ اور باتوں کے ایک یہ کہانی گڑھی کہ بنی حسنؑ

کے جدِ اعلیٰ اور رسول اللہ کے چچا، ابوطالب مسلمان نہ تھے بلکہ کافر۔ نعوذ باللہ.....
لیکن آنحضرتؐ کے دو سے چچا اور ہمارے جدِ اعلیٰ عباسؓ مسلمان ہوئے اور مسلمان مرے
ابنِ امام کہ آنحضرتؐ کے مسلمان چچا کی اولاد سے ہیں۔ ان بنی حسن سے بہتر ہیں کہ لوگ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے غیر مسلم... کی اولاد سے ہیں۔ ہم خلافت کے واسطے
زیادہ موزوں ہیں۔ بنی عباس نے اس کام کے لیے دولت استعمال کی، قصے گڑھے
جس کی بنیاد پر سچ بھی حضرات اہل سنت میں کچھ لوگ کفر ابوطالب کا فتویٰ دیتے
ہیں، اگرچہ آخری دنوں کچھ اہل سنت کے محققین نے چھان بین کر کے تاریخ کے افق
روشن کیے ہیں۔

حسنى خاندان کے خلاف بنی عباس نے دوسرا موضوع چھیڑا اور کہنے لگے اس خاندان
کے جدِ اعلیٰ اپنے والد حضرت علیؓ کے بعد تختِ وِاج کے مالک ہوئے تو اپنے شوق (معاذ اللہ)
کی وجہ سے شادی و طلاق میں الجھنے لگے اور معاویہ سے جنگ کے بجائے صلح کر لی.....
خوشی کی بات ہے، عصرِ اخیر کے چند محققین نے اس مسئلے کی چھان بین کی اور دروغ
بے فروغ کی بنیاد معلوم کر لی۔ گمان غالب یہ ہے کہ منظور دوایتی کے معین کردہ قاضی
نے یہ افواہ اٹانے میں پہل کی۔ بقول ایک مورخ کے۔ اگر امام حسنؑ نے اتنی شادیاں
کی تھیں تو ان کی اولاد کی تعداد اتنی کم کیوں ہے؟ امام میں کوئی کمی نہ تھی اور مانعِ حمل
گولیوں یا استسقاء کا وہ عمل بھی اس زمانے میں رائج نہ تھا جو آج کل ہے۔

مجھے اس سادہ دل، شیعہ مذہب کے راویوں پر تعجب ہے۔ یہ لوگ خود ہی روایتیں نقل
کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار نے زیادہ طلاق دینے والے
کو خدا کے نزدیک مَنُغُوض یا ملعون بتایا ہے اور اس کے بعد ہی یہ لکھ دیا کہ امام حسنؑ
طلاق بہت دیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ تین ہی صورتیں ہیں، انہیں میں سے ایک صورت اختیار

کرنے ہو گی۔ یا یہ کہیں کہ طلاق میں کوئی عیب نہیں ہے اور خدا بہت طلاق دینے والے کو
 نہیں نہیں رکھتا۔ یا یہ مانیں کہ امام حسن علیہ السلام زیادہ طلاق نہ دیتے تھے۔ یا پھر یہ مان
 ہیں کہ امام حسنؑ اسلامی قوانین کے معاذ اللہ پابند نہ تھے۔ یہ حضرات ایک طرف احادیث
 مغویت طلاق کو صحیح و مقبر جانتے ہیں۔ دوسری طرف مقام مقدس امام حسنؑ کے سامنے
 سر جھکاتے ہیں۔ اور پھر ایک جہت میں ان کی کثرت طلاق کی بات نقل کرتے
 وراس پر نقد و نظر کیے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کچھ تو یہاں تک پہنچے کہ بقول ان کے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند
 کے اس عمل سے ناراض تھے اور معاذ اللہ منبر پر لوگوں سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے
 حسنؑ سے بیٹی نہ بیاہنا وہ تمہاری لڑکیوں کو طلاق دیتے ہیں، مگر لوگوں نے جواب
 میں کہا، یا علیؑ! ہمیں تو فخر ہو گا کہ ہماری بیٹیاں فرزند پیغمبرؐ کی بیویاں بنیں۔ ان کا دل
 چاہے وہ رکھیں نہ چاہیں تو طلاق دے دیں۔

ممکن ہے بعض طلاق کے ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہونے کا علاج یہ سمجھتے ہوں
 نہ عورت اور اس کے خاندان کو طلاق پر راضی کر لیا جائے تو نفرت وال پہنوختم ہو جائے
 نفرت طلاق اس وقت ہے جب طلاق پائے والا فریق راضی نہ ہو۔ جب عورت صداق
 میں خوشی و اعزاز محسوس کرتی ہو وہ کچھ دن کسی ایسے مرد کے ساتھ گزارنا چاہتی
 ہو جو اس کے اعزاز کا باعث ہو۔ اس صورت میں طلاق میں کیا رکاوٹ رہ جاتی ہے
 یہ بات نہیں۔ لڑکیوں کے طلاق پر باپ کی رضامندیاں، یا خود بیوٹوں کا اپنی
 طلاق پر خوشی ہونا۔ طلاق کے مبغوض و قابل نفرت ہونے میں کمی کا باعث نہیں۔ کیونکہ
 سند نکاح میں پابنداری اور خاندان کی مرکزیت میں استواری چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں
 میاں بیوی کا علیحدگی پر رضامند ہونا موثر نہیں ہے۔

اسلام نے طلاق کو قابل نفرت و مبغوض قرار دیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت کی خاطر واری ہو اور اسے راضی کیا جائے۔ یوں عورت کی پسند اور خاندان کی آمادگی حاصل کر کے طلاق سے نفرت ختم کی جائے۔

امام حسن علیہ السلام کے بارے میں غلط پروپیگنڈے کی بات ایک تو اس بے چھٹری کہ ایک تاریخی شخصیت سے جتنی جلدی ہو سکے ایک تاریخی بہتاں کو رد کیا جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خدا سے غافل کچھ لوگ یہ کام شروع کر دیں اور امام حسن کے بارے میں سنی سنائی بات کو سند و دلیل بنا کر پیش نہ کر دیں۔

خلاصہ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طلاق اور میاں بیوی میں جدائی اپنی جگہ پر اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے۔

ایک اہم سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر طلاق اس حد تک قابل بغض و نفرت ہے، **اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا**؟

کہ طلاق دینے والے شخص کو اللہ، دوست نہیں رکھتا، نفرت کے قابل سمجھتا ہے تو پھر اسلام نے طلاق کو سب سے حرام ہی کیوں نہ کر دیا؟ طلاق کو حرام قرار دینے میں اسلام کے لئے کیا رکاوٹ تھی، خاص خاص اور معین صورتوں میں جائز، باقی میں ناجائز کر دیتا؟ بالفاظ دیگر۔ کیا اسلام کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ اسلام، طلاق کے لیے کچھ شرطیں لگا دیتا کہ بس ان شرطوں کے بعد ہی طلاق کی اجازت ہے؟ اس کے بعد مجبوراً شوہر کو جانا پڑتا، جب کوئی شوہر انبی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو عدالت کو اپنے عمل کے جواز کی دلیل بتاتا، اگر عدالت کی نظر میں دلائل کافی اور اطمینان بخش ہوتے تو طلاق کی اجازت مل جاتی ورنہ نہ ملتی۔

بنیادی طور پر جملہ یہ ہے:

”حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز اللہ کے حضور طلاق ہے۔“

کیا مطلب؟ اگر طلاق حلال ہے تو قابل نفرت نہیں اور اگر قابل نفرت ہے تو حلال

نہیں۔ قابل نفرت ہونے اور حلال ہونے میں کوئی توڑ نہیں بیٹھتا۔
 ان باتوں کے علاوہ۔ کیا معاشرہ۔ یعنی وہ ادارہ جسے عدالت کہتے اور معاشرے
 کا نمائندہ جانتے ہیں۔ حقدار ہے کہ طلاق جیسے معاملے میں جو اسلام کے نزدیک قابل نفرت
 ہے۔ دخل دے اور عدالت۔ معاشرہ۔ فیصلہ دے دے کہ طلاق دینے سے ہر ہیز کر دے
 اور معاملے کو اتنا طول دیا جائے کہ شوہر اپنے ارادے پر نہ کھپتا ہے یا پھر معاشرے۔ سنی طرہ
 اجتماع۔ پر واضح ہو جائے یہ زیر بحث رشتہ کیجائی نہیں کر سکتا اب اس رشتے کو ٹوٹا ہی
 چاہیے.....

طلاق

(نظام فطرت)

(۲)

بات یہ ہو رہی تھی کہ اسلام کی نظر میں طلاق بہت زیادہ قابل نفرت و عداوت و مبغوض ہے۔ اسلام کا رجحان ہے شادی کا بندھن مضبوط و برقرار رہے۔ اس کے بعد میں نے سوال اٹھایا تھا کہ اگر طلاق اسی قدر مذموم و مبغوض ہے تو اسلام نے اسے ناجائز ہی کیوں نہ کر دیا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلام جس کام کو ناپسند کرتا ہے اسے شراب خواری و قمار بازی و ستم گری کی طرح حرام کر دیتا ہے؟ پھر طلاق کو بالکل ممنوع کیوں نہ قرار دیا اور اسے روکنے کے لیے قانون و منع کیوں نہ کیا؟ اصل نکتے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی منطوق کیا ہے کہ طلاق حلال و مبغوض ہے؟ اگر حلال ہے تو اس کے مبغوض ہونے کا مطلب کیا ہے، اور اگر مبغوض ہے تو حلال کیوں؟ اسلام ایک طرف تو طلاق دینے والے مرد کو اپنی غضب آلود نگاہوں کا نشانہ بناتا ہے، اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف جب بھی کوئی شوہر اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی، آخر کیوں؟

یہ سوالات بجا ہیں، سب راز کی باتیں یہیں تو چھپی ہوئی ہیں اصلی راز اور مطلب کی بات یہ ہے کہ زوجیت، میاں بیوی کی زندگی فطری بندھن ہے یہ کوئی رسمی معاہدہ نہیں ہے۔ فطرت میں اس کے واسطے خاص قوانین وضع ہوئے ہیں۔ بیع، اجارہ، صلح، رہن اور وکالت جیسے معاشرتی معاہدات سے یہ رشتہ مختلف ہے ان میں صرف

معاشرتی یک طرفہ قرار داد و باہمی معاملہ ہوتا ہے فطرت و خمیر کا دخل نہیں ہوتا۔
فطرت و غریزہ کو سامنے رکھ کر قانون نہیں بنایا گیا ہے۔ پیمان ازدواج میں یہ بات نہیں
یہاں فریقین کی ایک فطری خواہش۔ اصطلاحی طور پر۔ ایک خاص میکانزم کے طور پر
سٹ ہوتی ہے اور باہمی جوڑ بٹھائے جاتے ہیں۔

اس بنا پر اگر پیمان ازدواج کے خصوصی ضابطے ہیں اور وہ دوسرے عہد و پیمان
کے ضابطوں سے جلد میں تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔

شہری معاشرت کا قانون، آزادی و مساوات کا قانون
ہے۔ تمام معاشرتی معاہدے دو اصولوں پر قائم
ہوں گے، آزادی اور مساوات، کوئی دوسرا

نکاح و طلاق میں قوانین فطرت کی نگہداشت

اصول استعمال نہیں ہو سکتا۔ البتہ پیمان ازدواج اس کے برعکس، یہاں آزادی و مساوات
کے علاوہ فطرت نے کچھ اور ضابطے بھی وضع کر رکھے ہیں، اور ان قوانین و ضوابط
کی پیروی و نگہداشت ضروری ہے۔ طلاق، دوسرے معاہدات سے پہلے ہی تن فطرت
میں ایک قانون کی مالک ہے۔ آغاز کار۔ خواستگاری۔ درمیانی عمل۔ نکاح۔
میں ایک خاص قسم کی نگہداری فطرت ضروری ہے۔ آخر کار رد عمل۔ طلاق۔ میں
جیسی اس پر نظر رکھنا لازم ہے۔ (ہم سنگنی اور خواستگاری، مہر و نفقہ، اور خصوصی
تحریر پر زن و مرد کے مابین فرقی پر گزشتہ ابواب میں گفتگو کر چکے ہیں)۔ فطرت کو
چھوڑنا کوئی فائدہ مند بات نہیں "الکسیس کارل" کے بقول۔ حیات و زندگی کے
قوانین، ستاروں کے قانون جیسے سخت اور بے رحم ہیں، ان سے مقابلہ نہیں کیا
جاسکتا۔

نکاح، وحدت و اتصال ہے اور طلاق، جدائی و انفصال۔ جب فطرت نے
جوڑ بننے اور زن و مرد کے بندھن کا قانون یوں وضع کیا ہے کہ شرکت زندگی کے لیے

ایک طرف سے اقدام ہو اور دوسری طرف دلبری و دل ربائی کے طور پر شرم کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹنے کا عمل ہو، ایک سمت وہ جذبات رکھے جن سے دوسرے کو اپنی گرفت میں لینے کی فکر ہو، دوسری طرف ایسے جذبات کہ مقابل آنے والے کا دل پھین سے جب کہ نکاح کا سنگ بنیاد، محبت و اتحاد و یکسوئی کو قرار دیا گیا۔ یا محی معاہدہ و ہم کاری نہیں۔ جب کہ گھر کی تعمیر کا نقطہ نظر یہ رکھا کہ جنس لطیف مرکز ہو اور جنس درشت اس مرکز کے گرد چکر لگائے، لہذا، جدائی اور غلطی اور انتشار یا اس مرکز کا فعل بھی خاص ضابطوں سے محدود کیا گیا۔

مضمون کی پندرہویں قسط میں ایک دانشور کی بات نقل کر چکا ہوں کہ "شادی کا بندھن دراصل مردوں کے لئے قبضہ کرنے کی خاطر ایک حملہ ہے اور عورتوں کے لیے دل دل فریبی و دل ربائی کی خاطر ایک پسپائی ہے۔ مرد، چونکہ فطرتاً نرکاری حیوان ہے لہذا اس کا عمل حملہ اور جھپٹنا ہے۔ ایک مثبت عمل ہے۔ دراصل عورت، مرد کے لیے انعام ہے جو اسے لے چکنا چاہیے۔ شادی، ایک جنگ و پیکار ہے اور ازدواج شرکت زندگی اور اقتدار ہے۔"

وہ بیان جس کی بنیاد محبت و یکا نگت ہے، تعاون و رفاقت نہیں، یہاں جبر و پابندی کا عمل نہیں ہے۔ قانون کے زور و جبر سے افراد کو انصاف کی بنیاد پر تعاون و احترام پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ معاہدہ چند سال باقی بھی رکھا جاسکتا ہے۔ مگر قانون کے جبر و زور سے دو افراد کو ایک دوسری کی محبت، ایک دوسرے خلوص، ایک دوسرے پر جان نثاری کے لیے تیار نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ہر ایک اپنی خوش نصیبی کو دوسرے کی خوش نصیبی سمجھے۔

اس قسم کے تعلق کو برقرار رکھنے کی خواہش کے لیے قانونی جبر کے بجائے کوئی دوسری معاشرتی و عملی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔

ازدواج و نکاح کی فطری ٹیکنیک جس کی بنیاد پر اسلام نے اپنے قانون وضع کیے ہیں دراصل ان کی وجہ اور نتیجہ یہ ہے کہ عورت کنبہ کی جمعیت میں محبوب و محترم ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنے مرتبے سے نیچے آجائے اور مرد کی محبت کا شعلہ اس کی سمت سے ٹھنڈا ہو جائے اور مرد اس سے بے رخی اختیار کر لے تو گویا کنبہ کا ایک ستون گر گیا یعنی فطرت کی بنیاد پر ایک فطری معاشرہ بکھر گیا۔ اسلام نے خاص کوشش و تدابیر کے ہمارے کنبہ کی زندگی کو فطری انداز میں باقی رکھنا چاہا ہے۔ یعنی عورت مقام محبوبیت و مطلوبیت میں اور مرد مقام طلب و توجہ و حاضر خدمت رہنے کی منزل میں باقی رہے۔

اسلام نے عورت کو ہدایت نامہ دیا، عورت کو چاہئے:

• ہمیشہ اپنے شوہر کے لیے آراستہ پیراستہ رہے۔

• اپنی ہنرمندی کے نئے سے نئے جلوے شوہر کو دکھائے۔

• شوہر کے جنسی جذبات کو بڑھائے۔

• شوہر کی باتوں کا نفی میں جواب دے کر اس کے واسطے نئی گرہ اور ذہنی و

و نفسیاتی الجھن نہ پیدا کرے۔

ادھر مرد سے کہا:

• اپنی زوجہ سے محبت و عطف و شفقت رکھے۔

• انہماک عشق و توجہ کرے۔

• اپنی محبت نہ چھپائے۔

اس قسم کی متعدد تدبیریں اسلام نے اس لیے اختیار کیں تاکہ جنسی لذت اندوزی اپنے گھریلو دائرے میں محدود رہے۔ اسلام کی ہدایت کہ میاں بیوی کے باہمی سلوک رشتہ زن و شوہر کے کیڑے سے باہر بہت پاک صاف رہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کنبہ کا معاشرتی ڈھانچہ بکھرنے کے خطرے سے بچا رہے۔

گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ

اسلام کی نظر میں کسی زوجہ کی انتہائی توہین کی بات ہے کہ شوہر یہ کہہ دے "میں تم سے محبت نہیں کرتا مجھے تم سے نفرت ہے۔ اور اس کے بعد قانون زور و جبر کرے

اور بیوی کو گھر میں رکھنے پر مجبور کرے۔ قانون، جبراً بیوی کو شوہر کے گھر میں رکھ سکتا ہے لیکن اسے فطری درجہ، محبوبیت و مرکزیت اور میاں بیوی کی پر محبت و الفت فضا میں باقی رکھ سکے، یہ ممکن نہیں ہے۔ قانون شوہر کو زوجہ کی نگہداشت، اس کے اخراجات زندگی کی ادائیگی کا پابند کر سکتا ہے۔ مگر اسے ایک جاں نثار اور مرکز کے گرد گھومنے والا دائرہ اور ایک نقطہ نہیں بنا سکتا۔

بنا بریں جب محبت و الفت شوہر کا شعلہ بجھ جائے تو فطری ضابطے کے مطابق شادی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ اگر محبت کا شعلہ بیوی کے دل میں ٹھنڈا پڑ جائے تو کیا ہوگا؟ کیا بیوی کے رشتہ محبت توڑ لینے سے گھریلو زندگی باقی رہے گی یا ختم ہو جائے گی؟ اگر باقی رہے گی تو، میاں بیوی میں کیا فرق ہے کہ مرد کا رشتہ الفت ٹوٹنا تو گھریلو زندگی کا خاتمہ بن جائے اور بیوی کے رابطہ و الفت ختم ہونے سے وہ زندگی ختم نہیں ہوتی، آخر وجہ کیا ہے؟ اور اگر بیوی کے رخ موڑنے اور رشتہ الفت توڑنے سے بھی گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو جس وقت زوجہ، شوہر سے رشتہ توڑے تو اسی وقت نکاح کا بندھن بھی ختم مان لیں اور بیوی کو حق طلاق دے دیں۔

جواب یہ ہے کہ "گھریلو زندگی، فریقین کی دل بستگی پر موقوف ہے ایک فرد سے نہیں اور زن و مرد کی نفسیاتی تحقیق سے دونوں کا اختلاف ہم گزشتہ مقالات میں ایک ماہر نفسیہ کے حوالے سے میاں کرچکے ہیں۔ فطرت نے میاں بیوی کا رشتہ کچھ ایسا رکھ لیا ہے کہ بیوی، شوہر کے سامنے جوابدہ ہے۔ بیوی کی اصلی و حقیقی محبت و الفت کو شوہر کے احترام

و توجہ کے جواب میں استوار و پائدار ہونا چاہئے۔ لہذا بیوی کا مرد سے تعلق معلول (نتیجہ) ہے شوہر کی توجہ کا اور سب کچھ مرد سے وابستہ ہے، فطرت نے فریقین کی محبت کی کنجی شوہر کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ شوہر، اگر زوجہ سے محبت کرے اور وفاداری برتے تو زوجہ بھی اسے چاہے گی اور وفاداری برتے گی۔ یقینی طور پر عورت، مرد سے زیادہ وفادار ہوتی ہے عورت کی بے وفائی مرد کی بے وفائی کا رد عمل ہے۔

فطرت نے ازدواجِ فسخ کر کے کنجی مرد کو دی ہے، یعنی مرد، اپنی بے تعلقی و بے توجہی اور بیوی سے بے وفائی کر کے، بیوی کو سرد مہر و بے تعلقی بناتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بے مہری عورت کی طرف سے ہو تو مرد کے رشتہ الفت پر اس کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ کبھی تو اس کے جذبہ الفت میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال بیوی کی بے توجہی، طرفین کی بے تعلقی نہیں بنتی۔ مرد کی توجہ میں کمی اور اس کا خاتمہ مرگ ازدواج و خاتمہ زندگی خاوادگی ہے۔ مگر شوہر کے لیے بیوی کے جذبہ التفات کی کمی گھریلو زندگی کو مریض نیم جان بناتی ہے، لیکن بہتری اور ندرستی کی امید باقی رہتی ہے۔ جس وقت بے توجہی عورت کی طرف سے ہو تو مرد کی عقلمندی و وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی سے محبت و الفت و نرمی کا مظاہرہ کرے اور اسے عشق و الفت کی طرف واپس لائے۔ مرد کے لیے اپنے روتھے محبوب کو منانے میں کوئی سبکی نہیں، وہ قانون کے زور سے اس کی نگہداشت کر کے آہستہ آہستہ رام کر سکتا ہے۔ لیکن عورت کی توہم میں ہے، اس کے واسطے ناقابل برداشت ہے کہ وہ اپنے حامی اور عاشق کی حفاظت میں قانون کے زور و جبر کو سہارا نہ بنائے۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عورت (بیوی) کی لا تعلقی کی علت شوہر کی بدخلاقی و ظلم ہو، اگر مرد ظلم شروع کر دے اور بیوی ظلم و نقصان رسانی سے تنگ آکر دامن چھڑانا چاہتی ہو تو بات کچھ اور ہے۔ ہم اس بارے میں "مسئلہ دوم" کے عنوان سے گفتگو کریں گے۔ یعنی غیر شرعیانہ طور پر طلاق سے پہلو تہی۔ وہاں ہم بتائیں گے کہ مرد کو اجازت

نہیں دی جائے گی کہ وہ غلط فائدہ اٹھائے اور عورت کو نقصان رسانی و ستم گری کے روکے رکھے۔

خلاصہ یہ ہے۔ میاں بیوی، زن و مرد میں فرق یہ ہے کہ مرد، عورت ذات کا نیاز مند ہے اور عورت مرد کا دل چاہتی ہے، بیوی کے لیے شوہر کی حمایت اور دلی توجہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے بغیر شادی کا عمل عورت کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

ماہر نفسیات فرانسیسی خاتون کا نظریہ | زن روز، شمارہ ۱۱۳ میں "ماں کے نفسیات" کے عنوان سے ایک فرانسیسی خاتون

BEATRICE MABEAU (بیٹریس مار بے) کے مضمون کا ترجمہ چھپتا تھا۔ اس مقالے کے مندرجہ سے، اس خاتون کا نفسیات میں ڈاکٹر ہونے کے علاوہ پیرس کے ایک اسپتال میں نفسیات شناس معالج ہونے کے ساتھ ساتھ تین بچوں کی ماں ہونے کا علم بھی ہوا۔

مقالے کے بعض حصوں سے حاملہ یا بچے والی عورت کی شوہر سے محبت و مہربانی کی توقع پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتی ہیں:

"جب عورت محسوس کرتی ہے کہ وہ بہت جلد ہاں بننے اور اولاد والی ہونے

کو ہے، اسی وقت سے وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے وہ اپنے بدن کو ٹٹولنے اور سونگھنے لگتی ہے۔ خصوصاً اگر پہلا بچہ ہو تو کریدنے کی حس بہت شدید ہوتی ہے۔

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے بیگانہ ہو گئی۔ وہ اپنے وجود کا انکشاف چاہتی ہے۔ جیسے ہی وہ پیٹ میں ننھی جان کی جھین محسوس کرتی ہے۔

اسی وقت وہ کان لگاتی ہے کہ اپنے جسم میں نئے آنے والے کی ہر آواز کو سننے، بننا وجود اسے خوش قسمتی اور مسرت بخشتا ہے وہ آہستہ آہستہ گوشے میں رہنے اور

تنہائی میں بیٹھنے کی آرزو مند ہو جاتی ہے۔ وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کر لیتی ہے وہ اس ننھی جان سے خلوت میں دل بہلانا چاہتی ہے جو ابھی دنیا میں نہیں آئی۔

جس کے زمانے میں شوہروں پر ان کی بیویوں کی بڑی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں مگر ان میں سے ہے کہ مردان ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ ہونے والی مانتی ہے، شوہر سے ٹوٹے اور سمجھے اس سے محبت کرے، اس کا خیال رکھے، اس کی حمایت و مدد کرے، جب وہ اپنا پیٹ ابھرتے دیکھتی ہے، اس کے حسن کو نقصان پہنچتا ہے، استغراق آتے ہیں، تسلی ہوتی ہے، بچہ جنسنے کا خوف طاری ہوتا ہے تو اپنے شوہر کو سب باتوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ اسی نے حاملہ کیا..... شوہر کو ان دنوں بیوی سے زیادہ نزدیک رہنا چاہیے اور کنبہ کو بھی ایک غمخوار و ہمدرد باپ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بیوی بچوں سے مشکلات شادی و غم میں بات کرے، ان کی پریشان کن باتوں کو برداشت کرے۔ حاملہ عورت کی بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کے بچے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرے، عورت کی سب سے بڑی عزت و فخر کی بات ہے اس کا صاحب اولاد ہونا۔ اس وقت اگر وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کا شوہر، اس کے بہت جلد دنیا میں آنے والے بچے سے دن چسپی نہیں رکھتا۔ تو اس کا غرور و افتخار پاش پاش ہو جاتا ہے۔ وہ حقارت اور چھوٹاپن محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ ماں ہونے سے بینرا اور بچہ جنسنے کو "احتضار" و جاں کنی خیال کرنے لگتی ہے۔

ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی زچائیں، دردِ زہ زیادہ محسوس کرتی ہیں..... ماں اور اولاد کا رشتہ فقط دو افراد کا رشتہ نہیں بلکہ تین افراد کا درمیانی تعلق ہے ماں، بچہ اور باپ۔ باپ غائب ہو (بیوی کو طلاق دے چکا ہو) جب بھی ماں کی اندرونی زندگی اسی کے خیالات و تصورات سے بسر نہر رہتی ہے۔ شوہری "مادری" جذبات میں بھی بڑا موثر کردار ادا کرتی ہے.....

یہ تحفے خیالات اس دانشمند خاتون کے جو ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھی۔

وہ عمارت جس کی بنیاد جذبات پر ہے

اباچھی طرح سوچیے۔ جو مخلوق اس حد تک دوسرے مخلوق کی
نیاز مند توجہ، قلبی تعلق، حمایت اور مہم رومی کی متلاشی ہے۔
جو ہر شکل صرف "اس" کی مہربانی و توجہ کے سہارے جمیل سکتی ہے۔

اور اس کی محبت کے بغیر وہ اپنی اولاد کا صحیح مطلب بھی نہیں سمجھتی، وہ مخلوق جو دوسرے کے مفاد
وجود سے ہی نہیں بلکہ اس کے دل، دل کے جذبات کی طلب گار ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ اسے
قانون کے زور سے ایسی مخلوق سے چپکا دیا جائے جس کا نام مرد ہے؟ سخت اور اکھڑ۔

کیا یہ دھوکا نہ ہو گا کہ ہم ایک طرف بواٹھوسی اور بیویوں سے لاتعلقی کے اسباب
فراہم کریں اور عوس رانی کے نئے نئے راستے نکالیں۔ پھر قانون کے زور سے بیویوں کو
شوہروں سے جیساں رکھنا چاہیں؟ اسلام نے یہ کام کیا کہ شوہر عملی طور پر بیوی کو چاہے
اور اس سے محبت کرے، اسلام، بیوی کو شوہر کے سر تھوپنے کا اہتمام نہیں کرتا۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ارادت و خلوص کا قدم در میان ہوا اور جذبات پر تمام معاملات
کی بنیاد ہو وہاں قانون کا جبر کیا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے مقام افسوس ہو مگر مقام جبر و پابندی
بہر حال نہیں ہے۔

ایک مثال ہے۔ ہمیں علم ہے کہ نماز جماعت میں امام کی عدالت شرط ہے اور یہ بھی شرط
ہے کہ ماموین امام کی عدالت کا یقین رکھتے ہوں۔ یعنی امام و ماموین کا ربط و اجتماع، عدالت
امام اور ارادت و خلوص ماموین پر قائم ہے۔ اسی وجہ سے یہ اجتماع و تعلق جبر و پابندی
قبول نہیں کر سکتا۔ تنہا قانون اسے دوام و استحکام نہیں دے سکتا۔ اگر ماموم اپنے امام جاعت
سے رابطہ توڑ لیں اور خلوص و ارادت ختم ہو جائے تو ربط و اجتماع درہم برہم ہو جائے گا۔
اس ارادت کا خاتمہ چلے درست ہو یا غلط۔ فرض کر لیجئے کہ امام جماعت واقعاً عدالت تقویٰ
اور صلاحیت کے اعلیٰ درجے پر بھی فائز ہو۔ جب بھی ماموین کو اپنی اقتدار پر مجبور نہیں کر سکتا
قابل مضحکہ ہو گا کہ یہ امام جماعت کچھری میں ماموین کے خلاف درخواست دائر کرے کہ لوگ

میرے ارادت کیوں نہیں رکھتے؟ لوگ میرے معتقد کیوں نہیں؟ اور آخری بات یہ ہے کہ لوگ میرے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ دراصل ایک امام جماعت کے مرتبے کی توہین ہے کہ عوام کو قوت و جبر سے اپنی اقتدار پر مجبور کرے۔

نمائندہ اسمبلی اور عوام کا رابطہ بھی، اسی قدر کا رابطہ ہے، یعنی انتخاب کرنے والے اور منتخب ہونے والے کا رابطہ، تعلق و عقیدہ و یقین پر استوار ہوتا ہے۔ اسی رابطہ کا دار و مدار، جذبات اور دل اور معاشرے پر موقوف ہے۔ اگر عوام کسی شخص کو ووٹ نہ دیں، تو ان سے جبراً ووٹ لیے نہیں جاسکتے۔ خواہ عوام کو دھوکا ہی کیوں نہ ہو اور امیدوار اپنی جگہ واقف اہل اور اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتا ہو۔ شرائط انتخاب بھی پورے موجود ہوں، کیونکہ الیکشن کی فطرت اور ووٹ دینے کا مروجہ جبر کے خلاف ہے۔ یہ شخص کچھری میں اپنی صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر فریاد نہیں کر سکتا کہ جناب میں اتنا فاضل ہوں لیکن علم مجھے ووٹ نہیں دیتے۔

ایسے مراحل میں کرنے کا کام ہے، عوام کی فکری سطح ہموار و بلند کرنا اور ان کی صحیح تربیت ہے جس کے بعد لوگ اپنی دینی ذمہ داری ادا کرتے وقت (نماز ادا کرنے کے لیے) واقعی عادل افراد پیدا کریں، ان سے ارادت رکھیں۔ یا خلوص اور صحیح جذبے سے امیدوار کو ووٹ دیں۔ اس کے بعد بھی اگر رائے بدل دیں، ارادت چھوڑ دیں اور بلاوجہ کسی دوسرے کے پیچھے چل کھڑے ہوں تو افسوس کی جگہ ہے۔ جبر و زور کا دخل بیکار ہے۔

کنسہ کا فرض بھی بالکل مذہبی فریضے اور معاشرتی ذمہ داری جیسا ہے۔ لہذا اچھی بات یہی ہے کہ ہم مان لیں کہ اسلام، گھریلو زندگی کو ایک فطری معاشرہ مانتا ہے، اور اس فطری اجتماع کو خاص تکنیکی عمل سمجھتا ہے۔ اس تکنیک کی نگہداشت ضروری اور اس سے انحراف کو غلط قرار دیتا ہے۔

اسلام کا بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے اس تکنیک کی نشان دہی کی جب کہ مغرب آج تک

گھریلو مشکلات پر قابو نہ پا سکا بلکہ آئے دن مشکلات میں اضافہ کر رہا ہے۔ جس کا سبب فطری تکنیک سے غفلت ہے۔ البتہ خوش قسمتی کی بات ہے، اعلیٰ تحقیقات آہستہ آہستہ یہ راستہ روشن کر رہے ہیں۔ میں چمکتے سورج کی طرح دیکھ رہا ہوں، مغربی دنیا علم کی روشنی میں، اسلام کے اصول اپنے گھریلو نظام میں قبول کر لیں گے۔ میں اسلام کے نورانی تعلیمات اور مستحکم اصول کو عوام کے ان رویوں سے ہم آہنگ نہیں مانتا جنہیں وہ اسلام کے نام سے اپاتے ہیں۔

گھریلو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوات سے بھی اہم ہے۔

اسلام نے مساوات کے اس مسئلے کو جس طرح حل کیا ہے یہ لوگ اس سے غافل ہیں، فطر نے فقط شہری معاشے میں مساوات کا قانون وضع کیا ہے۔ لیکن گھریلو معاشے میں مساوات کے علاوہ بھی قانون وضع کیے ہیں۔ کیسی "مساوات" گھریلو تعلقات منظم کرنے کے لیے کافی نہیں، اخاندانی معاشے میں فطرت کے دوسرے قوانین کو بھی معلوم کرنا چاہیے۔

فساد میں مساوات

انوس، کہ مساوات برابری کی تحرار اور اس کی تعلیم نے اپنی اصل خوبی و خصوصیت ہاتھ دھو لیا بہت کم سوچا جاتا ہے کہ برابری سے مراد حقوق برابری ہے۔ عام خیال کے مطابق بس یہ کافی ہے کہ "مساوات" کا مفہوم جہاں بھی صادق آگیا، بات پوری ہوگئی۔ ان بے خبر لوگوں کے خیال میں، ماضی میں مرد، عورت جھوٹ بولتے تھے۔ آج کل عورتیں مردوں سے جھوٹ بولتی ہیں، لہذا سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے میں مساوات قائم ہوگئی۔ ماضی میں دس فیصد شادیاں مردوں کے ہاتھوں طلاق تک پہنچتی تھیں۔ اب دنیا کے بعض حصوں میں چالیس فیصد طلاق دی جا رہی ہے، ان میں بیس فیصد عورتوں کی طرف سے ہیں لہذا جشن منایا جائے کہ مکمل مساوات قائم ہوگئی۔ گذشتہ زمانے میں مرد پاکستانی وپر میزگار نہیں تھے۔ آج۔۔ عورتیں بھی خیانت کا رہو گئیں وہ بھی پاک دامنی وپر میزگاری

چھوڑ بیٹھیں، اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟۔ مساوات زندہ باد۔ فرق مدارج مردہ باد۔ پہلے زمانے میں مرد بے رحمی و سختی کا مظاہرہ کرتے تھے، مرد، دل نواز بچوں کا باپ ہوتے ہوئے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نئی نئی معشوقہ تلاش کرتے پھرتے تھے، آج دیرینہ پیوند بیویاں برسوں کی گھریلو زندگی اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ چھاڑ، مجلسِ قص میں ایک مرد کی آشنائی کر کے انتہائی قساوت و بے رحمی سے گھر اور آشیانے کو چھوڑ کر، ہوس رانی کے پیچھے رواۃ ہو جاتی ہیں۔ واہ، واہ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے، میاں بیوی ایک ترازو میں آگے برابری قائم ہو گئی۔

یہ ہے۔ دوا کے بجائے معاشرے کے بے شمار دردوں میں اضافے۔ میاں بیوی کے تقاضوں کی اصلاح اور کنبہ کی مرکزیت کو استوار کرنے کے بجائے آگے دن اسے کمزور اور متزلزل کرنے کی فکریں قص اور رواج کہ شکر ہے۔ کچھ تو۔ مساوات کی طرف بڑھ رہا ہیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ بیویاں، فساد و انحراف و بے رحمی میں مردوں سے آگے جا رہی ہیں۔



اب واضح ہو گیا کہ اسلام نے طلاق کو مبغوض اور قابلِ نفرت قرار دینے کے باوجود اس کے سامنے قانونی رکاوٹ کیوں نہ کھڑی کی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ ”حلالِ مبغوض“ کے کہتے ہیں، اور ایک چیز حلال ہونے کے باوجود بے حد قابلِ نفرت و دشمنی کیسے ہو سکتی ہے۔

۱۔ عقد ازدواج

شہید مطہری، فقیہ و فلسفی ہیں، ان کی بحث، قانون مملکت اور قانون اسلام دونوں سے مربوط ہے اس لیے عام قاری کو پہلی نظر میں مطلب تک پہنچنے میں بہت سوچنا پڑے گا۔ مثلاً: ”عقد ازدواج عقود لازم میں ہے۔“ — ”عقد ازدواج بطریقاً لازم ہے“ اس بات کو سمجھنے کے لیے عقد کے اصطلاحی معنی اور منطق یا فلسفہ قانون اسلام میں ”لازم و لزوم“ کے معنی سمجھنا ہوں گے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

عقد: بندھن، گرہ۔ (فلسفہ کی اصطلاح میں) اصراف جسم کا جمع ہونا۔ اصطلاح فقہ میں یہ اصطلاح۔ باب معاملات و نکاح میں استعمال ہوتی ہے، جس کے مطلب میں: ایجاب و قبول یا شرعی طور پر معتبر خاص رابطہ۔ بیع، ہبہ، وقف، نکاح جیسے امور میں ایک شخص معین قانونی کلمہ یا کلمات ادا کرتا ہے دوسرا شخص اسے قبول کا اظہار کرنے والے کلمات زبان سے کہتا ہے، اس کے بعد عقد قائم ہو جاتا ہے مثلاً عقد ازدواج و نکاح میں عورت یا اس کا وکیل کہے ”ذو حبت ...“ مرد یا اس کا وکیل کہے ”قبِلْتُ ...“ وغیرہ یہ عقد صحیح و شرعی ہے۔ اس کے بعد کچھ حقوق و فرائض، کچھ آزادیاں کچھ پابندیاں ان دونوں عقد کرنے والوں پر عائد ہو جاتی ہیں۔ ایجاب و قبول کرنے والے ”متعاقدین“ کہے جاتے ہیں۔

عقد کے بعد منطقی لحاظ سے متعاقدین کے درمیان عقد ”التزام“ کی صورت رکھتا ہے؟ اس میں بحث ہے۔ کچھ لوگ۔ ایک چیز کے متعلقے میں متعاقدین کے عقد کو التزام مانتے ہیں یعنی لزوم و التزام نہیں مانتے۔ بحث کی بنیاد یہ ہے کہ عقد مقولہ فعل ہے اور۔ التزام مقولہ اضافت۔ جو حضرات ان میں التزام مانتے ہیں وہ عقد کرنے والے دونوں افراد کے درمیان عقد معاہدے کہ مقولات کی بحث سے الگ کرتے اور ”لزوم“ پر اصرار کرتے ہیں۔ اور جو حضرات لزوم کا انکار کرتے ہیں وہ ایجاب و قبول کی تکنیک اور اس سے دو مفہوم حقیقی و منطقی کا اثبات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ کے تین مدلول (معنی یا مفہوم) ہوتے ہیں۔ مطابق، تفسیعی اور التزامی عقد سے مراد ہے وہ ایجاب جو قبول سے مربوط ہے۔ اور جہاں ایجاب قبول سے مربوط ہو، وہاں

ایک مراد ہے یا مبادلہ۔ لہذا، تعہد (نگہداشت و پابندی) اور التزام کا ربط نہیں رہتا۔ ہاں
 التزام عقد کے احکام میں ہو سکتا ہے۔ عوارض میں ہو سکتا ہے مگر لزوم نہیں ہو سکتا یعنی متعاقدین
 نے عقد سے نہ اس کا تعلق ضروریاً نہ اس کی جدائی محال ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے کتب استدلالی
 فقہ نمبر۔ ڈاکٹر سید جعفر سجادی کی کتاب ”فرنگ معارف اسلامی“ جلد سوم حرف ع ق د۔۔۔
 مع تہران۔ ایران۔

۲۔ دیکھیے، حضرت مرزوع اعظم، آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی ”تحریر الوسیلہ“ جزو
 ثانی، ص ۲۹۴ کتاب الطلاق، القول فی الصیغۃ۔

طلاق

(کوششِ صلح کے پس منظر میں)

(۲۱)

ساتھ بحث سے معلوم ہو چکا کہ اسلام طلاق اور کسبہ کے شیرازہ بکھرنے کا مخالف اور دشمن ہے۔ اسلام نے شیرازہ خاندان کی حفاظت کے بارے میں اخلاقی و معاشرتی پیش نبیا کی ہیں اس نے طلاق کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی خاطر متعدد وسائل سے کام لیا ہے صرف جبر اور قانون کا ہتھیار استعمال نہیں کیا۔

قوت اور قانون کے اسلحہ کے زور سے شوہر کو طلاق سے روکا اور بیوی کو قانون کے جبر سے شوہر کے گھر میں رکھا جائے۔ اسلام اس کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک گھریلو ماحول میں یہ اقدام عورت کے درجے کے نمایان نشان نہیں ہے، وہ گھریلو زندگی کی بنیادی رکن اور جذبات و احساسات کا سرچشمہ ہے۔ جس شخصیت کو رشتہ ازدواج کے نرم و حسین جذبات جذب کر کے، مہر و محبت کے بادل اولاد پر برسانا ہیں وہ عورت ہے۔ شوہر کی سر دھری، اس کے شعلہ محبت کا بجھا، اس کے زوجہ سے متعلق جذبات کا خاتمہ گھریلو فضا سے گرمی اور روشنی کو ختم کر دیتا ہے۔ بات یہاں تک ہے کہ ماں کے ماورائے احساسات اولاد کے بارے میں اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے جذبات شوہر کے اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ "میٹرس مار بو" کی رائے ہم گزشتہ مضمون میں لکھ چکے ہیں، ان کے بقول ماورائے جذبات عزیزہ و فطرت نہیں ہیں۔ یعنی، ماں بہر حال غیر زوال پذیر جذبات محبت یا محکم

نہ ہونے والی مامتا اپنے بچوں کو دیتی رہے۔ بلکہ اس کے مادرانہ جذبات بڑی حد تک شوہر کی توجہ سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ بیوی کا وجود شوہر کی ذات سے جذبات و احساسات کا تاثر لیتا، اور اس کے نتائج اپنے سرچشمہ فہم سے اولاد کے حوالے کرتا ہے۔

مرد کو ہمارا اور عورت جو ہمارا اور اولاد سب نے وکل جیسے ہیں۔ چشمہ و جو ہار پہاڑ پر بارش ہوتی ہے وہ بارش کا پانی جذب کر کے، صاف و شفاف کر کے چشموں اور جو ہاروں کے حوالے کرتے ہیں یہ چشمے سبز و زاروں کو شادابی بخشتے ہیں، بارش نہ ہو، یا پہاڑ پانی جذب کرنے اور مصفا کر کے چشموں تک پہنچانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو چشمہ خشک اور گل بجئے مرجھا جائیں گے۔

جیسے بارش خصوصاً پہاڑوں کی بارش دشت و صحرائے کی زندگی کی جان ہے، گھریلو زندگی کی جان بھی شوہر کے محبتانہ جذبات اور بیوی کے ساتھ پیار کی رفتار ہے۔ اس سے بیوی بچوں کی زندگی میں چمک دمک شفافیت اور خوشیوں کی لہر دوڑتی ہے۔

جب شوہر کے اپنی زوجہ سے جذبات الفت و محبت کی منزل و تاثیر یہ ہے اور کنہ کی زندگی بلکہ روح پر اثر اتنا ہے تو پھر قانون کے اسلحہ اور ضابطے کے تازیانے سے مرد کو قابل استفادہ کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام، غیر شرعیانہ طلاق کا سخت منی لف ہے۔ یعنی ایک مرد پیمانہ رشتہ ازدواج پر دستخط کرنے کے بعد، کبھی تو کچھ مدت تک رفیق حیات رہنے کے بعد، ایک نو بیہوش و لہن کے شوق میں پرانی بیوی کو چھوڑنے کا عمل ناپسند کرتا ہے۔ لیکن اسلام کی پائے بھی نہیں ہے کہ اس 'نا جوان مرد' کو پہلی بیوی کے گھر میں رکھنے پر مجبور کیا جائے کیونکہ یہ گمراہی عالمی زندگی فطر کا قانون سے مختلف شے ہے۔

اگر زوجہ قانون کے زور اور پولیس کی مدد سے شوہر کے گھر میں واپس آجائے تو کنہ

مارشل لا تو نافذ کر سکتی ہے۔ اس گھر کی ملکہ نہیں رہ سکتی۔ وہ شوہر سے جذبات لے کر جذب کرنے اور اولاد تک پہنچانے کا وسیلہ نہیں بن سکتی وہ اپنے وجدان کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی جو محبت و توجہ شوہر سے عبارت ہے پھر وہ اپنے وجدان کو سیراب و مطمئن کیونکر رکھے گی۔

اسلام نے کوششیں کی ہیں کہ ناجوانمردی اور غیر شریفانہ طلاقوں کا خاتمہ ہو جائے اور ”مرد“ شریفانہ انداز میں اپنی بیویوں سے سلوک رکھیں اور ان کو برداشت کریں لیکن اسلام یہ نہیں چاہتا کہ قانون ساز کی حیثیت سے بیوی پر جسے وہ مرکز شیرازہ بندی خاندان، اور وسیلہ حصول تقسیم جذبات جانتا ہے زور و جبر کے ذریعے غیر شریف شوہر کے ساتھ رہا رکھتے۔

اسلام نے جو کچھ کیا ہے وہ مغرب اور مغرب پرستوں کے خلاف کیا ہے، مقابل کا نقطہ اسلام نے غیر شریفانہ رویے کے اسباب بے وفائی اور ہوس رانی سے جنگ کی اور اس پر تیار نہ ہوا کہ بیوی کو غیر شریفانہ مزاج اور بے وفا شوہر کے سر منڈھ دے۔ جبکہ مغرب اور مغرب پرست ایک طرف غیر شریفانہ عوامل کو ہر لمحہ فروغ دے رہے ہیں بے وفائی و ہوس رانی مرد کو بڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ جبر کے ذریعے ہوس راں و بے وفا و غیر شریف شوہر سے بیوی کو الٹکائے رکھیں۔۔۔۔۔

آپ تصدیق کریں گے کہ اسلام نے غیر شریف شوہر کو بیوی کی نگہداشت اور اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے دونوں کو آزادی دی اور اپنی تمام کوششیں، روح انسانیت اور شرافت کی بقا پر صرف کی ہیں۔ عملی طور پر اسلام اتنا تو بہر حال کر سکا کہ بہت زیادہ قابل توجہ حد تک طلاقوں میں کمی کر سکے۔ ران طلعے کہ دوسروں نے ان مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی اور ہر قسم کی خوش نصیبی و شاد کامی زور اور نینرے کی لوگ طلب کی ہیں۔ پھر بھی کامیابیاں بہت کم نصیب ہوئیں۔ ان طلاقوں سے قطع نظر جو باہمی تعلقات

کی خرابی یا دلقول رسالہ نیوز ویک، غورتوں کی لذت اندوزی کی بنا پر واقع ہوتی ہیں۔ فقط مردوں کی ہوس رانی کی بنا پر ہمارے یہاں دی جانے والی طلاقوں سے مغرب میں مردوں کی طرف سے دی جانے والی طلاقوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

یقیناً، میاں بیوی میں، صلح، صفائی برقرار رہنا چاہیے مگر ایسی صلح و صفائی جو ان کے باہمی رشتے پر حکمراں ہو۔ یہ صلح و صفائی اس صلح و ہم آہنگی سے مختلف ہے جو دو شریک کار، دو ہم سایے، دو پڑوسی حکومتیں اور

گھریلو صلح کا مزاج
قسم کی صلح سے جدا ہے

دو ہم سرحد سلطنتوں میں کارفرما ہوتی ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ میاں بیوی کی زندگی میں صلح و صفائی کا مقابلہ کرنا ہوتا تو اس ہم آہنگی و لطافت سے کریں جو ماں باپ اور اولاد میں ہوتی ہے، جس جاں نثاری و درگزر کے ہم پلہ کہا جاتا ہے وہ ربط جو ایک دوسرے کے مقدر سے ہو، جو دوئی کی دیوار گرا دے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی بن جائے اور ایک کی پریشانی ہو۔ برضاف اس اتفاق و دوستی کے دو

ہم کار، دو شریک یا دو ہم سایوں یا دو پڑوسی ملکوں میں ہوتی ہے۔ اس قسم کی صلح کا مطلب ہوتا ہے ایک دوسرے کے حقوق میں عدم مداخلت بلکہ دوستی و حکومتوں میں "صلح و صلح" بھی ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ تیسری قوت مداخلت کرے اور دونوں کی سرحدی لائن پر قبضہ کر لے۔ اور دونوں حکومتوں کو جنگ روکنے کا حکم دے نتیجے میں دونوں میں صلح ہو جاتی، کیونکہ سیاسی صلح کے معنی صرف عدم تصادم ہیں۔ گھر کی صلح، سیاسی صلح سے مختلف ہے۔ گھریلو صلح میں فقط ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی سے باز رہنا کافی نہیں ہے۔ گھریلو صلح میں "صلح و صلح" سے کام نہیں لیتا یہاں اس سے بڑھ کر اور کسی اہم ترین اساسی بات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی، اتحاد

یگانگت۔ دل و جان کا گھل مل جانا جیسے باپ اور اولاد کی صلح و صفائی میں ہوتا ہے۔
نکر و سے پھنے کے عند وہ کوئی بڑا مرحلہ۔ افسوس ہے کہ مغرب، نارینچی، سبب، ممکن ہے
جغرافیائی عوامل کی بنا پر گھریلو جذبات سے بے بہرہ ہے حتیٰ کہ گھریلو فضا کے اندر بھی،
وہاں، گھریلو صلح، سیاسی یا معاشرتی صلح سے جدا نہیں سمجھی جاتی، یورپ کے عوام جس طرح
دو ملکوں کی سرحدوں پر صلح برقرار رکھتے ہیں اسی انداز سے عدالتی قوت کے ذریعے
میاں بیوی کی سرحدات زندگی میں صلح قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ زن و
شوہر کی سرحدات زندگی ہیں "سرحد" کا خاتمہ ہی بنیاد حیات ہے۔ وحدت اور تیسری
قوت کو یگانہ سمجھنے کا احساس۔

مغرب پرست "اہل یورپ کو ان کی غلط فہمیاں تباہ نے۔ ان کو گھریلو مسائل اپنے فخر کی
بائیں سمجھانے کے بجائے، خود ان کے رنگ میں رنگنے کا وہ جنوں مول لے چکے ہیں کہ سر اور
پیر کا فرق یاد نہ رہا۔ لیکن یہ خود فراموشی دیر تک رہنے والی نہیں ہے، جس دن بھی
مشرق نے اپنی شخصیت دریافت کر لی، جس دن بھی مغرب کا جوا اتار پھینکا، جس دن بھی
آزادی کی فکر اور آزاد فلسفہ زندگی پر بھروسہ کر لیا اسی دن یہ عیب دور ہو جائیگا
اور وہ دن قریب ہیں۔

یہاں دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے :

اسلام، طلاق سے باز رکھنے والی
ہر بھوینر کا خیر مقدم کرتا ہے۔

① ممکن ہے، کچھ حضرات ہماری گزشتہ
گفتگو سے یہ نتیجہ حاصل کریں کہ ہم شوہر پر
طلاق کے سلسلے میں کسی رکاوٹ کے قائل

وخواہشمند نہیں ہیں۔ مرد جب طلاق دینا چاہے ہر راستہ اس کے واسطے کھلا ہو۔
نہیں۔ ایسا کوئی خیال نہیں، ہم نے اسلام کے نقطہ نظر کی توضیح میں صرف یہ بتایا ہے کہ
شوہر کے سامنے قانون کا جبر رکاوٹ بنا کر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسلام، شوہر کو طلاق

سے باز رکھنے کے لیے جو بات بھی کی جائے اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اسلام نے سوچ سمجھ کر صداق کے لیے ایسے شرائط اور ضابطے وضع کیے ہیں جو طبعی طور سے طلاق کو التوا میں ڈال کر شوہر کو اس سے موڑ دینے والے ہیں۔

اسلام نے ایک طرف 'صیغہ طلاق' و گواہ کی شرط رکھی، اور نسیحت کی سے کہ طلاق دینے والے کو طلاق سے باز رکھیں۔ دوسری طرف دو عادل گواہوں کے بغیر طلاق کو باطل قرار دیا، یعنی ان دو آدمیوں کو جن کے سامنے طلاق دے گا انھیں عدالت و تقویٰ کے ساتھ پوری سعی و کوشش کرنا ہے کہ میاں بیوی میں صلح و صفائی کرا دیں۔

آج کل، طلاق دینے والا ایسے دو عادل گواہوں کے سامنے طلاق جاری کرتا ہے جنہوں نے میاں بیوی کو نہ دیکھا بھالنا نہ جانا پہچانا، ان کے سامنے تو فقط دونوں کے نام لیگے ہیں۔ یہ بات ایسی ہے جو بجائے خود کچھ بھی ہو اسلام کے نظریے اور مقصد سے الگ ہے۔ ہمارے یہاں رسم ہے، طلاق دینے والے دو عادل ڈھونڈ لیتے ہیں اور ان کو بٹھا کر میاں بیوی کا نام لے کر صیغہ طلاق جاری کر دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:

شوہر: احمد اور بیوی، فاطمہ، میں نے شوہر کی وکالت میں ان کی بیوی کو طلاق دی۔ احمد کون صاحب ہیں اور فاطمہ نامی خاتون کی تعریف کیا ہے؟ کیا دونوں عادل حضرات جو بطور گواہ موجود، اور صیغہ طلاق سن رہے ہیں، ان دونوں کو دیکھ چکے ہیں؟ اگر کسی دن شہادت طلب کرنے کا موقع آجائے اور ان سے گواہی کی تفصیل مانگی جائے تو کیا وہ بتا سکیں گے کہ ہاں، ہمارے سامنے انھیں دو افراد کے درمیان طلاق واقع ہوئی ہے؟ یقیناً، وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ گواہی کس قسم کی گواہی ہے، مجھے نہیں معلوم۔

بہر حال شوہروں کو دو عادل گواہوں کی فراہمی طلاق سے باز رکھنے کا ایک سبب ہے۔

بشرطیکہ یہ عمل صحیح طور پر انجام دیا جائے۔ اسلام نے ازدواج یعنی بیاہن کے آغاز میں دو عادلوں کی حاضری کی شرط نہیں رکھی۔ وہ کار خیر میں تاخیر نہیں چاہتا۔ مگر طلاق، جو آخری عمل

ہے دو عادلوں کی حاضری پر موقوف کرتا اور شرط قرار دیتا ہے۔

اسلام نکاح کے وقت ماہواری آنے کو عقد میں رکاوٹ نہیں قرار دیتا، باوجودیکہ یہ معلوم ہے کہ ماہواری کے زمانے میں میاں بیوی جنسی عمل نہیں کر سکتے اور اس بات کا تعلق شادی سے ہے طلاق سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں توجہ دانی کا مرحلہ ہے اس کے بعد دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ رہے گا۔ قاعدے کے مطابق صیغہ نکاح ماہواری کے زمانے میں جاری ہونے بلکہ جائز نہ ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں کا پہلی مرتبہ یکجا ہونے کا مرحلہ ہوتا ہے اور ممکن ہوتا ہے کہ وقت عادت کا خیال نہ کریں۔ بخلاف طلاق کے جو غلطی کی کا وقت ہے اس میں ماہواری کی عادت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام چونکہ ”وصل“ کا حامی اور ”فصل“ و فراق کا مخالف ہے اس لیے زمانہ عادت کو مانع صحت طلاق قرار دیتا ہے اور مانع صحت عقد نہیں مانتا، بلکہ بعض مقامات پر تو تین مہینے تک ”ترقیق“ کو واجب قرار دیتا ہے اس کے بعد صیغہ طلاق جاری کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

صاف سی بات ہے۔ ان سب رکاوٹوں کے پیار کرنے کا مقصد یہی ہے اتنی مدت میں ان اذیتوں، اور غیظ و غضب کا زور ٹوٹ جائے جن کی وجہ سے طلاق پر آمادگی تھی، اور دونوں میاں بیوی مفاہمت پر تیار ہوں اور پہلی جیسی زندگی گزارنے لگیں۔

مزید برآں، مرد کی ناپسندیدگی کی بنا پر طلاق واقع بھی ہو جائے جب بھی ”عدے“ کے نام سے دوبارہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ فیصلہ واپس لے اور بیوی کو دوبارہ آباد کر لے۔ شادی اور عدہ، نیز اولاد کی نگہداشت کی صورت میں اخراجات شوہر کو ادا کرنے کا ضابطہ بجائے خود شوہر کے لیے عملی رکاوٹ ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص طلاق اور نئی شادی کی فکر میں ہے تو اسے پہلے تو زوجہ اولیٰ کے عدے کا نفقہ دینا ہوگا پھر بچے اس کے پاس رکھنا ہوں تو بچوں کے اخراجات ادا کرنا پڑیں گے۔ اس کے بعد نئی بیوی کا مہر اور اس کی زندگی کے اخراجات، اس کے یہاں ہونے والے بچے اور ان کے

نہرجات کے لیے تیار ہی کرنا ہوگی۔

ان سب باتوں کے علاوہ بے ماں کے بچوں کی ذمہ داری، ایسا بھیانک مستقبل سامنے لاتی ہے کہ آدمی خود بخود اپنے ارادہ طلاق کے سامنے ایک دیوار دیکھتا ہے۔

ان باتوں سے بڑھ کر، چونکہ اسلام سمجھتا تھا کہ خاندان کا رشتہ اب بھی درہم برہم ہو سکتا ہے لہذا ایک گھریلو پھری اور فیصلہ کن حاکم کا ضابطہ بنایا یعنی ایک بیوی کا نمائندہ ایک شوہر کا نمائندہ اپنے اپنے موکلوں سے حق فیصلہ لے کر ایک جا بے بیٹھیں اور ان کے جھگڑے کا فیصلہ کر کے دونوں میں صلح صفائی کر لیں۔

دونوں منصب انتہائی کوشش کریں گے اور دونوں کے گلے ترکوے ختم کریں گے۔ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اگر صلح صفائی نہ ہو سکے اور طلاق ہی بہترین حل نکلتے تو بہر حال دونوں کو الگ کر دیں۔ یہاں بھی ان آدمیوں کو ہونا بہتر ہے جن کا تعلق دونوں کے گھروں سے ہو، سورہ النساء کی آیت نمبر ۲۵ کے الفاظ یہ ہیں:

وَانْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَاِصْلَحُوا لِحُكْمٍ مِّنْ اٰهْلِهِ وَحُكْمًا مِّنْ اٰهْلِهِمَا۔ اِنْ يَرِيْدَا اِصْلَاحًا لَوْفَقَ اللّٰهِ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا،

اور اگر تم کو دونوں میں جدائی کا ڈر ہو تو ایک منصف شوہر کے خاندان اور ایک منصف زوجہ کے خاندان کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر دونوں منصف اصلاح احوال چاہیں، اللہ ان دونوں میں موافقت و اتحاد پیدا کرے گا، بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔

صاحب تفسیر کشاف نے ”حکم“ کی تفسیر میں لکھا ہے:

ای رجل متفقاً ضیاً یصلح لحکومتہ العدل والاصلاح

بینہما۔

یعنی جو شخص ثلث و منصف منتخب کیا جائے وہ مقعد ہو، اس کی بات قابل قبول اور گفتگو مضبوط و بادل لیل ہو اصلاح احوال اور عا دلانہ فیصلے کے لائق اور پسندیدہ آدمی ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے۔ پہلے مرحلے میں دونوں منصفوں کو میاں بیوی کے خاندان سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد چونکہ دونوں کے نزدیک اور باہمی فیصلوں سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور رشتے داری کی وجہ سے اجنبی کے مقابلے میں زیادہ اصلاح کرنے کے امکانات رکھتے ہیں، مینر میاں بیوی اپنے دل کی بات غیروں کے بجائے اپنوں سے زیادہ کہہ سکتے ہیں، وہ اپنے راز اور خانگی معاملات غیروں سے یوں نہیں کہہ سکتے۔

یہ مسئلہ کہ ثلثی کا تقرر واجب یا مستحب؟ علماء میں اختلاف ہے۔ محققین کے نزدیک یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور واجب ہے۔ شہید ثانی نے ”مسائلک“ میں صاف صاف فتویٰ دیا ہے کہ ثلثی کا مسئلہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا۔ واجب ضروری ہے اور حکام کا فریضہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ ذمہ داری پوری کرتے رہیں۔

سید محمد رشید رضا، مؤلف تفسیر ”المنار“ ثلثی کھٹی بنانا واجب ہے کہہ کر علماء اسلام کے فتوؤں میں اختلاف پر روشنی ڈالتے اور بتاتے ہیں کہ ثلثی واجب یا مستحب ہونے کی بحث عجیب ہے۔

عملاً اس بات سے مسلمان، اس کے بے انتہا خصوصیات سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے، طلاق کا سلسلہ بدستور ہے، اتفاق و اختلاف گھروں میں رہتا ہے، نبی قرآن، ثلثی کے بارے میں ہوتے ہوئے ذرہ بھر اس کی طرف توجہ

اور اس سے فائدہ اندوزی نہیں کی جاتی، ہاں، علماء اسلام اس کے وجوب و استحباب کے ارد گرد بحث میں سرگرم ضرور رہتے ہیں۔ کوئی یہ کہتے والا نہیں جو ان سے کہے کہ واجب و مستحب کیا، اس حکم کو نافذ کرنے کے سلسلے میں عملی اقدام کیوں نہیں کرتے؟ بحث مباحثہ ہی پر پورا زور کیوں لگ رہا ہے؟ اگر طے کر لیا ہے کہ اس حکم پر عمل نہ کیا جائے اور لوگ اس کے خصوصیات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو واجب یا مستحب ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

شہید ثانی نے ان شرائط کے بارے میں لکھا ہے جو منصفین، میاں بیوی کی مصالحت کے ذیل میں طے کریں:

”مثلاً: منصف حضرات شوہر کو پابند کریں کہ وہ اپنی بیوی کو فلاں تہر یا فلاں گھر میں رہنے کی جگہ دے، یا یہ کہ مثلاً۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر میں رہنے کی جگہ دے، یا یہ کہ مثلاً۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر یا اس کے کمرے میں نہ رکھے یا مثلاً، بیوی کا مہر جو واجب الادا ہے اسے ادا کرے۔ یا بیوی سے لیے ہوئے قرضے کو فوراً واپس کرے۔“

غرض کہ جو اقدام بھی شوہر کو طلاق سے باز رکھنے پر کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں صحیح اور مطلوب ہے۔

بایسویں مقالے میں سوال تھا۔ کیا معاشرہ یعنی وہ کمیٹی جو عدالت وغیرہ کے نام سے معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے، اس کو حق رکھتی ہے کہ طلاق کے معاملے میں مداخلت کر سکتی ہے؟ اس طلاق کے معاملے میں جو اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے، ایسا اقدام جو شوہر کو طلاق دینے کے آخری اقدام سے روک دے۔

جواب۔ یقیناً، وہ ایسا اقدام کر سکتی ہے۔ کیونکہ طلاق کے لیے ہر قسم کے حتمی فیصلے حتمی موت از دواج کی علامت نہیں ہوا کرتے۔ دوسری لفظوں میں طلاق کے

بارے تمام فیصلے لیے نہیں ہوتے جو شوہر کے شعلہ محبت کی فسادگی کی دلیل کا مل ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ بیوی اپنے مقام و درجے سے گر گئی اور وہ فطری درجہ کھو بیٹھی جس کی وجہ سے وہ شوہر کے لیے یحیثیت بیوی کے قابل نگہداشت نہ رہی۔ بہت سے فیصلے غصے، غفلت یا غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں، لہذا معاشرہ جس انداز اور جس ذریعے کو عملی اقدام کے لیے پسند کرے، اسلام اسے خوش آمدید کہتا ہے۔

ثالثی ادارہ، معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے، طلاق کی سند یا رجسٹریشن کرنے والے اداروں کو اس وقت تک قانونی توثیق سے روک سکتا ہے۔ جب تک ادارہ صلح کی تدبیروں کو جس میں ناراض ہو جب ادارہ یہ کہہ دے کہ ہمیں صلح نہ ہونے کا یقین ہو گیا ہے اور میاں بیوی دونوں میں مفاہمت ممکن نہیں ہے، اس کے بعد دفتر اور متعلقہ محکمے اپنی کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔

۲. دوسری بات یہ ہے کہ غیر شریفانہ طلاق، گھر کی مقدس مرکزیت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ خود عورت کے لیے بہت سے مشکلات پیدا کرتی ہے۔

ہے جنہیں نصر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک خاتون جو کئی برس تک خلوص و محبت کے ساتھ ایک مرد کے ساتھ اس کے گھر میں اپنے اور اس کے درمیان دوئی چھوڑ کر رہتی اور اس گھر کو آتش یا رات سمجھتی ہے۔ اس گھر کو آباد و شاد رکھنے کے لیے اپنی پوری قوت و محنت صرف کرتی ہے۔ اصطلاح جدید کی بنا پر شہر کی ترقی پسند خواتین کے علاوہ عام طور پر خواتین گھر کے کام کاج کرتی اور کھانے پہننے، گھر کا خرچ چلانے میں دکھ اٹھاتی اور کفایت شعاری سے کام لیتی ہیں، فقط بچت کی خاطر شوہروں کو خادم نوکر رکھنے سے ناراض کر دیتی ہیں۔ اپنی محنت و سلامتی، جوانی اور طاقت گھر، آشیانے اور جھونپڑے، بلکہ اپنے شوہر پر نثار کر دیتی ہیں۔ فرض کریں، ایسی بیوی کو برسوں ایک

زندگی بسر کرنے کے بعد، نئی دواہن کے شوق میں کوئی شوہر طلاق دے مارے، اور اسی گھر میں جسے خوش و خرم رکھنے کی خاطر اس نے اپنی عمر و جوانی و سلامتی و منافع کی دنیا لٹا کی تھی اب دوسری بیوی لانا چاہے اور اس سے عیش پرستی و ہوس رانی دکھائے تو بلیے ایسے عمل کی ذمہ داری کیا اور کس پر ہے؟

”یہاں اس پر بھت نہیں ہے کہ گھر کی زندگی کی مرکزیت درہم برہم ہو رہی ہے، شادی کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ جو آپ جواب دیدیں کہ شوہر کی غیر شریفانہ روش شادی کی موت ہے اور غیر شریف آدمی کے سرسی عورت کا تھوپا جانا، عورت کی فطری منزلت و مقام کے شایان شان نہیں۔“

”یہاں زیر نظر بات ہے، آوارہ و بے آشتیاں ہونے کی، اپنا سجا سجا یا بسیر ارقیب کے حوالے کرتے کی، دکھ درد، زحمت و خدمت ضائع ہونے کی بات پر گھٹگو ہے۔“

شوہر گھر کی مرکزیت، شعلہ حیات خاندان کا بجھنا، جہنم میں جائے۔ آخر ہر انسان آشتیاں اور رین بسیر کا محتاج ہے، پھر وہ بسیر جسے اپنے ہاتھوں بنایا اور بسا، اس انس خاطر تو ہوتا ہے۔ اگر کوئی پرندہ اپنے بیلے ہوئے بوٹھ سے نکال دیا جائے تو کچھ نہ کچھ مزا حمت تو کرتا ہے۔ کیا عورت کو آنا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے گھر اپنے آشتیاں کے لیے مزا حمت کرے؟ کیا یہ عمل مرد کی صرف کھلی ستم گری نہیں ہے؟ اسلام نے اس وقت کے لیے کیا حل تجویز کیا ہے؟

ہمارے عقیدے میں تو اس مشکل کی طرف پوری طرح دھیاں دینا چاہیے۔ اکثر غیر شریفانہ طلاق سے جو پریشاں پیدا ہوتی ہیں ان کا زاویہ یہی ہے۔ ان مقامات پر طلاق خاتمہ نکاح نہیں، عورت کی ٹوٹ پھوٹ اور نابودی ہے۔

گذشتہ سوال کے ضمن میں اشارہ ہو چکا ہے کہ گھر یا آشتیاں کا مسئلہ طلاق سے جدا ہے، یہ دو الگ الگ باتیں ہیں، ان دونوں کو الگ الگ ہی رکھنا ہوگا۔ اسلام

کے نقطہ نظر اور اسلامی ضابطوں کے لحاظ سے مسئلہ حل شدہ ہے۔ اس کے باوجود جو مشکلات ہیں وہ اسلامی ضابطوں سے ناواقفیت اور شوہروں کے غلط طریقے سے فائدہ اٹھانے والوں کی خوش ہنسی و وفاداری کے رد عمل سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب اکثر بیاہنے والے سمجھے کہ بیوی اپنے شوہر کے گھر میں جو کام کاج کرتی ہے اور اس کے جو فوائد ہوتے ہیں وہ شوہر سے متعلق ہیں۔ بلکہ گمان یہ کیا جاتا ہے کہ شوہر کا حق ہے کہ بیوی کو لونڈی یا مزدور سمجھ کر حکم دیا کرے اور بیوی پر واجب ہے کہ ان معاملات میں شوہر کی اطاعت کرے۔ دراصل حاکم میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ بیوی کو کام کاج میں پوری طرح آزاد ہے۔ اور جو کچھ وہ کرے گی وہ خود اپنی ذات کے لیے ہوگا، مرد کو ایک مالک کی طرح بیوی کے سامنے آنے کا حق نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی کے علاوہ اس کے اور اولاد کے اخراجات شوہر کے ذمہ واجب کیے ہیں۔ بیوی کو اچھی خاصی مہلت دی ہے کہ وہ آبرو مند زندگی کے لیے روپیہ پیسہ اور امکانات حاصل کرے کہ اگر طلاق و جدائی کا وقت آ پڑے تو شوہر سے بے نیاز اور پریشان سے آزاد ہو۔ عورت اپنے رین بسیر کو رونق دینے کے لیے جو کچھ جمع کرے وہ اپنی سمجھ، مرد کو اسے چھیننے کا حق نہیں ہے۔ مذکورہ پریشانیوں اس سماج میں ہوتی ہیں جہاں بیوی کو میاں کے گھر میں بہر حال کام کاج کرنے کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کی محنت کے نتائج شوہر کی ملکیت ہیں، بیوی کا اس سے کیا واسطہ۔ فکر مندی عوام کا تعلق ان کی لاعلمی اور قانون اسلام سے بے خبری سے ہے اور کچھ نہیں۔

دوسری وجہ شوہر کا اپنی بیوی اور اس کی وفاداری سے غلط فائدے اٹھانے سے کچھ خواتین اپنے شوہروں کے یہاں قانون اسلام سے بے خبری کی بنا پر نہیں، صرف شوہروں پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے جاں نثاری کرتی ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ دونوں میں من و تووا اپنا پرلایا نہ رہے۔ یہ پیسہ ہمارا، یہ ان کا ہے، اچھا خیال نہیں

سمجھتیں۔ لہذا، اسلام کے دیے ہوئے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی طرف دھیان نہیں دیتیں۔ اچانک جو آنکھیں کھلتی ہیں تو محسوس کرتی ہیں کہ ایک بے وفائے محبت کر کے اور جاں فدا کر کے ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت ہاتھ سے کھو دیا۔

اس قسم کی خواتین کو شروع سے دھیان دینا چاہیے کہ محبت کا موقع وہ ہے جہاں ”دونوں طرف ہوا آگ برابر لگی ہوئی“ اگر بیوی مان جمع کرنے، دولت اکٹھا کرتے، اثبات بناتے، بے سر سجاتے میں اپنا نام نظر انداز کرتی اور اپنا حق شرعی مرد کے لیے چھوڑتی، اپنی قوت مرد کو ہدیہ دیتی ہے تو شوہر کو بھی اسی انداز سے رد عمل دکھانا چاہیے:

”وَإِذَا حِیَّتُمْ بِتَحِیَّتِهِ فَحِیَّتُوا بِأَحْسَنِ مِنْهَا“ اور جب تمہیں ہدیہ دیا جائے تو تم بھی اس سے اچھا ہدیہ دو یا اسی کو واپس کر دو۔

یعنی اگر بیوی کوئی ہدیہ پیش کرتی ہے تو اسے اسی معیار ہی کا سہی کھانسی ہدیہ بیوی کو بھی نذر کرنا چاہیے۔ وفادار شوہروں کا ہمیشہ یہ دستور رہا اور آج بھی ہے کہ بیوی کی مخلصانہ فداکاری کے جواب میں قیمتی ہدیے، مکان یا اثاثہ اپنی بیوی کو نذر کیا کرتے ہیں۔

بہر حال شبانہ اجڑنے اور بے گھر ہونے کا، قانون طلاق سے کوئی تعلق نہیں، قانون طلاق کی تبدیلی اس کی اصلاح نہیں کر سکتی، اس مسئلہ کا تعلق عورت کی اقتصاد آزادی و بے آزادی سے ہے اور اسلام نے اسے حل کر دیا ہے۔ ہمارے سماج میں یہ مشکل کچھ عورتوں کی اسلامی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر دوست گروہ کی غفلت و سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔ خواتین کو اگر معلوم ہو کہ اسلام نے ان کے لیے کیا مواقع انھیں دیے ہیں۔ اور شوہر پر جاں نثاری میں سادہ لوحی کا مظاہرہ نہ کریں تو مشکل خود بخود حل ہو جائے۔

طلاق

(آزادی۔ اور حق)

(۵۱)

مطالعہ کرتے واسے کو یاد ہوگا، ہم نے بائیسویں فصل میں طلاق سے پیدا ہونے والے سماجی مشکلات دو پہلوؤں سے بیان کیے ہیں۔ ایک غیر شرعیانہ طلاق کا رخ تو شوہر کی غیر شرافت مندی وغیرہ لسانی رویہ جو طلاق دلاتا ہے۔ دوسرے، کچھ شوہر کا یہ رویہ کہ بیوی کو سزا دی جائے وہ غیر شرعیانہ طور پر طلاق نہیں دیتے، ان کا مقصد اس زوجہ کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے زندگی بسر کرنے کا ہوتا ہی نہیں۔

دو فصل پہلے حصہ اول پر بحث ہو چکی، وہاں کہا ہے کہ اسلام ہر قسم کی غیر شرعیانہ طلاق کو روکنے والے انتظامات کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے طلاق کے لیے خود اسلام بھی رکاوٹوں کی تدبیریں کی ہیں۔ اسلام خاندانی تعلقات میں قوت استعمال کرنے اور زور آوری کے ذریعے فائدہ اٹھانے کے خلاف ہے۔

ان معروضات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں اسلام ایک ”زندہ ادارہ“ ہے۔ اسلام کوشش کرتا ہے کہ یہ زندہ موجود اپنی زندگی باقی رکھے، مگر جب زندہ موجود، مر جائے تو اسے افسوس کی نظر سے دیکھتا اور دفن کی اجازت جاری کرتا ہے وہ اس مردے پر قانون کی مویائی نہیں چڑھانا چاہتا تاکہ وہ حوط شدہ لاش کو متحرک اور اٹھائے پھرا جائے۔

شوہر کو حق طلاق دینے کی علت وجہ معلوم ہو گئی۔ یعنی میاں بیوی کا رشتہ

ایک فطری علاقہ مندری ہے۔ اس کی خاص تکنیک ہے۔ اس مشینری کو مضبوط بنانے اور اسے بیکار کرنے کی دونوں کنجیاں تخلیق نے مرد کو عطا کی ہیں۔ میاں بیوی دونوں نکالے خود تخلیق کی بنیاد پر خاص پوزیشن کی مالک ہیں جن کا بدلنا یا بالکل ایک جیسا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ خاص وضع اور پوزیشن اپنی اپنی باری پر متعدد امور کی علت و سبب بنتی ہیں۔ جیسے حق طلاق۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس معاملے کی علت خاص وجہ، میاں بیوی کا خاص کردار ہے۔ محبت و عشق و رشتہ زن و شوہری ہیں۔

حق طلاق مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے، اس موقع پر آپ مخالفین اسلام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

یہ گروہ کہتا ہے کہ اسلام نے مرد کو حق طلاق اس وجہ سے دیا ہے کہ وہ عورت کو ارادہ و خواہش و آرزو کا مالک نہیں جانتا، اسلام عورت کو "چیر" سمجھتا ہے "شخص نہیں مانتا۔ اسلام شوہر کو بیوی کا مالک جانتا ہے، اسے حق دیتا ہے، جب چاہے اپنے ملک کو آزاد کر دے۔ کیونکہ،

الناس مسلطون علیٰ اموالہم
لوگ اپنے مال کے مالک و مختار ہوتے ہیں۔

ہماری گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ منطق اسلام شوہر کی مالکیت اور بیوی کی ملکیت پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کی منطق و اسلام کا فلسفہ ان لکھنے والوں کی فہم سے زیادہ عمیق اور ان کی ذہنی سطح سے زیادہ بلند ہے۔ اسلام نے گھر کی تعمیری بنیاد اور اس ادارے کی اساس، اس کے نکات اور رموزی کے اشاروں سے معلوم کیے اور ان کا سرخ لگایا ہے۔ اب چودہ سو برس بعد علم ان کی گہرائیوں کے قریب پہنچ رہا ہے۔

طلاق، اس لیے آزادی سے کہ شادی کی فطری حقیقت "رفاقت" ہے۔

کبھی کبھی یہ کہتے ہیں :-
طلاق میں آزادی (چھوڑنے)
کا انداز کیوں ہے؟ اسے یقیناً

فیصلے کا رنگ ملنا چاہیے !

ان سے کہا جائے :

طلاق آزادی درمائی اس لیے ہے کہ ازدواج و شادی رفاقت ہے۔ اگر آپ
تمام اجناس نر و مادہ سے "جوڑے" کے اس قانونِ فطرت کو بدل سکیں اور
ازدواج (جوڑے پن) کی فطری ساخت کو رفاقت کے قالب سے نکال لیں، اگر
آپ یہ سوچیں کہ جنس نر و جنس مادہ کو۔ انسان ہو یا حیوان۔ ایک کو دوسرے
جیسے اثرات دے دیں اور قانونِ فطرت بدل ڈالیں، تو پھر طلاق کو بھی "رہائی"
کے قالب سے نکال دیجیے۔

ان غاصریں سے ایک نے لکھا :

عقدِ ازدواج کو شیخو فقہاء عموماً "عقدِ لازم" شمار کرتے ہیں، بظاہر ایران کا مول
لا۔ قانون مدنی۔ بھی "عقدِ لازم" ہی جانتا ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فقہ
اسلامی اور قانون مدنی ایران کے مطابق عقدِ نکاح فقط عورت کی جہت سے
لازم ہے، مرد کی نسبت سے "جائزہ عقد" ہے کیونکہ مرد جب چاہے مذکورہ عقد
کو ختم کر دے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :

"عقدِ ازدواج مرد کی نسبت سے جائزہ اور عورت کی نسبت سے لازم ہے
ایک لاقانونیت کی بات ہے۔ یوں عورت کو مرد کا اسیر و قیدی بنادیا گیا ہے۔
میں دفعہ ۱۱۳۳، (قانون مدنی کشور شہنشاہی ایران) کے "قانون حق مرد و لطلاق"

کا مطالعہ کرتے وقت، ان ایرانی خواتین سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں، جو اس ایٹم کی صدی میں، چاند اور ڈیپاکر سی کے دور میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہی اور اس قانون کے بارے میں کیا کہیں گی !

پہلے تو یہ حضرات ایک واضح بات نہیں سمجھ سکے۔ طلاق، فسخ نکاح سے مختلف چیز ہے یہ کہنا کہ عقد ازدواج "فطرتاً لازم (بندھن) ہے" یعنی میاں بیوی میں سے کسی کو حق فسخ نہیں۔ چند مقامات مستثنیٰ ہیں۔ اگر عقد نکاح فسخ ہو جائے تو اس کے تمام اثرات بھی ختم ہو جائیں گے۔ مثلاً۔ مہر ختم ہو جائے گا، بیوی کو مہر طلب کرنے کا حق نہ رہے گا یا پھر عدت کے دنوں کا نفقہ نہیں ہوگا۔ طلاق کی صورت اس سے مختلف ہے۔ یہاں زوجیت کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد بھی عقد کے اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے شادی کرے اور فرض کیجئے پانچ سو ہزار روپے مہر ملے کرے، ایک دن میاں بیوی کی طرح رہ کر طلاق دے دے۔ اسے پورا مہر دینا ہوگا اور عدت کے دنوں کا نفقہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ دیکھیے کہ مرد عقد کرتا اور میاں بیوی کے عمل سے پہلے بیوی کو طلاق دیتا ہے، یہاں آدھا مہر ادا کرنا ہوگا، اور چونکہ اس عورت پر عدت واجب نہیں لہذا نفقہ طبعی طور پر واجب نہ ہوگا۔ تو یہ معلوم ہو گیا کہ طلاق سے نکاح کے تمام اثرات ختم نہیں ہوتے، درآئی لیکہ اگر مذکورہ نکاح فسخ ہو جائے تو بیوی کا حق مہر باقی نہیں رہتا۔ لہذا طلاق اور فسخ اور ہے۔ حق طلاق اور عقد ازدواج کے لازمی ہونے میں کوئی منافات و فرق نہیں ہے۔ اسلام کے پاس دو مدین ہیں۔ ایک فسخ اور دوسری مد طلاق ہے۔ فسخ کا حق وہاں دیا ہے، جہاں کچھ عیب میاں بیوی میں ہوں۔ حق فسخ شوہر کو بھی حاصل ہے، بیوی کو بھی ہے۔ بخلاف حق طلاق کے۔ جب گھریلو زندگی مردہ و بے جاں ہو جائے تو صرف مرد کو حق ہے وہ طلاق دے کر اس صورتِ حال کو ختم کر دے۔

اسلام نے طلاق کی مدفن سے الگ رکھی ہے اور طلاق کیلئے الگ ضابطے وضع کیے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ اسلام میں مرد کو طلاق کا اختیار اس کے لیے کوئی خصوصیت اعزاز نہیں ہے۔

ان حضرات سے کہنا چاہیے۔ کابجوں اور یونیورسٹیوں، اور مشنری چاند کے دور سے شرمندہ نہ ہوں، بہتر یہی ہے کہ ذرا سبقت لیں۔ نسخ و طلاق کا فرق سمجھ لیں۔ اسلام کے معاشرتی فلسفہ کا ادراک حاصل کریں یہ فلسفہ گہرا بھی ہے اور گھریلو معاشرے کے واسطے مفید بھی ہے اس کی واقفیت سے آپ شرمندگی کے بجائے گردن اٹھا کر ان کے سامنے سے گزر سکیں گے۔ افسوس۔ جہالت، دروہ اور دواسے۔

طلاق کا جرم مانہ دنیا کے کچھ قوانین میں طلاق کو روکنے کی خاطر جرم مانہ بھی رکھا گیا ہے۔ آج کی دنیا میں تو ایسے قانون کا مجھے تو علم نہیں مگر روم کی مسیحی شہنشاہی میں، بغیر کسی معقول وجہ کے بیوی کو طلاق دینے کی سزا موت تھی۔

روشن حقیقت یہی ہے کہ جرم مانہ ”گھریلو زندگی“ کی ہمتی بیوی کو مضبوط کرنے میں قانون کے زور سے بھی فائدہ رساں نہیں۔ ہاں، ایک قسم کا فائدہ اندوزی ضروری ہے اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ اگر حق طلاق بیوی کو نفویض ہو؟ کہ یہاں تک ہماری گفتگو یہی رہی کہ

”فطری حق کے طور پر“ طلاق کا تعلق شوہر ہی سے ہے۔ یہی بات کہ آیا شوہر مطلقاً ہمیشہ اور ہر جگہ۔ یا خاص صورت میں اپنی طرف سے بیوی کو وکیل بنا کر حق طلاق دے سکتا ہے؟ یہ بات فقہ اسلام بھی منظور کرتی ہے اور قانون مدنی ایران میں بھی صاف صاف درج ہے۔ ضمناً، شوہر کو اپنی وکالت بیوی کو دینے کے بعد اسے واپس لینے سے روکنے کی خاطر وکالت بلا عزل“ کا ضابطہ بھی رکھا ہے۔ عقد لازم میں یہ

و کالت نمونی شرط کے طور پر دی جاتی ہے۔ اس شرط کے بعد بیوی، مطلقاً، یعنی وقت اور ہر جگہ یا صرف پہلے سے معین شدہ اور طے کردہ صورتوں میں اپنے نہیں مطلقہ بنا سکتی ہے۔

مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ جو بیویاں اپنے شوہروں سے شروع ہی سے متردد ہوتی ہیں و "شرط ضمن العقد" کے طور پر حق طلاق محفوظ کر لیتی ہیں اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

فقہ اسلام کی رو سے، فطری طور پر حق طلاق تو نہیں رکھتی لیکن معاہدے کے طور پر یعنی شرط ضمن عقد کی صورت میں یہ حق حاصل کرنا ممکن ہے۔
قانون مدنی، دفعہ ۱۱۱۹ ہے :

"عقد ازدواج کے دونوں فریق، ہر وہ شرط طے کر سکتے ہیں جو عقد مذکور کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو۔ ایسی شرط عقد ازدواج یا عقد لازم میں رکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہ شرط کر لی جائے کہ شوہر جب بھی دوسری شادی کرنا چاہے گا، یا اس مدت کے درمیان غائب ہو جائے گا، یا ترک نان و نفقہ کرے گا یا بیوی کے قتل کی تدبیر کرے گا، یا ایسی بدسلوکی سے پیش آئے گا جس سے دونوں کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے تو بیوی وکیل در وکیل ہے کہ شرط پوری ہوتے ہی محکمے میں دعویٰ ثابت کرنے کے بعد اپنے تئیں مطلقہ بنائے"

آپ نے ملاحظہ فرمایا، جو لوگ کہتے ہیں کہ فقہ اسلام اور قانون مدنی ایران میں طلاق کو ایک طرف حق قرار دیا گیا ہے۔ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے اور بیوی سے بالکل چھین لیا گیا ہے صحیح بات نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کے نقطہ نظر اور قانون مدنی ایران کے زاویے سے حق طلاق فطری طور پر نہیں مانا گیا ہے، البتہ ایک معاہداتی اور تفویض شدہ حق موجود ہے۔

اب وہ منزل آگئی ہے کہ ہم بحث کے دوسرے حصے پر گفتگو شروع کریں یعنی بعض مردوں کا غیر شرعیانہ و ظالمانہ اندازے طلاق نہ دینے کا موضوع۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس مشکل کا حل نکالا ہے؟ واقعاً کہ بات بہت پریشانی کی ہے۔ اس مدعا پر گفتگو کا عنوان، "عدالتی طلاق" جسے ہم شروع کرنے سے پہلے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ پہلے مسئلہ پر بات درالبی ہو گئی۔

عدالتی طلاق

عدالتی طلاق یعنی شوہر کے ذریعے کے بغیر قاضی یا جج کے ذریعے جاری ہونے والی طلاق۔

دنیا کے اکثر قوانین میں طلاق کا اختیار قاضی کو حاصل ہے۔ عدالت ہی طلاق دے سکتی ہے وہی زوجیت کی گرد کھلنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس رائے کے بموجب تمام طلاق عدالتی ہیں۔ ہم گزشتہ مقالات میں روح ازدواج اور خاندانی مرکزیت کا مقصد اور گھر لوہا حوں میں بیوی کا درجہ بیان کرتے ہوئے مذکورہ بالا رائے کی تردید کر چکے ہیں۔ ہم نے ثابت کیا ہے کہ جو طلاق اپنی فطری راہ سے منزل تک آتے ہیں وہ قاضی سے وابستہ نہیں کیے جاسکتے۔

سردست ہماری بحث یہ ہے کہ کیا اسلام کی نظر میں قاضی سخت و سنگین شرائط فساد و قاضی کے باوجود کسی صورت حال میں طلاق جاری کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ یا ایسے خصوصی حالات ہیں جہاں قاضی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے؟ اگرچہ وہ حالات استثنائی اور بہت ہی کم کیوں نہ ہوں۔

طلاق امر کا طبعی حق ہے بشرطیکہ بیوی سے تعلقات کی رفتار فطرت کے مطابق طے ہوں میاں بیوی کی فطری روابط کی رفتار کا تقاضہ اگر ہم زندگی گزارنا ہے تو اس کی بخوبی نگہداشت کیے اور اچھی طرح خیال رکھے، حقوق ادا کرے جس معاشرت و حسن سلوک سے پیش آئے۔ اور اگر بیوی کی رفاقت کا خیال نہیں تو حسن خوبی سے طلاق دیدے، یعنی بے طلاق اسے نہ چھوڑے۔ اور اس وقت بھی حقوق

واجب کے علاوہ ایک انسانی رقم بطور سکر یہ اسے پیش کرے۔
قرآن مجید کا حکم یہی ہے:

وَمَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرًا

(البقرہ ۲۳۶)

ان کو مال و متاع دو خوش حال شوہر اپنی چشت اور تنگدست اپنی چشت کے مطابق۔

اس کے ساتھ ہی اس رشتے کے خاتمہ کا اعلان کر دے۔

ہاں، اگر طبعی رفتار طے نہ ہو، پھر کیا ہوگا؟ یعنی، ایک ایسا شوہر پیدا ہو جائے، جو زندگی بھی ایک ساتھ نہ گزارے، حسن سلوک بھی نہ رکھے۔ اسلام کی پندریہ، خوش گھڑنے کی مرکزیت بھی نہ چاہے اور بیوی کا رشتہ بھی نہ توڑے تاکہ وہ اپنی راہ لے۔ یوں کہہ لیجئے کہ نہ تو فرائض شوہری پورے کرے اور بیوی کو راضی رکھنے کی کوشش کرے نہ طلاق دینے پر راضی ہو۔ یہاں کیا کرنا چاہیے؟

طلاق، فطری انداز سے ولادت کا عمل ہے، جو اپنی طبعی رفتار سے چلتا ہے لیکن شوہر کی طرف سے وہ طلاق جس میں نہ تو شوہر اپنی ذمہ داریاں نبھائے، نہ طلاق پر تیار ہو۔ ایسا عمل ہے جیسے غیر طبعی طور پر بچہ ہوتے کا عمل، جس میں، سرجن بچے کو شکم سے باہر لائے۔

کیا بعض شادیاں سرطان ہیں،
بیوی جلتی رہے اور نباہتی جائے؟

دیکھنا ہے کہ اس طرح کی طلاق اور ایسے شوہروں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ کیا اس صورت حال کے

باوجود یہی حکم دیتا ہے کہ طلاق کا عمل سو فی صد، شوہر کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب تک ایسا شوہر طلاق پر راضی نہ ہو، بیوی جلتی اور نباہتی رہے۔ اسلام ایک ہاتھ دوسرے

کے ہاتھ میں دیے و در سے اس ظالمانہ رویے کو دیکھتا رہے؟

بہت سے حضرات کا خیال یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اسلام کی نظر میں اس مرض کی کوئی دوا نہیں، یہ ایک قسم کا سرطان ہے، کبھی کبھی آدمی اس کا مریض ہو جاتا ہے اس کا علاج ہی نہیں ہے۔

بی بی دیکھ جھیلے اور ساتھ دے، آخر چلتے چلتے ٹھنڈی ہو جائے۔

میرے نزدیک یہ طرز فکر اصول اسلام سے قطعی طور پر متضاد ہے۔ جو دین۔

عدل کا دم بھرتا، "قیام بقسط" یعنی انصاف کا قیام اپنا نصب العین اور تمام پیغمبروں کا اساسی دستور بتاتا ہو۔

"لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الكتاب

والمیزان ليقوم الناس بالقسط...." (القرن الکریم، سورۃ الاحقاف/۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب

اور ترازو اتاری تاکہ وہ لوگوں میں انصاف قائم کریں۔

اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہی دین کھلم کھلا ظلم کا علاج نہ کرے، کیا ممکن ہے

کہ اسلام اپنے قوانین اس انداز سے وضع کرے جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ایک بے چارہ انسان

سرطان کا دیکھ جھیلے اور مر جائے؟

افسوس کی بات ہے، کچھ حضرات اقرار کرتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام دین

عدل ہے، اپنے پیسے، عدلیہ فرستے میں شمار کرتے ہیں وہ اس طرح کا نظریہ رکھیں

اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ظالمانہ قانون کو سرطان کا نام دے اسلام کے سر تھوپ دیں

تو پھر کیا ہرج ہے ایک اور ستم گرانہ قانون کو "جمنس" اور تیسرے کو "سل" پھر چوتھے

قانون کو "اعصابی فالج" جیسے نام دے کر معاف بھی کر دیں اور قبول بھی کر لیں۔

اگر یہی بات ہے تو اصل عدل "جو اسلامی قانون سازی کا بنیادی ستون

ہے وہ کہاں برقرار رہے گا۔

کہتے ہیں۔ سرطان۔ میں عرض کرتا ہوں، بہت اچھا، سرطان بھی، تو اگر کوئی بیمار سرطان میں مبتلا ہو جائے کیا اسے اہمیت نہ دی جائے، اس کا علاج نہ کیا جائے، فوری اقدامات کے ذریعے بیمار کی جان نہ بچائی جائے۔

ایک خاتون، زندگی بھر کے لیے کسی مرد کے ساتھ رہنے پر تیار ہوتی ہے، اس کے بعد حالات پٹا کھاتے ہیں، اور معاملہ یہ آ پڑتا ہے کہ شوہر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور ازدواجی زندگی کی خاطر نہیں، بلکہ اسے دوسری شادی، اور دوسری زندگی سے محروم رکھنے کی نیت سے "تبعیر قرآن مجید" معلقہ کی طرح چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہوا میں سٹکی رہی۔ واقعاً ایسی خاتون سرطان کی بیمار ہے مگر یہ سرطان و سرطان ہے جس کا بہ آسانی علاج ہو سکتا ہے۔ اور بیمار ایک معمولی سے آپریشن کے بعد قطعی طور پر مکمل شفا حاصل کر سکتا ہے۔ یہ آپریشن اور ٹیٹل جراحی حاکمان و قاضیان سر کر سکتے ہیں، جو خاص شرائط اور کوالیفیکیشن کے مالک ہوں۔

ہم گزشتہ مقالات میں، اٹارے کر چکے ہیں کہ دو مشکلوں میں سے ایک مشکل و مشیت جس سے ہمارا معاشرہ دوچار ہے، وہ یہی ہے چند ظالم شوہر اطلاق سے پہلو نہیں کرتے ہیں۔ اور اس عمل بد کے لیے دین کا نام لیتے اور ظلم ڈھالتے ہیں، پھر ان ستم ظریفوں پر اضافہ ان کا انداز فکر ہے وہ بھی دین و اسلام کے نام سے کہتے ہیں؛

۔ عورت کو ظلم، لاعلاج سرطان سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے۔ اس سوچ نے ہر اسلام دشمن پروپیگنڈے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

باوجودیکہ یہ بحث فنی (فقیہی) اور ماہرانہ پہلو رکھتی ہے، پھر ان مقالات کے دائرے سے باہر بھی ہے۔ مگر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرتا چلوں تاکہ بدین افراد پر یہ روشن ہو جائے کہ اسلام ان باتوں کے علاوہ کچھ اور

کہتا ہے۔

بند راستے :

مسائل ازدواج و طلاق کے بند راستوں کی طرح کچھ اور

مقامات بھی ہیں جہاں راہیں بند معلوم ہوتی ہیں مثلاً مالی

مسائل ہیں۔ تو آئیے دیکھیں "ازدواج و طلاق" کے علاوہ، اور بھی جہاں راستے بند ہیں

وہاں اسلام نے کیا کیا ہے؟ کیا اس راستے کو بند ہی رہنے دیا ہے۔ یا اسے راستے کی رو

نہیں بننے دیا بلکہ کوئی حل نکالا ہے۔

فرض کریں، دو شخص ترکے یا اور طرح سے ایک ناقابل تقسیم چیز کے مالک ہو جاتے

ہیں۔ مثلاً ایک موتی یا ایک انگوٹھی یا موٹر یا پینٹنگ۔ دونوں مل کر اس سے فائدہ اٹھا

پر تیار نہیں، کہ ایک مرتبہ ایک لے جائے، دوسری مرتبہ دوسرا استعمال کرے۔ اس پر

بھی تیار نہیں کہ ایک آدمی اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، اس کے علاوہ

بھی کوئی مفاہمت نہیں ہوتی۔ ہمیں معلوم ہے اس چیز سے فائدہ اسی وقت اٹھایا جا

سکتا ہے جب دوسری رضا حاصل ہو۔ ایسی جگہ کیا کریں؟ اس مال کو پڑا رہنے دیں کوئی

فائدہ نہ اٹھائیں اور موضوع ناقابل حل یا ناقابل علاج حادثہ سمجھ کر اسے چھوڑ دیں

یا اسلام نے کوئی حل نکالا ہے؟

درحقیقت، فقہ اسلامی نے ان مسائل کو ناقابل حل مشکل کے طور پر کبھی تسلیم ہی

نہیں کیا۔ حق مالکیت اور مال پر ایسا قبضہ جو مال کو بے استفادہ بنا دے۔ اسلام،

ایسے شخص کا احترام نہیں کرتا، اور ایسے تمام مقامات میں جہاں مال کو بے فائدہ

بنا دیا جائے فوراً اسلامی عدالت سے مداخلت کی درخواست دی جائے، حاکم

شرع سے رجوع کے وقت اسے معاشرتی مسئلہ سمجھا جائے یا ایک اختلافی مسئلہ

سمجھ کر تافضی اجازت دے دے کہ صاحبان حقوق کی باہمی چپقلش کے خلاف فیصلہ

یہ ہے اور صحیح حل یوں ہوگا۔ مثلاً، زیر بحث مال دونوں مالکوں سے لے کر کر لے

پر دے دیا جائے اور کرایے سے حاصل شدہ رقم ان میں تقسیم کر دی جائے۔ یا وہ مال بیچ کر قیمت، مالکوں میں بانٹ دی جائے۔ بہر حال حاکم یا قاضی شرع کا یہ اختیار ”ولیّ ممتنع“ کام یہی ہے کہ وہ اس قصے کی صحیح حلیٰ تدبیر کرے۔ حاکم شرع کو اصل مالکان کی ضابطہ لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

یہ مسائل مقامات پر قانون حق مالکیت کی پرواہ کیوں نہیں کی جاتی؟ اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک دوسری ”اصل“ (قانون کلیہ) سے کام لیتے ہیں۔ یعنی اصل یہ ہے کہ مال ضائع ہونے اور قابل استفادہ نہ ہونے سے بچایا جائے۔ مالکیت، اور مالکان مال کے قبضے کی ایک حد تک رعایت کی جائے گی وہ حد یہ ہے کہ مال و دولت منجمد اور بے فائدہ نہ ہونے پائے۔

فرض کریں، وہ مال جس پر اختلاف ہو گیا ہو۔ موتی یا تلوار جیسی چیز، کوئی اس پر تیار نہ ہو کہ اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ دونوں اس پر تیار ہوں کہ اس چیز کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں اور ہر حصہ دار ایک حصہ اٹھالے، جھگڑا یہاں تک پہنچ جائے کہ مال کی قیمت و اہمیت ہی ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موتی یا تلوار یا موٹر گاڑ دی جائے تو بیکار ہو جائے گی۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں کیوں؟ اس واسطے کہ مال کا ضیاع ہے۔

فقہاء اسلام میں درجہ اول کے فقہ، علامہ حلی کہتے ہیں کہ اگر مالک ایسا اقدام کرنا چاہیں تو حاکم اسلام انہیں روکے۔ ارباب دولت و مال کی باہمی موافقت اور ایسے کام پر ان کا سمجھوتہ تسلیم نہیں ہوگا اور انہیں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اب دیکھیں مسئلہ طلاق میں کیا کیا جائے۔ ایک شخص

طلاق کا بند راستہ

تباہی خاندان کا سر میں سودا لے ہو۔ اسلام کے عام کردہ حقوق و فرائض ادا نہ کرنے پر تلا ہو۔ مالی ذمہ داریوں میں تلفظ، اخلاقی

فرائض میں، حسن سلوک، جنسی فرائض میں ساتھ رہیں سہیں اور ہم خوابی سے عہدہ برائے نہیں ہوتا۔ ایک بھی حق ادا نہ کرے یا کچھ ادا کرے کچھ نہ کرے۔ بہر حال بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ اسلام کی نظر میں مورد کی اہمیت کے لحاظ سے کوئی اصل نافذ ہے جس کی بدولت حاکم یا قاضی شرع مداخلت کا حق رکھتا ہے جیسے مال کے معاملے میں اسے اجازت حاصل تھی۔ یا کوئی ایسی اصل موجود نہیں؟

آیت اللہ علی کا خیال: میں اس موقع پر سلسلہ گفتگو آیت اللہ علی ہمدانی کے بحف کے حوالے کرتا ہوں، موصوف ہمارے عہد کے علماء صنفِ اول میں ہیں۔ انہوں نے ”حقوق الزوجیہ“ نامی رسالے میں انہماک نظر کیا ہے۔ حقوق زوجہ اور مرد کی رکاوٹ پر ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے: ”ازدواج ایک مقدس پیمان ہے۔ عین اسی وقت دو انسانوں میں شرکت اور دو فریقوں میں معاہدہ و مفاہمت ہے اور دونوں فریقوں کی خوش نصیبی و خوش حالی کی ضمانت بھی ان مفاہمتوں کی پابندی میں ہے پھر ان کی خوش حالی سے معاشرے کی خوش حالی بھی وابستہ ہے۔“

”زوجہ کے اہم حقوق ہیں نان و نفقہ و لباس، ہم خوابی و حسن معاشرت و حسن اخلاق۔“

اگر زوجہ کے حقوق کی ادائیگی میں شوہر غفلت کرے اور طلاق بھی نہ دے تو بیوی کا حق کیا ہے؟ وہ شوہر سے کیونکر مقابلہ کرے؟ یہاں دو راہیں ہیں۔ ایک تو حاکم شرع کا حق مداخلت ہے۔ وہ طلاق جاری کر کے قصہ تمام کرے دوسری بات یہ ہے کہ بیوی اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کرے اور شوہر سے کیے ہوئے معاہدات کی پابندی چھوڑ دے۔

آیات و احادیث پہلا نکتہ یعنی حاکم شرع کی مداخلت، دیکھنا ہو گا کہ اسے مواقع پر کون سی "اصل" اور اس اقدام کو جائز قرار دینے والی وجہ جواز حاکم شرع کے واسطے کیا ہے؟

قرآن، سورہ بقرہ میں ہے:

الطَّلَاقِ مَرَّتَانِ، فَاَمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَشْرِيْحٍ

باحسان - (القرآن - البقرہ / ۲۲۹)

حق طلاق (دو مجموع) دو مرتبہ سے زیادہ نہیں اس کے بعد مناسب انداز میں گھر آباد رکھا جائے یا نیکی کے ساتھ رہائی دی جائے۔ اسی سورہ بقرہ میں ہے:

وَ اِذَا طَلَقْتِ الْمَرْءَ فَبَلِّغِيْهِ اَجْلَ حَقِّهِ فَاَمْسَكَوْهُنَّ بِمَعْرُوفٍ اَوْ سَرَحُوْهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تَمْسَكَوْهُنَّ صُرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ - (القرآن الکریم، البقرہ / ۲۲۱)

اور جب بیویوں کو طلاق دو اور ان کا عہدہ تمام ہو جائے تو یا انہیں اچھی طرح آباد رکھو یا اچھے انداز میں ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اور انہیں ایذا رسانی کے لیے پابند نہ کرو کہ ستم ڈھاؤ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ستم کرتا ہے۔

ان آیات سے ایک اصل کلی "کا استفادہ ہوا۔ یعنی ہر شوہر گھریلو زندگی میں دو میں سے ایک رویہ پسند کر لے۔

الف - تمام حقوق و فرائض بحسن و خوبی انجام دے۔ امساک بمعروف اچھے انداز میں نگہداشت۔

ب - زوجیت کا رشتہ توڑ دے، بیوی کو آزادی دے۔ تشریح باحسان

نیکی کے ساتھ دیا کرنا۔

رہا تیسرا رویہ کہ بیوی کو طلاق نہ دینا، پھر اسے آباد نہ رکھنا ربط و ضبط اور طلاق
یہ نقطہ نظر اسلام میں وجود نہیں رکھتا۔ "وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا"
ان کو ضرر دینے کے لیے نہ روکو کہ ان پر ظلم کر سکو، اسی رویے کی نفی کرتا ہے۔
یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ کا مفہوم زیادہ عام ہو۔ یعنی ان رویوں کی بھی ممانعت ہے
جہاں شوہر عداً کو تاهمیاں کرتا ہے کہ بیوی کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اور ان
رویوں کو بھی برا کہا گیا ہے جہاں اگر شوہر جان بوجھ کر تو نقصان و ضرر نہ پہنچائے
لیکن بیوی کا گھر میں رہنا اور ساتھ رکھنا بیوی کے لیے سراسر زیاں ہو۔

یہ آیات، نازل تو ہوئی ہیں عذرہ و رجوع و عدم رجوع شوہر کے بارے میں
یعنی مرد کی ذمہ داری و اصرار کی جارہی ہے کہ طلاق کے بعد بیوی سے رجوع کسی مقول
بنیاد پر ہونا چاہیے، رجوع اس لیے ہو کہ اب بیوی کو اچھی طرح رکھے گا۔ رجوع
کا مقصد بیوی کی اذیت رسانی نہ ہو مگر مطلب اسی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیات
"اصل و کلیہ" بتاتی ہیں۔ اس سے ہر وقت اور ہر حال میں حق زوجہ واضح ہوتا ہے۔
یعنی شوہر مکمل طور پر زندگی میں دو رویوں میں سے ایک کو پسند کرے۔ کوئی
تیسرا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

بعض فقہاء اسی مقام پر بغزش سے دوچار ہوئے ہیں وہ سمجھ بیٹھے کہ ان
آیتوں کا تعلق مردوں سے ہے کہ وہ طلاق رجعی میں رجوع کریں۔ حالانکہ ایسا
ہے۔ یہ آیتیں تمام شوہروں کو بیویوں کے متعلق فرائض کی نشاندہی کرتی ہیں اس
بات پر ہماری دلیل سیاق و سباق آیات کے علاوہ یہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام
نے موضوع طلاق کے علاوہ بھی ان آیتوں کو استدلال میں پیش کیا ہے۔
مثلاً:

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا :

ایلاؤ کرنے والا۔ جو شوہر اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کرنے کی قسم کھائے۔ چار ماہ بعد جبراً قسم توڑے اور کفارہ دے یا بیوی کو طلاق دے۔ کیونکہ اللہ عز و جل اسے فرمایا :
”امساك بمعرف او تسريح باحسان“

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں مسئلہ عرض کیا گیا کہ فلاں آدمی نے ایک شخص کو اپنا وکیل بنا کر ایک عورت سے مہر طے کر کے نکاح پڑھنے کو کہا اس شخص نے یہ خدمت انجام دی لیکن مؤکل نے اپنی وکالت سے انکار کر دیا۔ امام نے فرمایا : ٹھیک ہے اس خاتون پر کوئی پابندی نہیں ہے وہ اپنے لیے دوسرا شوہر اختیار کرے، لیکن اگر اس شخص نے واقعاً وکیل بنایا تھا اور جو عقد ہو وہ وکالت کی بنیاد پر ہوا، تو اس شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ صاف کرے اور اس عورت کو طلاق دیدے۔ کیونکہ قرآن میں ہے : فامساك بمعرف او تسريح باحسان“ ان روایات سے معلوم ہوا کہ ائمہ طاہرین آیت مذکورہ کو ”اصل کلی“ سمجھتے تھے اور خاص مورد میں منحصر نہیں جاتے تھے۔

جب شوہر نہ فرائض ادا کرتے نہ طلاق دے تو حاکم شرع اسے طلب کرے اور پہلے تو اسے طلاق کا حکم دے اگر وہ طلاق جاری نہ کرے تو خود حاکم شرع طلاق جاری کرے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بروایت ابوبصیر مروی ہے کہ امام نے فرمایا : جو شخص اپنی بیوی کو لباس و لفقہ نہ دے مسلمان کے امام پر واجب ہے کہ ان دونوں کو (طلاق کے ذریعے) الگ کر دے۔“

درجہ اول کے ایک ہم عصر فقیہ کے فرمودات کا یہ خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا مزید تفصیلات کے لیے موصوف کے درس کی تقریروں کا مجموعہ ”حقوق الزوجیہ“ ملاحظہ کریں۔

آپ نے غور کیا۔ ”امساک بمعروف و تسریح باحسان“۔ ایک اصل اور قاعدہ کلی ہے جسے قرآن مجید نے ”حقوق زوجیت“ دائرہ مقرر کرنے کے لیے وضع کیا ہے، لہذا مذکورہ اصل نیز ”ولا تمسکوا حنا ضرارا تعتدوا“ کے اضافے سے کوئی حق باقی نہیں رہتا کہ خوف خدا نہ رکھنے والا شوہر اپنے غلط فائدہ اٹھائے۔ یعنی کسی خاتون کو صرف ستانے اور دوسری شادی سے روکنے کی خاطر طلاق دیے بغیر معلق رکھے اور خود بھی اس سے رشتہ نہ رکھے۔

دوسرے دلائل و شواہد

رسالہ ”حقوق الزوجیہ“ میں بیان شدہ دلائل کے علاوہ اور بھی شواہد و دلائل سے تائید ہوتی ہے کہ :

امساک بمعروف و تسریح باحسان
اسلام کے نزدیک ایک اصل کلی ہے، اسی کے دائرے میں حقوق زوجیت کی نگہداشت ہونا چاہیے۔ اس مفہوم آیت پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر مطلب روشن سے روشن تر اور دین مبین اسلام کے ضابطے مستحکم ہوتے نظر آئیں گے۔

الکافی، جلد ۵، صفحہ ۵۰۲ پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے، حضرت نے فرمایا :

اذا اراد الرجل ان تزوج المرأة فليقل :

اقررت بالميثاق الذي اخذ الله : امساك

بمعروف و تسریح باحسان

جب کوئی آدمی شادی کرنا چاہے تو کہے : اللہ نے جو مجھ سے پیمانہ لیا ہے میں اس کی تجدید کرتا ہوں اور وہ ہے کہ بیوی مناسب طریقے

سے رکھوں گا یا نیکی کے ساتھ طلاق دیدوں گا۔

آیت ۲۱، سورۃ النساء میں ہے :

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُم إِلَىٰ بَعْضٍ وَ
أَخَذَ مِنْكُمْ .

اور تم بیویوں کو دیے ہوئے مہر (زور اور سختی کر کے) واپس کیوں
لیتے ہو، حالانکہ ایک سے دوسرے کے پاس جا چکا اور دونوں ایک
دوسرے سے کام بھی لے چکے، اور بیویوں نے تم سے تو سخت قول
و قرار لے لیے ہیں۔

شیعہ اور سنی مفسرین کہتے ہیں ”پیمان استوار“ و قول و قرار سے مراد امر
بمعروف اور نہی کرہ کا پیمان ہے، یہی خدا کا پیمان ہے جو مردوں سے لیا گیا ہے۔
یعنی وہ عہد جس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے تاکید فرمائی کہ شادی
کے وقت مرد کو اعتراف و اقرار کرنا چاہیے کہ بیوی کی مہذب انداز سے نگہداشت
رکھے گا یا حسن و خوبی کے ساتھ چھوڑ دے گا۔

حج و داع کے موقع پر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور
جملہ فرمایا جو شیعہ سنی دونوں نقل کرتے چلے آئے ہیں :

اتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِمَا مَنَعَهُ اللَّهُ وَاسْتَحْلَلْتُمْ
فُرُوجَهُنَّ بِعِلْمَةِ اللَّهِ.....

عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ تم نے ان کو بطور امانت
الہی حاصل کیا ان کی عصمت کلمۃ اللہ کے ذریعے حلال کی

ابن اثیر نے کتاب النہایہ میں لکھا ہے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
فرمان کلمۃ اللہ جس سے عصمتِ خواتین، مردوں پر حلال قرار پاتی ہے، سے مراد

وہ جملہ ہے جو قرآن مجید میں باین الفاظ موجود ہے "امساك بمعروفٍ او تسريحاً بائناً" ان خواتین کو دستور کے مطابق اچھی طرح رکھو یا بھلائی کر کے چھوڑ دو۔

شیخ الطائفہ کا نظریہ

شیخ ابو جعفر طوسی نے کتاب الخلاف جلد ۲ صفحہ ۸۵ پر لکھا ہے۔ جب ثابت ہو جائے کہ مرد،

"غنی" ہے تو بیوی کو فسخ کا اختیار ہے۔ فرماتے ہیں :

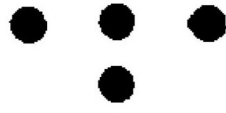
اس بات پر فقہاء کا اجماع ہے نیز اس آیت سے استدلال بھی "امساك بمعروفٍ او تسريحاً باحسان" غنی چونکہ بیوی کو اچھی طرح نہیں رکھ سکتا، لہذا اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

ان توضیحات سے بخوبی قطعی واضح ہو گیا کہ اسلام ہرگز مرد کو زور آوری کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے حق طلاق سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور بیوی کو قیدی بنا کر رکھے۔

جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص اپنا نام قاضی رکھ لے اسے ان جیسے مسائل میں دخل دینے کا حق مل جائے گا۔ اسلام کے نزدیک قاضی کے شرائط بہت سخت اور وزنی ہیں جن پر گفتگو کی یہ جگہ نہیں ہے۔

ایک اور بات جس پر توجہ رکھنا ہوگی وہ "عدالتی طلاق" گھر کی مرکزیت پر اسلام کی خصوصی توجہ اور نگہداشت کے باوجود بڑی مستثنیٰ اور نادر و کمیاب بات ایسے آئیں گے جہاں قاضی طلاق دے۔ اسلام اس طلاق کا قائل نہیں جو امر کیہ اور یورپ میں ہوتی ہے اور وہ اس قسم کی طلاق جائز نہیں جانتا جس کی داستانیں ہم روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت نے اپنے شوہر کے بارے میں "سکایت کردی اور طلاق مانگ لی۔ صرف اس لیے کہ جس فلم کو میں پسند کرتی ہوں شوہر پسند نہیں کرتا۔ یا "فی فی" صاحب میرے پیارے کتے کو چومتا نہیں۔

اسی قسم کے مضحکہ انگیز قصے جو انسانیت کے زوال کا نمونہ ہیں۔



ناظرین محترم، گذشتہ چند مقالات میں جو کچھ غرض کیا ہے، اور اکیسویں مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ طلاق کے سلسلے میں پانچ نظریے ہیں:

① طلاق معمولی چیز ہے اس پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالی جائیں خواہ معاشرتی بندشیں ہوں یا اخلاقی۔

② ازدواج ایک ابدی بندھن ہے اور طلاق بالکل ناممکن ہے۔ (کیتھولک چرچ کی رائے)

③ ازدواج مرد کی طرف سے قابلِ جدائی ہے عورت اس بندھن کو نہیں کھول سکتی۔

④ ازدواج شوہر کی طرف سے خاتمہ پاتا ہے اور خاص شرائط کے ساتھ بیوی بھی یہ بندھن کھول سکتی ہے۔ یہ راستہ میاں بیوی دونوں کے لیے ہے۔ (دو اس معاملے میں یکساں و برابر ہیں۔ (دعوے داران مساوات حقوق کا نظریہ)

⑤ طلاق راستہ جس شوہر کے لئے نکاح ہے بیوی کے لیے بھی بند نہیں ہے۔ لیکن میاں بیوی کیسے نکلتے دروازے ہیں۔

میں نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ اسلام پانچویں نظریے کا حامی ہے، پھر ”شرط ضمن عقد“ اور ”عدالتی طلاق“ کے ذیل میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اسلام کا نقطہ نظر بتا دیا کہ ”طلاق فطری حق کے طور پر بیوی کو حاصل نہیں ہے۔ اس باوجود اس کے لیے راستہ مکمل طور پر بند بھی نہیں ہے۔ خواتین کے لیے خصوصی دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

’عدالتی طلاق‘ کے بارے میں اس سے زیادہ بحث کی گنجائش ہے، خصوصاً

اسلامی فقہوں کے علما و فقہاء کے خیالات اور تمام اسلامی ملکوں میں عام مسلمانوں کا رویہ سامنے رکھ کر بات ہو سکتی ہے۔ مگر ہم ان مقالات میں اسی قدر کافی سمجھتے ہیں۔

گیارہواں حصہ :

تعددِ ازواج

- تاریخِ زندگی بشر میں بیویوں کی قسمیں ۔
- اسلام نے جاہلیت کی تین چار قسم کی بیویاں ممنوع کر دیں۔
- جنسی کیونزیم، ایک بیوی کئی شوہر۔
- چند شوہری نظام کیوں ناکام ہوا، اور چند ازواجی نظام رواج پا گیا؟
- عورت کے لیے مرد کے برخلاف خانگی زندگی، مادی پہلو سے زیادہ روحانی و نفسیاتی پہلو رکھتی ہے۔
- تعددِ ازواج، عورت کا حق ہے، مرد کے حقوق میں نہیں ہے۔
- تعددِ ازواج کے تاریخی اسباب۔
- کیا تعددِ ازواج مشرقی آب و ہوا کی پیداوار ہے؟
- چند ازواجی ڈھانچہ مغرب میں اور چند ازواجی ڈھانچہ مشرق میں۔
- مغرب میں عیاشی کی فراوانی نے تعددِ ازواج کو روکا، اس میں دینی مسیحی کے ضوابط کا دخل نہیں ہے۔
- تعددِ ازواج کے معاملے میں، مرد کبھی زور آوری دکھاتا ہے، کبھی قانونی جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، کبھی بیو کا کا حق ادا کرتا ہے۔

- — چند ازواجی صورتِ حال میں بیوی کا حق۔
- — شماریات بولتے ہیں۔
- — ہمیشہ شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، شادی کے قابل لڑکوں کی تعداد سے زیادہ رہتی ہے، کیوں؟
- — مشورِ حقوقِ انسانی نے انسان کے ایک بہت بڑے حق کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔
- — بہ قولے اہل حل و عقد انگلستان اگر ”ہودی زن“ ڈاڑھی مونچھ والا ہو تو کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔
- — کیا مرد کی فطرت کا تقاضہ تعداد ازواج ہے؟
- — کہتے ہیں۔ مرد، قانوناً ایک بیوی کا پابند ہے مگر عملی طور پر چند بیویاں رکھتا ہے۔
- — خراب معاشرے نے مرد کی خیانت کے اسباب پیدا کیے ہیں، اس کی فطرت نے نہیں۔
- — بیسویں صدی کے مرد، عورت کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں کم کرنے اور اپنی مقصد برآری میں کامیاب ہو گئے۔
- — بے شوہر خواتین جو بحران پیدا کرتی ہیں وہ ہرزحران سے زیادہ خطرناک ہے۔
- — ”چند ازواجی“ پر اعتراضات اور خرابیاں۔
- — اکثر مردوں کا عقیدہ: خدا ایک، بیوی ایک۔
- — عشق اور جذبات قابلِ تقسیم و درجہ بندی نہیں ہیں۔
- — کئی بیویاں، گھریلو زندگی کو مہر و محبت کے مرکز سے میدانِ جنگ

میں مستقل کر دیتی ہیں۔

● — مرد، اپنی عائلی زندگی کو ایک مرتبہ نیچنے کے بعد دوبارہ کیسے فروخت کرتا ہے؟

● — کئی بیویوں کے مسئلے میں اسلام کا کردار۔

● — اسلام نے چند ازواج کو محدود بھی کیا اور مشروط بھی کیا ہے۔

● — تعدد ازواج میں دولت اور صحت کی شرط۔

● — تعدد ازواج سے آج کے مرد کی نفرت کے اسباب۔

● — تعدد ازواج کی جگہ اس صدی میں "گناہ" نے پر کی ہے "وفا"

نے نہیں۔

نعدازواج

گھریلو زندگی کی فطری شکل "ایک بیوی" سے بنتی ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں اپنائیت کی روح، یعنی خصوصی و انفرادی مالکیت کا رواج ہوتا ہے۔ جو دولت کی خاص مالکیت سے جدا ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں میاں، بیوی دونوں۔ جذبات و نفسیات، توجہ اور حسی فائدے "اپنے" اور اپنی ذات سے مخصوص سمجھے ہیں۔

ایک بیوی والے گھر کے مقابلے میں۔ چند ازواج۔ یا اشتراکی زوجیت کا نظام ہے۔ چند ازواجی یا اشتراکی زوجیت، چند صورتوں میں فرض کی جاسکتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ فریقین میں کسی فریق کا دوسرے فریق سے خصوصی تعلق نہ ہو۔ نہ مرد، کسی خاص عورت کے وابستہ

جنسی کیونزم

ہو، نہ عورت کسی معین مرد کی پابند ہو۔ یہی مفروضہ وہ جسے "جنسی کیونزم" کہا جاتا ہے۔ جنسی کیونزم، گھریلو زندگی کی نفی کے مساوی ہے۔ تاریخ، بلکہ قبل از تاریخ کے تاریخی مفروضے بھی کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کرتے جس میں انسان یکسر خاندانی زندگی سے خالی رہا ہو۔ اور جنسی کیونزم کا رواج ہو۔ جس مدت کو اس نام سے یاد کرتے اور دعویدار بنتے ہیں کہ کچھ وحشی مردوں میں یہ نظام تھا۔ ایک وسطی دور ممکن ہے۔ یا ہو کہ جسے خاص گھریلو زندگی اور جنسی کیونزم کی کڑی سمجھا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض قبائل میں، چند بھائی چند بہنوں سے مشترک طور پر شادی کر لیتے تھے، یا مردوں کا ایک گروہ، عورتوں کے ایک گروہ سے شرکت کے طور پر شادی رچاتے تھے۔

ویل ڈیورانت نے تاریخ تمدن کی پہلی جلد میں (صفحہ ۶۰ پر) لکھا ہے :

بعض علاقوں میں، گروپ کی صورت میں شادی ہوتی تھی۔ یعنی ایک قبیلے کے مردوں کا ایک گروہ، دوسرے خاندان کی لڑکیوں کے ایک گروہ سے شادی کر لیتے تھے۔ مثلاً تبت میں رسم تھی، چند بھائی، اپنی تعداد کے مطابق چند بہنوں سے رشتہ کر لیتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ کس لڑکی کو کس کی بیوی بننا ہے۔ رشتہ زن و شوہر کا یہ انداز ایک طرح کا جنسی کیونزیم ہے۔ اس مرحلے جو مرد جس عورت سے چاہتا ہم بستر ہو جاتا تھا۔ "سیزر" نے اس سے ملتی جلتی رسم کا انگلستان میں تذکرہ کیا ہے۔ ان حادثات کے بچے کچھ نشانات میں ایک رسم بھی ہے کہ بھائی کے مرنے کے بعد بھاء ج زندہ بھائی کی بیوی شمار ہونے لگتی تھی۔ یہود اور ان جیسی قدیم قوموں میں اس کا رواج زیادہ تھا۔

افلاطون کا نظریہ : افلاطون کی کتاب "جمہوریت" سے مطلب نکلتا اور مورخ اس کی تائید کرتے ہیں۔ وہ اس کا نظریہ خاص ہے۔ "فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی" اس نے ایک طبقے کے لیے گھریلو اشتراکیت کی تجویز رکھی ہے۔ انیسویں صدی کے چند کمیونسٹ رہنماؤں نے بھی یہی کہہ دیا۔ فرائڈ اور محرموں سے حرمت ازدواج "کے مصنف کے بقول ۱۹۳۸ء میں بے شمار تلخ تجربوں کے بعد کچھ طاقتور کمیونسٹ ملکوں نے "ایک بیوی" کے نظام کو قانونی صورت دے دی۔

چند شوہری نظام : ازدواجی زندگی کے ضمن میں ایک مفروضہ "چند شوہری" ہے۔ یعنی ایک عورت ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر رکھے۔ ویل ڈیورنٹ کے بقول "یہ رسم تھوڑا جیسے تبتی قبائل میں مشاہدے کے قابل ہے۔"

صحیح بخاری میں، حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ جاہلی عرب میں چار طرح کی

شادیوں رائج تھیں۔

ایک قسم تو وہی ہے جو اب تک رائج ہے کہ مرد، لڑکی کے باپ سے خواہگاری کرتا ہے اور مہر کے بعد شادی ہو جاتی ہے۔ جو لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ باپ کے معین ہونے کی وجہ سے روشن مستقبل رکھتا ہے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ شوہر، زمانہ ازواج کے اندر اپنی بیوی کے لیے کسی دوسرے مرد کو تجویز کرتا تھا کہ وہ دونوں محدود عرصے تک ساتھ رہیں، اس سے وہ ایک اچھی نسل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ خود کچھ عرصے کے لیے بیوی سے الگ ہو جاتا اور بیوی کو سمجھا دیتا تھا کہ تم فلاں شخص کے ساتھ رہو، جب تک وہ عورت حاملہ نہ ہوتی اس وقت تک وہ شوہر الگ رہتا، جیسے ہی بیوی کا حاملہ ہونا معلوم ہو فوراً اس سے ربط پیدا کر لیتا تھا۔ یہ عمل اس شخص کے لیے ہوتا جسے شوہر تولید فرزند کے لیے اپنے سے بہتر سمجھتا تھا۔ دراصل یہ کام نسل کی بہبود اور خاندان کی اصلاح کے لیے انجام پاتا تھا۔ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کے ساتھ میاں بیوی جیسے روابط کا نام۔ نکاح استبضاع۔ تھا۔

تیسری صورت یہ تھی کہ دس آدمیوں سے کم ایک ٹولہ، ایک عورت سے ربط پیدا کرتے، جب اس کے یہاں بچہ ہوتا تو وہ اس ٹولہ کو بلاتی۔ اس عہد کے دستور کی بنا پر وہ مرد آنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے، سب حاضر ہو جاتے۔ وہ عورت ان میں سے جس کو چاہتی ہو وہ اس کے نام کر دیتی اور وہی اس کا قانونی باپ قرار پاتا، پھر اس مرد کو انکار کا حق نہ رہتا تھا۔

چوتھی قسم۔ ایک عورت "طوائف" تسلیم کر لی جاتی تھی، بلا استثناء ہر مرد اس سے رابطہ پیدا کر سکتا تھا، ان عورتوں کے مکان پر ایک جھنڈی لگی ہوتی تھی یہی ان کی پہچان تھی۔ ایسی عورتوں کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا اس کے بعد وہ

اپنے یہاں آنے جانے والے مردوں کو جمع کرتیں، کاہن اور قیافہ شناس بتاتیں، وہ قیافہ اور علامات دیکھ کر اپنی رائے بتاتے تھے کہ اس بچے کو فلاں کی اولاد ہوتا چاہیے۔ وہ مجبور ہو کر قیافہ شناس کا فیصلہ مانتا اور وہ اولاد قانونی و رسمی طور پر اس شخص کی اولاد قرار پاتی تھی۔

یہ جاہلیت کے ازدواجی اقسام اس وقت تک رہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث نہ ہوئے تھے، آنحضرتؐ نے چند اقسام کے سوا سب کو ختم کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ”چند شوہری“ کی رسم جاہلیت عرب میں جاری تھی۔ ”مان ٹسکو“ روح قوانین میں لکھتا ہے:

”ابو ظہیر حسن ایک عرب سیاح، نویں صدی عیسوی میں ہندوستان و چین گیا تو اس نے ”چند شوہری“ کی رسم دیکھی اور اسے عیاشی کا ثبوت قرار دیا۔ اسی نے لکھا ہے۔ ”مالا بار کے ساحلوں پر ”نائیر“ نامی قبیلہ رہتا ہے۔ اس قبیلے میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں، حالانکہ عورتیں کئی شوہر رکھ سکتی ہیں۔ میرے نزدیک اس قانون بنانے کی وجہ یہ ہوگی کہ نائیر قبیلے کے مرد بڑے جنگجو ہوں گے، اور اپنی اصالت کی بنا پر جنگ ان کا پیشہ ہوگی، اور جیسے ہم یورپ میں فوجیوں کو شادی سے روکتے ہیں تاکہ تاحلی زندگی ان کی پیشہ ورانہ جنگی مصروفیت کو نہ روکے، مالا بار کے قبیلہ نائیر کو بھی گھریلو رشتوں سے آزاد رکھا گیا ہوگا، وہاں کی آب و ہوا میں گرمی ایسی تھی کہ انھیں شادی سے بالکل روکنا ممکن نہ تھا، لہذا یہ طے کیا گیا ہوگا کہ چند آدمی مل کر ایک عورت رکھ لیا کریں۔ اس طرح گھریلو رشتہ کمزور رہے گا اور پیشہ ورانہ کام میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔“

چند شوہری نظام کے مشکلات

یہ پیدا ہوگئی کہ نسب کا تعین ختم ہو گیا

رہتے تھے لہذا ان کی زندگی خطرے میں ہوتی اور مردوں کی موت عورتوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ نتیجہ میں عورتوں کی تعداد میں اضافے کا حل ایک تو تعدادِ ازوج تھا یا پھر بہت سی عورتوں کو بے شوہر وارث رہنے دیا جائے۔ لیکن جن قوموں میں موت کی فراوانی ہو وہاں کوئی مناسب بات نہ تھی کہ عورتوں کی ایک نمایاں تعداد بلا شوہر رہے اور تولیدِ نسل کا عمل نہ ہو۔ بلاشبہ ابتدائی دور میں تعدادِ ازوج ایک مناسب دستور تھا، کیونکہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی، پھر نسل کی بہبود کے لیے بھی نظامِ تعدادِ ازوج آج کے نظامِ یک زن سے زیادہ مفید تھی۔ سب جانتے ہیں کہ مضبوط و توانا، طاقت ور اور محتاط مرد آج کی دنیا میں مدتِ بعدی کرتے ہیں، اس کے برخلاف گزشتہ زمانے میں طاقت ور افراد بظاہر اچھی عورتیں آسانی سے حاصل کر لیتے اور زیادہ بچے پیدا کرتے تھے۔ اسی بنا پر شروع میں متعدد قبائل بلکہ متمدن اقوام میں تعدادِ ازوج کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ اور ابھی کچھ دنوں سے ہمارے زمانے میں یہ رسم ہمارے مشرق سے کم ہوتی چلی گئی ہے۔ دراصل اس کے زوال میں متعدد عوامل کار فرما ہیں؛

کاشتکاری کی فراوانی، اس نظام نے مردوں کی بھاری اور خطرناک زندگی کو نسبتاً پرسکون اور پائدار بنا دیا ہے۔ عورتوں کی تعداد بھی کم و بیش مردوں کے برابر آگئی ہے۔ ان حالات میں ”چند زنی“ کی بات یا تو ابتدائی معاشرے کی بات قرار پاگئی ہے یا پھر مٹھی بھر دولت مند افراد کے خصوصیات میں شمار ہونے لگی ہے۔ اور ”زنا“ کا مشغلہ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ہے۔“

تاریخ تمدن، صفحہ ۵۰۷ پر گوستاو لوین نے لکھا ہے؛

”یورپ میں مشرقی رسم و رواج میں تعدادِ ازوج سے زیادہ برے پیرائے میں اور کسی چیز کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ اہل مغرب کا نقطہ نظر کسی رسم کے بارے

میں اس قدر غلط نہیں سمجھتا اس مسئلے میں غلط ہے، یورپی مصنف تعدد ازواج کو اسلام کی بنیاد جانتے اور اسلام کی تردید، نیز مشرقی اقوام کے زوال و انحطاط کا اہم ترین سبب مانتے رہے ہیں۔ اعتراضات کی بوچھاڑ کے ساتھ، یہاں کی خواتین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ بد نصیب عورتیں سخت اور اکھڑ خواجہ سراؤں کے ہاتھ گھروں کی چار دیواریوں میں ایسے رہتی ہیں، اگر کوئی بات گھر کے ان رکھوالوں کی مرضی کے خلاف ہو جاتی ہے تو جال کے لالے پڑ جاتے اور ممکن ہوتا ہے کہ بڑی بے رحمی سے قتل کر دی جائیں۔ مگر یہ ایسے تصور ہیں جن کا کوئی ثبوت یا بنیاد نہیں۔ ہماری کتاب کے مغربی قاری اگر تھوڑی دیر کے لیے تعصب کو دور کر سکیں تو انہیں تاہد کرنا پڑے گی اور مشرقی تمدن کی خوبی تسلیم کریں گے کہ اس میں کئی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، جن گھرانوں میں یہ رسم موجود ہے ان میں اخلاقی روح ترقی پذیر ہے۔ اور عائلی رشتے مستحکم ہیں، اسی رسم کے نتیجے میں عورت کا اعزاز و اکرام مغرب سے زیادہ ہے، ہم اس دعویٰ پر دلیل لکھنے سے پہلے یہ بتادیں کہ تعدد ازواج کا تعلق ہرگز اسلام ہی سے نہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ رسم مشرقی اقوام میں پائی جاتی تھی۔ یہود، ایرانی، عرب وغیرہ جو قومیں اسلام لائیں انھوں نے اس بارے میں کوئی نیا فائدہ نہیں اٹھایا، آج تک دنیا میں کوئی مذہب ایسا با اقتدار وجود پذیر نہیں ہوا جو تعدد ازواج جیسے رسوم کو ایجاد یا منسوخ کر سکے۔ مذکورہ رسم مشرقی آب و ہوا کا نتیجہ ہے، اس کی وجہ سے کچھ نسلی خصوصیات نیز دوسرے اسباب و علل جنم لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا تعلق مشرق کی زندگی اور اس کے رویوں سے ہے۔ نہ یہ کہ مذہب یہ رسم لایا۔ اور یورپ کی آب و ہوا اس رسم کے لیے سازگار نہیں اور وہاں اس کے تقاضے موجود نہیں ہیں اس کے باوجود ایک بیوی وہاں کی رسم ہے قانونی کتابوں میں تو پڑھتے ہیں ورنہ مجھے تو ہواور نہیں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی یہ کہہ سکے کہ "ایک بیوی" کا کوئی اثر ہو۔

سچ مجھے حیرت ہے مجھے نہیں معلوم کہ مشرق کی متعدد جائز بیویوں کے مقابلے میں یورپ کی مکارانہ بہت سی بیویوں میں کیا کمی ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پہلا نظام دوسرے نظام سے بدرجہ بہتر و شائستہ ہے۔ اہل مشرق جب بڑے شہروں کی سیاحت کو آتے ہیں اور ہمارے اعتراضات یا حملوں سے دوچار ہوتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی اور غصہ آتا ہے“

ہاں، اسلام نے ”تعدد ازواج“ کا نظام ایجاد نہیں کیا، مگر اسے ایک سمت سے محدود کر کے اکثریت کی تعداد ضرور مقرر کی۔ دوسری سمت، بھاری شرطیں لگا دیں۔ جو قومیں مسلمان ہوئیں، ان کے یہاں عموماً یہ رسم تھیں، اسلام کے ذریعے وہ حدود و قیود کا گردن بند پہننے پر ضرور مجبور ہوئی ہیں۔

ایران میں تعدد ازواج | کریمین سن کے ”ایران ساسانیوں کے عہد میں“ صفحہ ۳۲۶ پر لکھا ہے۔

”ساسانیوں کے زمانے میں ایران کے اندر متعدد بیویوں ہی سے خاندانہ یا پاتا تھا، مرد کی استطاعت کے لحاظ سے عورتوں کو رکھنے کا حق تھا۔ بظاہر غریب لوگ ایک ہی بیوی کرتے تھے۔ خاندان کا سربراہ، کنبے کی سربراہی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بیویوں میں محترم و محبوب خاتون تمام حقوق کی مالک ہوتی اور اس کو ”زن پادشاہیہ“ (بادشاہ زن) یا ”زن ممتاز“ کہتے تھے۔ اس کے کم درجہ عورت، خدمت گار ”زن چکار یھا“ کہلاتی، ان دونوں درجے کی بیویوں کے حقوق جدا جدا تھے۔ بظاہر زر خرید کنیز اور قیدی عورتیں نوکر بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔ ممتاز بیویوں کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ ایک مرد کے یہاں محدود تھیں یا نہیں؟ لیکن متعدد قانونی حوالوں میں ایک شوہر کی دو ممتاز بیویوں کا اشارہ ملتا ہے۔ اس درجے کی بیویاں خانہ دار معلوم ہوتی ہیں، گویا ان کے الگ الگ گھروں

تھے۔ شوہر، زندگی بھر زن ممتاز کو آذوقہ دینے کا پابند تھا۔ اور اس کی دیکھ بھال کرتا، لڑکا، بالغ ہونے اور لڑکی شادی ہونے تک یہی حق رکھتی تھی۔ چاکر زن قسم کی بیویوں کی اولاد ذکور باپ کے خاندان میں قبول کی جاتی تھی۔“

”تاریخ تمدن ایران از القراض ساسانیان تا القراض امویاں“ میں سعید نفیسی نے لکھا ہے:

”مرد نامحدود بیویاں رکھ سکتا تھا۔ بعض یونانی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے گھر میں سو بیویاں بھی ہوتی تھیں۔“

مان ٹسکونے ”روح القوانین“ میں ”اکوٹیٹس“ رومی مورخ سے نقل کیا ہے جسٹیٹین، کچھ رومی فلسفی، مسیحوں کے ہاتھوں اذیت و تکالیف کا نشانہ بنے، یہ لوگ عیسائی مذہب قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ آخر ان لوگوں نے روم کو چھوڑ دیا اور خسرو پرویز بادشاہ کے دربار میں پناہ گیر ہوئے۔ یہاں پہنچ کر جس بات نے انہیں حیرت سے دوچار کیا، وہ یہی نہیں کہ تعدد ازواج کی رسم پائی جاتی تھی۔ انھوں نے دوسروں کی بیویوں سے اختلاط بھی دیکھا۔“

یہ بات ذہن میں رہے کہ رومی فلاسفہ نوشیروان بادشاہ ایران کے دربار میں حاضر ہوئے تھے، خسرو پرویز کے یہاں نہیں، مان ٹسکو کے یہاں خسرو پرویز کا نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔

عربوں میں بیویوں کی تعداد کا حساب و شمار ہی نہ تھا، اسلام کا اس پر بند باندھنا اور زیادہ سے زیادہ کی تعداد معین کرنا، ان عربوں کے لیے مشکل بن گیا جن کی بیویاں چار سے زیادہ تھیں، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی دس بیویاں تھیں وہ چھ بیویوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم ایجاد نہیں کی، اس کے برعکس رسم

پر حد و بندش عائد کی، اور یکسر ختم بھی نہیں کیا۔ آئندہ گفتگو میں ہم دیکھیں گے کہ تعدد ازواج کی وجہ افراد کی وجہ افراد بشر میں کیا ہے؟ کیا اس کی علت وجہ، مرد کی زور آویزاں اور عورت پر حکومت کرنے کا جذبہ ہے، یا خاص ضرورتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ عمل ضروری ہوا؟ وہ ضرورتیں کیا تھیں؟ کیا ان کا تعلق جغرافیائی حالات سے ہے یا اور شرح کے تقاضے تھے؟ اسلام نے اس رسم کو بالکل ختم کیوں نہ کیا؟ اسلام نے تعدد ازواج پر کیا بندشیں لگائی ہیں؟ آخر، آج مرد و زن دونوں تعدد ازواج کے خلاف کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟ اس کے پس منظر میں انسانی و اخلاقی بنیاد ہے یا دوسرے اسباب و علل کا رفرما ہیں؟ یہ مطالب ہیں جن پر ہم گفتگو کریں گے۔

تعدد ازواج کے تاریخی اسباب

①

تعدد ازواج کے تاریخی اور سماجی علل و اسباب کیا ہیں؟
اس رسم کو بہت سی قوموں نے قبول کیا خصوصاً مشرقی اقوام و مل نے اور کچھ قوموں نے اسے قبول نہیں کیا خصوصاً مغربی اقوام و مل نے اس کی وجہ کیا ہے؟
تین قسم کے جنسی روابط ہیں۔ چند ازواجی صورت نے کیوں رواج و قبولیت حاصل کی، اور چند شوہری اور جنسی اشتراکیت کے نظام یا تو نافذ و رائج ہی نہ ہو سکے یا اکادہ وقوع پذیر ہوئے ایسا کیوں ہے؟

جب تک ان اسباب و علل کی چھان بین نہ ہو، ہم اسلام کے نظریہ تعدد ازواج بحث نہیں کر سکتے اور نہ آج کے انسان کی ضرورت کے بارے میں گفتگو ممکن ہے۔
اگر ہم ان لا تعداد مطالعات کو نظر انداز کر دیں، جو نفسیاتی اور معاشرتی سطح پر کیے گئے ہیں اور بہت سے مضیفین کی طرح سطحی طور پر سوچنا کافی سمجھیں تو سماجی اور تاریخی عوامل و اسباب تعدد ازواج پر وہی مشہور ”ترجیح بد“ دھڑانا ہوگا جو اس قسم کے مسائل میں ہمیشہ دھڑایا جاتا ہے۔ کہ

تعدد ازواج کی علت بہت واضح و روشن ہے۔ اس کی علت و وجہ مرد کی نور آوری اور تسلط طلبی اور عورت کی کنیری اس کا سبب ہے۔ اس رسم کی علت پدرا ہے چونکہ مرد، عورت پر بالادستی اور حکمرانی رکھتا ہے اس لیے اپنے فائدے کے

رسم و رواج ڈھالتا اور بناتا رہا ہے۔ ”چند زنی“ کی رسم بھی اس نے نفع اور عورت کے نقصان کے لیے صدیوں سے بنا رکھی ہے۔ عورت چونکہ مرد کی محکوم تھی لہذا وہ ”چند شوہری“ کی رسم اپنے نفع کی خاطر جاری نہ کر سکی۔ اب مرد کی طاقت آزمائی کا دور ختم ہو گیا ہے لہذا ”چند زنی“ کا طرہ امتیاز چھین لیا جائے گا اور اس غلط امتیازی رویے کی جگہ زن و مرد کو برابر کے حقوق دیے جائیں گے۔

اگر مہیوں سوچنے لگیں تو بڑی سچی اور گھٹیا بات ہوگی۔ ”چند زنی“ رسم کے رواج پانے کا سبب نہ تو مرد کی زور آوری ہے نہ ”چند شوہری“ نظام کی ناکامی کی وجہ عورت کی محکومیت و کمزوری۔ نہ یہ حقیقت ہے کہ آجکل مرد کی زور آوری کا دور ختم ہو گیا ہے لہذا ”تعدد ازواج“ کا دستور منسوخ ہو رہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ”ترک تعدد ازواج“ سے مرد نے واقعا اپنا امتیاز ضائع کر دیا ہے۔ بلکہ واقعا، مرد نے عورت کے خلاف آج ایک امتیاز مزید حاصل کر لیا ہے۔

میں ”زور و قدرت“ کو تار و نخ بشر بدنے والے عامل تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس نظریہ کا منکر بھی نہیں کہ مرد نے اپنی قوت کے سہارے عورت سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میرا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ طاقت و اقتدار کو اکیلا عامل سمجھنا، خصوصاً گھریلو زندگی اور میاں بیوی کے رشتوں اور رویوں میں کوتاہ نظری ہے۔

اگر مذکورہ بالا نظریہ صحیح ہے تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ جب اور جہاں ”چند شوہری“ کی رسم عملی تھی۔ جیسے جاہلی عرب اور بقول مان لکھو، ملائکہ ساحلوں میں نامیر قبیلہ۔ وہاں ایک دور ایسا تھا، جب عورت کو موقع ملا، اور اس نے مرد کے خلاف اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے ”چند شوہری“ نظام مردوں پر مسلط کر دیا۔ وہ دور خواتین کا ”طلائی دور“ ہے۔ حالانکہ جاہلیت عرب

دور سب کے نزدیک عورت کی زندگی کا تاریک ترین عہد تھا۔ ہم نے گزشتہ مقالے میں مان ٹسکو، کا مطالعہ نقل کیا، جس میں اس کے بقول "چند شوہری" کی رسم نائبر قبیلے میں رائج ہونے کا سبب عورت کی عزت و قوت نہیں بتائی گئی بلکہ اسی رسم کے رائج کرنے کی علت یہ کہی گئی ہے کہ وہاں کے لوگ فوجیوں کو گھریلو زندگی کے بند سے آزاد رکھ کر ان کے فوجی جذبہ و کردار کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تعداد ازدواج کی وجہ "پدر شاہی" اور "پدر سالاری" ہے تو اس کا رواج مغربی اقوام میں کیوں نہ ہوا؟ کیا "پدر شاہی" نظام سرزمین مشرقی سے مخصوص تھا۔ مغربی باشندے اس وقت بھی عیسائی مزاج و مہترم سرشت تھے۔ وہ لوگ شروع ہی سے عورت کے لیے مرد کے مقابل اور مساوی حقوق جانتے مانتے تھے؟ کیا فقط سرزمین مشرقی ہی میں مرد کی قوت کا سبب مرد کے نفع کا انشٹام کرتا رہا، اور مغرب میں اس عامل و سبب کا رویہ عاوانہ و منصفانہ رہا ہے؟

مغربی عورت نصف مادی پہلے تک بد نصیب ترین خواتین عالم تھیں۔ وہ اپنی ذاتی املاک و دولت میں بھی مرد کی سربراہی (فیمومیت) کی محتاج تھیں۔ خود اہل مغرب کے بقول قرون سنی میں مشرقی عورت کی حالت غریبی عورت سے بہت اچھی تھی۔ گوستان و یونان نے لکھا ہے: اسلامی تمدن کے دور میں خواتین کو جینے و بی درجہ و مقام حاصل تھا جو مدت مدید کے بعد یورپی خواتین کو حاصل ہوا یعنی عربوں کے اس دلیرانہ کردار کے بعد جس نے یورپ میں ان کے خلاف پروپیگنڈے کی بنیاد رکھی..... بہادرانہ اخلاق جس کا ایک جزو خواتین سے حسن سلوک ہے۔ اہل یورپ میں مسلمانوں کے ذریعہ پہنچے، مغربی باشندوں نے مسلمانوں کی تقلید کی۔ جو مذہب، عورت کو پست درجے اور

مقامِ ذلت سے اوج، عزت و سر بلندی تک لاسکتا وہ اسلام ہے، عیسائیت نہیں ہے۔ جیسے عام لوگ سمجھتے ہیں، کیونکہ، قرونِ وسطیٰ میں ہمارے لیڈر اور بڑے رہنما عیسائی تھے اس کے باوجود احترامِ خواتین کا خیال نہ رکھتے تھے۔ قدیم تاریخ کی چھان پین سے اس بارے میں شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ ہمارے بزرگوں کو مسلمانوں کی تعلیم احترامِ خواتین سے پہلے ہمارے مراد سردار عورت سے انتہائی وحشیانہ سلوک کرتے تھے۔ دوسرے معنی میں بھی کم و بیش اس دور کے مغربی حالات کی ایسی ہی تشریح کی ہے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے، جب قرونِ وسطیٰ میں "پدر شاہی" و قوت و زبردستی حکومت کا عروج تھا، تعددِ ازاواج کی رسم پھر رائج کیوں نہ ہوئی؟

حقیقت یہ ہے کہ

جہاں چند شوہری نظام موجود تھا، وہاں عورت کو مہلت اقتدار، اور جہاں نظام چند شوہری نہیں سکا وہاں سب اصلی خواتین کی کمزوری نہیں تھا۔ مشرق میں تعددِ ازاواج، مرد کی بالادستی و حکومت یا مغرب میں تعددِ ازاواج کا نہ پایا جانا، مرد و زن کی مساوات کی نتیجہ نہیں ہے۔

چند شوہری نظام کی ناکامی کی وجہ چند شوہری رسم کی شکست کا سبب یہ ہے کہ یہ رسم دستور نہ مرد کی فطرت کے

مطابق ہے نہ عورت کی طبیعت سے ہم آہنگ۔ پہلی بات کہ فطرتِ مرد کے خلاف ہے، مطلب یہ ہے کہ مرد انحصارِ طلب اور بیوی کو فقط اپنا دیکھنا چاہتا ہے، چند شوہری اس تقاضے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسم چند شوہری اطمینانِ پدری پر مشتمل فرزند کی بنیاد کے خلاف ہے۔ انسان کا طبعی و فطری تعلق اولاد سے بہت گہرا ہے۔ انسان فطرتاً تو والد و ناسل چاہتا ہے۔ اسی کی خواہش رہتی ہے کہ نسل آئندہ اور نسل گزشتہ سے اس کا سلسلہ معین و اطمینان بخش ہو۔

وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس بیٹے کا باپ اور کس باپ کا فرزند ہے۔ چند شوہری عورت آدمی کے اس فطری مطالبہ سے جوڑ نہیں کھاتی تھی۔ بخلاف ”چند زنی“ نظام کے، اس رسم میں نہ مرد کو چوٹ لگتی تھی نہ عورت

کہتے ہیں، تقریباً چالیس خواتین کا وفد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پوچھنے لگا کہ اسلام نے مردوں کو کئی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت کیوں دی، اور خواتین کو چند شوہر کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ درجہ بندی کی بات نہیں ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے کچھ چھوٹے پانی بھرے برتن طلب کئے اور وہ برتن ان خواتین کو دئے۔ پھر حکم دیا کہ ہر ایک اپنے ہاتھ کے برتن کا پانی سامنے رکھے ہوئے بڑے برتن میں اندیل دے، سب نے تعمیل حکم کی، اس کے بعد فرمایا کہ اب ہر ایک اپنے اپنے اندیلے ہوئے اصل پانی کو دوسرے برتن میں لکالو۔ سب نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پانی ایک دوسرے میں مل چکا اے شخص و معین کرنا ناممکن ہے۔ حضرت نے فرمایا: اگر ایک عورت کئی شوہر کرے تو ہر ایک سے ہم بستری ہوگی جب حمل ہوگا تو وہ کیسے شخص و معین کر سکے گی کہ بچہ کس شوہر کی نسل سے ہے۔ یہ بات ہوئی مرد کے زاویے سے۔

عورت کے زاویے سے دیکھیے۔ چند شوہری سسٹم، فطرت زن اور اس کے منافع کے خلاف ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے فقط جنسی آسودگی ہی نہیں چاہتی، جو یہ کہا جائے کہ جتنے زیادہ شوہر ہوں گے اتنا ہی اچھا ہے۔ بیوی ایک ایسا وجود چاہتی ہے جس کے دل کو اپنے سے اپنا حامی و محافظ بنائے جو اسے ہر ناپسند بات بچائے اور وہ خود اس پر جان نثار کرے، محنت کرے اور اس سے دولت حاصل کرے، حاصل محنت و مشقت اس پر قربان کرے، منحور و مہر د ہو۔ ایک طوائف کو مرد جو روپیہ دیتا ہے یا وہ پیسہ جو عورت، محنت مزدوری کر کے حاصل کرتی ہے، وہ عورت کے وسیع

اخراجات و ضروریات کے لیے ناکافی تھے۔ اس کے اخراجات ایک مردے کی گنا
 نائد ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس آمدنی کا مقابلہ اس دولت سے کہاں، جو
 دولت ایک مرد بیوی کے عشق و محبت کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ شوہر جو مال و دولت
 اپنی بیوی کے ضروریات کے لیے خرچ کرتا ہے وہ ایک فداکار کے انداز میں صرف کرتا
 ہے۔ گھریلو زندگی کی مرکزیت اور رفیق حیات و اولاد کی محبت و کشش، شوہر کو شوق
 دلاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں کارکردگی و فداکاری کو باقی رکھے۔

ایک عورت، کئی شوہروں کے ہوتے ہوئے، ایک مرد جیسی حمایت و محبت و مخلصانہ
 جذبات و فداکاری حاصل کر سکے، اسی لیے ”چند شوہری“ سسٹم کو طوائف کشی کی طرح
 قابل نفرت سمجھا گیا ہے۔ لہذا ”چند شوہری“ رسم نہ مرد کے رجحانات کے مطابق ہے
 نہ عورت کے جذبات و رجحانات سے ہم آہنگ ہے۔

جنسی اشتراکیت کی ناکامی کی علت بھی یہی ہے جنسی اشتراکیت میں اختصاص ختم ہو جاتا ہے

جنسی اشتراکیت کی شکست

نہ عورت کسی عین مرد سے اختصاص رکھتی ہے نہ مرد کسی عین عورت سے گہرا تعلق رکھتا
 ہے۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہی تجویز افلاطون نے پیش کی تھی، یہ بات ضرور ہے کہ اس نے
 طبقہ حاکم کی سطح پر اسے سوچا تھا۔ یعنی یہ دستور اس کی زبان و اصطلاح میں، فلسفی
 حاکم اور حاکم فلسفیوں کے لیے ہونا چاہیے۔ افلاطون کی یہ تجویز نہ دوسروں کے نزدیک
 منظوری کے لائق تھی نہ خود افلاطون اس نظریہ پر باقی رہا، اس نے بھی رائے بدل لی۔
 ایک صدی قبل فارڈ ریک انجلس، کمیونزم کے دوسرے بپا نے بھی یہی تجویز
 رکھی اور اس کے خلاف نظریوں اور دسیلوں کو رد کیا، لیکن کمیونسٹ بدلاک نے اسے
 منظور کیا۔ کہتے ہیں کہ شوروی حکومت (روس) نے بے شمار تلخ تجربوں کے بعد
 عائلی اشتراک کی تھیوری جو انجلس نے بتائی تھی اسے ۱۹۲۸ء میں بدل دیا، اور کچھ قوانین

گھر نئی زندگی کی فلاح و بہبود کے واسطے وضع کر کے ایک شوہر ایک بیوی کا قانون کمونسٹ حکومت کا بھی قانون مان لیا۔

ایک شوہر کے لئے کئی بیویاں امتیازی بات مانی جاسکتی ہے، لیکن ایک بیوی کے واسطے چند شوہر کوئی عزت نہ پہلے مانا گیا نہ آئندہ مانا جائے گا۔ اس فرق کا باعث یہی ہے کہ مرد عورت کی ذات چاہتا ہے اور عورت مرد کا دل اور اس کی فداکاری کے طلب گار ہے۔ مرد جب تک بیوی کی ذات پر اختیار رکھتا ہے اس وقت اس سے اس کا دل دے دینے سے کوئی دلچسپی نہیں، لہذا، ایک سے زیادہ بیویاں اگر اسے اپنا دل نہ دیں تو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے مقابلے میں بیوی، شوہر کے دل اور توجہات کو اصل سمجھتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے دے دیتی ہے تو سب کچھ ضائع کر دیتی ہے۔

دوسری لفظوں میں — ازدواجی زندگی میں دو عنصروں کا دخل ہوتا ہے۔ ایک مادی دوسرا روحانی — مادی عنصر ازدواج جنسی پہلو لیے ہوتا ہے جوانی میں یہ پہلو خوش و غرض پر ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کم ہو کر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ روحانی عنصر (معنوی نفسیاتی حصے) میں وہ نرم و لطیف جذبات اور خلوص و محبت کی حکمرانی ہوتی ہے جو کبھی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑی مضبوط ہو جاتی ہے۔ عورت و مرد کے درمیان جو فرق ہیں، ان میں سے ایک فرق یہی ہے کہ عورت کی نظر میں دوسرا عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مرد کے خیال میں پہلا عنصر، ورنہ کم از کم مرد کی نظر میں مادی و روحانی دونوں پہلو مساوی تو بہر حال ہوتے ہیں۔

ہم نے جو بیویاں متعلقے میں اس موضوع پر گفتگو کے دوران ایک مغربی ماہر نفسیات خاتون کو سنیں پیش کیا تھا کہ عورت چونکہ شکم اور آغوش میں بچے کی پرورش کرتی ہے اس کے نفسیاتی حالات ہی کچھ اور ہوتے ہیں، وہ اپنے شوہر سے اس کی محبت اور خصوصی توجہ کی بے حد آرزو رکھتی ہے، اسی محبت و توجہ جو اس کے شوہریت کے احساس کے ساتھ

اس کے زیر تربیت بچے کے باپ کی حیثیت بھی لیے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ ماں کی مامتا کا پٹلا، باپ کی محبت فرزند کے پلے سے زیادہ وزنی ہوتا ہے، باپ کی محبت میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بچے کے وجود میں آنے کا ایک عامل ہے۔ عورت کی یہ خاص نیاز زندگی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب شوہر ایک ہو۔

بنابریں ”چند شوہری کا مقابلہ“ چند ازواجی سے بہت بڑی غلطی ہے، پھر ان میں فرق کا زمانہ مابین دنیا کے ایک بڑے حصے میں ”چند ازواجی“ نظام کے رواج پاتے کی علت مرد کی زود آوری قرار دینا، اور یہ کہنا کہ عورت اپنی کمزوری اور بے اختیاری کی وجہ سے ”چند شوہری“ سسٹم جاری نہ کر سکی سراسر غلط ہے۔

کتاب انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران کے صفحہ ۳۴ پر خانم منوچہریان کہتی ہیں:

”قانون مدنی کی دفعہ ۴۹ میں ہے۔ ”بیوی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص، بھائی کی لڑکی، یا سالی کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا.... اگر بیوی اجازت دے دے تو اس کا شوہر بھائی کی یا سالی کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر بیوی اجازت نہ دے تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہی جوشل ہے۔ ”آنکہ عوض دارد گمہ ندارد“ مرد کسی اور سے نکاح کر لے گا۔ اچھا۔ اب مسئلہ کو الٹ کر دیکھیں پھر کیا ہو گا؟ مثلاً، یہ کہیں۔ بیوی اپنے شوہر کے بھائی کے لڑکے یا بہن کے لڑکے سے شوہر کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ جب تک وہ اس شخص کی بیوی ہے۔ یہ بات سن کر خدائی رگ پھڑکتی، خون جوش مارتا اور آدمی چٹخنے لگتا ہے، یہ تجویز خلاف انسانیت ہے۔ عورت کی فطرت و مزاج کے خلاف ہے۔ جواب میں دینا چاہئے، کہ یہ تجویز دراصل اصل (مصلحہ)

کنیزی زوجہ کے خلاف ہے۔ جیسے ایک مال کا ایک مالک ہوتا ہے اور اگر متعدد مالک ہوں بھی نفع اور محصول ایک ہی حاصل کرتا ہے، قانون ملکیت کے واضح اور ضمنی مطالب کی بنا پر بیوی کا بھی اموال کے ذیل میں آتی ہے، لہذا اسے بھی ایک سے زیادہ مالک نہ رکھنا چاہئے۔

.....

اسی کتاب کے صفحہ ۷۳ پر لکھا ہے :

”ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ جیسے مرد کو چار بیویوں کے رکھنے کا حق ہے، عورت بھی انسان ہے وہ بھی مرد کے برابر ہے۔ اسے بھی مرد جیسے حقوق کا مالک ہونا چاہئے۔ اس صغریٰ، کبریٰ کا نتیجہ مردوں کے لیے بڑا درست ہے۔ اسی وجہ سے ان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز ہوتی ہے، ہرے بھڑک اٹھتے ہیں، آنکھیں آگ برسانے لگتی ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر کہنے لگتے ہیں۔ عورت ایک شوہر سے زیادہ مرد کیوں چاہتی ہے؟ ہم اس کے جواب میں نرمی و سرد مہری سے کہتے ہیں۔ مرد ایک سے زیادہ بیویاں کیوں کرتا ہے؟ ہم فساد اخلاق کا پروپیگنڈا نہیں چاہتے۔ ہم خواتین کی عفت و آبرو کو حقیر نہیں جانتے۔ البتہ۔ مردوں کو یہ ضرور سمجھانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے عورت کے بارے میں جو خیالات و نظریات قائم کر لیے ہیں وہ غیر مستحکم بنیاد پر قائم ہیں۔ مرد بھی کافی ہے، عورت بھی کافی ہے۔ اس لیے زن و مرد برابر ہیں۔ اگر مردوں کو مردانگی کی بنیاد پر چار عورتوں سے شادی کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی یہی حق ملنا چاہیے۔ فرض کیجئے کہ عورت عقل کے زاویے سے نسبت مرد کے عقل میں زیادہ توانا نہ ہو، جب بھی یہ یقین رکھنا چاہئے کہ روحانی بجلی اور نفسیاتی کیفیت عورت

میں مرد کے کم نہیں ہے۔“

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ مذکورہ بالا بیانات میں ”چند زنی“ اور ”چند شوہری“
تھا میں کوئی فرق نہیں بتایا جاسکتا ہے۔ بس ایک ہی بات دھرائی ہے۔ چونکہ مرد زوردار
تھا لہذا ذاتی نفع کے لیے ”چند بیویوں“ کی رقم چٹائی، عورت زادہ تھی، لہذا وہ
اپنی کینٹری کے خلاف ”چند شوہری“ کو رواج نہ دے سکی۔ ہاں مذکورہ بیان میں ایک
بات یہ بھی کہی گئی ہے ”چند زنی“ کے رواج اور ”چند شوہری“ کی ناکامی کا باعث
مرد کی مالکیت اور عورت کی ملکیت تھی، مرد مالک سمجھا جاتا تھا اس لیے اسے
ایک سے زیادہ عورتیں یعنی متعدد اموال رکھنے کا حق تھا۔ عورت مملوک تھی اور مملوک
کو ایک مالک سے زیادہ مالک بنانے کا حق نہیں لہذا وہ چند شوہری نعمت سے محروم
رہ گئی۔

اتفاقاً، مقالہ نگار خاتون کی رائے کے برخلاف ”چند شوہری نظام“ کا ناکام ہونا
دلیل ہے کہ مرد عورت کو مال نہیں سمجھتا تھا۔ کیونکہ مال میں شرکت، چند آدمیوں کا
ایک مال مل کر خریدنے اور سب کا مل جل کر ملکیتی مال سے فائدہ اٹھانے کی رسم
پوری دنیا میں جاری ہے۔ اگر مرد، خواتین کو مال سمجھتے تو اس میں شرکت جائز سمجھتے
اور سب مل جل کر فائدہ اٹھاتے۔ دنیا میں کہاں کا قانون یہ ہے کہ ایک مال کا مالک
ایک سے زیادہ نہ ہو؟ اس کا جواب دیں، پھر ہم سمجھیں گے کہ ایک شوہری کا فلسفہ
ملکیت ہے۔

کہتے ہیں، مرد اکائی ہے۔ عورت اکائی ہے۔ لہذا دونوں کے حقوق برابر
ہونا ضروری ہے۔ مرد چند عورتوں سے فائدہ اٹھائے اور عورت چند مردوں
سے فائدہ اٹھائے، کیوں؟

میں کہتا ہوں: آپ کی غلط فہمی یہی ہے کہ تعدد ازواج کو آپ حقوق مرد میں

شمار کرتی ہیں اور تعدد شوہران حقوق زوجہ میں۔ حالانکہ تعدد زوجات حقوق ان سے متعلق ہے اور تعدد شوہراں نہ مرد کے حقوق میں ہے نہ عورت کے حقوق سے اس کا کوئی تعلق ہے یہ بات مرد کے مقاصد و منافع کے بھی خلاف ہے اور عورت کے مقاصد و منافع کے بھی حق میں اچھی نہیں بہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ قانون تعدد ازواج "اسلام نے عورت کے حقوق کو زندہ و ثابت رکھنے کے لیے منظور کیا ہے اگر اسلام مرد کی حمایت کرنا چاہتا تو وہی اقدام کرتا جو یورپ والوں نے کیا ہے وہاں قانون نے مردوں کو دوسروں کی عورتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا اس نے پہلی بیوی کے علاوہ سب پرہرہ اٹھالیا، پھر ستم یہ کہ اولاد بلکہ خود اس عورت کے قانونی حقوق بھی تسلیم نہیں کیے۔

چند شوہری، عورت کے لیے کوئی فائدہ رسان حق نہیں تھا جو اس کے چھین لیا گیا۔ کہتی ہیں۔ ہم مردوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ خواتین کے بارے میں ان کے نظریات خود ان کے پندار کے مطابق مضبوط و ناقابل تبدیلی نہیں۔

اتفاق دیکھیے کہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ آئندہ مقالات میں تعدد ازواج کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر واضح کریں گے، پھر اس مصنف اور دوسرے انصاف پسند ملتان سے اتماس ہے کہ ان مقالات کو دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اسلام کا نقطہ نظر کسی تغیرنا پذیر اصل پر مبنی ہے، یا نہیں؟ میں ایک شریفانہ وعدہ کرتا ہوں اگر کوئی شخص اس نظریے میں کوئی عیب نکال کر دکھائے تو میں حقوق خواتین کے بارے میں اپنی پوری بحث کو نظر انداز کر دوں گا۔

تعدد ازواج کے تاریخی اسباب

(جغرافیائی علل)

(۳)

”چند ازواجی“ رسم کے۔ واج پانے کے لیے، یہ عامل کافی نہیں کہ مرد ہوں پیشہ ہے اور بے چوں و چرا اس کو تسلط حاصل ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ کچھ اور علل و اسباب بھی موثر ہوں گے، ورنہ عیاش مرد کے لیے آسان اور بے درد سری کا راستہ، پھر وراثتی بازار کی آزاد طواغیوں سے حاصل ہو سکتی تھی، دوست، ساتھی، معشوقہ اور آزادی کی آزادی، ایک پسندیدہ عورت کو بیوی بنانا، اس کے مشکوک بچے کی ذمہ داری سنبھال لیتا۔

بنابرین، جن معاشرہ میں ”چند ازواجی“ رائج تھی وہاں یا تو عیاش و ہوس پیشہ افراد کے لیے اخلاقی رکاوٹیں تھیں، یا سماج نے ہوس رانی اور تنوع طلبی کا جرمانہ پرکھا تھا کہ قانونی پوی قبول کرے، اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد ملنے اور سبکی دیکھال کرے۔ یا پھر کچھ اور اسباب و وجوہ ہوں گے خواہ وہ جغرافیائی ہوں یا اقتصادی ماسوائی، بہر حال ہوس رانی و تنوع طلبی کا عمل دخل نہیں تھا۔

جغرافیائی عوامل

مان سکو۔ اور۔ گستاخوں بن تو جغرافیائی عوامل ہی پر زور دیتے ہیں۔ ان مفکرین کے خیال میں مشرق کی آب و ہوا کا تقاضا ہی تھا کہ ایک مرد کئی بیویاں کرے۔ مشرقی علاقوں میں عورت جلدی بالغ ہوتی ہے اور جلدی پورے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مرد کو دوسری اور تیسری

شادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مزید یہ کہ مشرقی آب و ہوا مرد کی جنسی قوت کے لحاظ سے کچھ ایسی ہے کہ ایک بیوی سے کافی نہیں ہوتی۔

گوستا و لون، تاریخ تمدن اسلام و عرب، (ترجمہ فارسی) صفحہ ۵۹ پر لکھا ہے۔ مذکورہ رسم (تعدد ازواج) فقط مشرق کی آب و ہوا کا نتیجہ تھی۔ آب و ہوا کی وجہ سے نسلی اور طرز زندگی کے خصوصیات دوسروں سے الگ ہوئے۔ یہ نہیں کہ مذہب یا رسم لایا تھا۔ آب و ہوا، اور قومی خصوصیات ہی وہ عوامل ہیں جو روزمرہ سے زیادہ مضبوط اور اثر انگیز ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اس بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ مشرقی عورت کی اصل فطرت و طبیعت اور اس کی ساخت، نینر نیچے کی پرورش اور بیماریاں جیسے عوارض انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ جلدی مرد سے دوری اختیار کر لیں موسم، اور قومی خیر کچھ ایسا ہے کہ مرد اس وقتی علیحدگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا، لہذا تعدد ازواج لازمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مان سکو، روح القوانین (فارسی ترجمہ) صفحہ ۲۳۰ پر لکھتا ہے؛
”جن ممالک میں گرم آب و ہوا ہے۔ وہاں لڑکیاں عموماً، آٹھ نو برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔ اور شادی کے بعد حمل آجاتا ہے۔ یعنی گرم علاقوں میں شادی اور حمل یکے بعد دیگرے ہونے والے نسل ہیں۔“

پیر پٹو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح میں کہتا ہے؛
”حضرتؐ نے پانچ سال کی عمر میں فدیجہ رضوانہؓ سے عقد کیا اور آٹھ سال کی عمر میں ہم خوابی کی، اسی لیے گرم سرزمین کی خواتین بیس برس میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ عقل کھال حاصل کرے تو بڑے مناسبے میں مبتلا ہو چکتی ہیں۔۔۔۔۔ جن ممالک میں موسم معتدل ہوتا ہے، وہاں خواتین کا حسن دیر تک باقی رہتا۔“

اس کے بعد وہ اصل مدعا پر آتا ہے :

”معلوم نہیں، رنسنس کے عہد تک قروں وسطیٰ میں شوہر دار خواتین سے زنا کم تھی، اور جس طرح قروں وسطیٰ میں پہلوانی کے پردے میں زنا خوبصورت عمل قرار دیا گیا تھا، اسی طرح رنسنس کے دور میں یہی عمل طالب علم لڑکیوں کے واسطے، دل کشی، اور نسوانی جادوگری کے نام سے عام تھا..... اونکے خاندانوں کی لڑکیاں، بڑی مدت تک خاندان سے باہر کے مردوں سے تنگ و در چھپا کر رکھی جاتی تھیں۔ شادی سے پہلے ان کو پاک و انہی کی تعلیم دی جاتی تھی، کبھی اس تعلیم کے دور رس نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں ایک واقعہ ہے کہ ایک جوان خاتون نے ناموس لوٹنے کے بعد دریا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ مگر یہ مثال ایسی تھی۔ کیونکہ اس کی موت کے بعد پادری کو اس کا جسم بنانے کی فکر ہوئی۔

شادی سے پہلے کے قصے قابل توجہ تھے۔ رنسنس کے اٹلی میں ہر شہر کے اندر لہجہ بچوں کے وجود کی دلیل زنا کے علاوہ کیا ہو سکتی تھی۔ ناجائز اولاد کا کسی گھر میں نہ ہونا عزت کی بات تھی مگر حرامی اولاد کا وجود کوئی رسوائی کا سبب بھی نہ تھا۔ عام رواج کے مطابق شادی کے وقت ہی مرد اپنی بیوی کو ناجائز اولاد لھر میں لانے کی تسلیی کرتا تھا۔ تاکہ دوسرے گھر کے بچوں کے ساتھ وہ بھی پرورش پائے۔ حرام زادہ ہونے سے کسی کی عزت کم نہ ہوتی تھی۔ اور سماج کی طرف سے جو داغ لگایا جاتا تھا، اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مزید برآں اس لڑکے کا جائز ہونا بھی مشکل نہ تھا، چری ص کے ممبروں کو رشوت دیکر سند حاصل کی جاسکتی تھی۔ اگر جائز اولاد نہ ہوتی تو بالاصل ناجائز لڑکا تخت و تاج شاہی کا وارث بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال فرنیٹ اول (FERRANTE) پیلز (NAPLES) کے بادشاہ، الفالنوا اول

(1 - ALFONSO) کا جانشین ہوا - یا - لیونی لو، ڈی ایرٹ (LEO - ACCOLO III) (NELLO D'ESTE) ، فیرارا (FERRARA) کے حکمران نکولو سوم کا جانشین ہوا تھا۔ ۱۴۵۹ء میں جب پیوس دوم (PIUS - II) فیرارا آیا تو سات شاہزادوں نے اس کا استقبال کیا، یہ ساتوں شاہزادے ہلال زادے نہ تھے۔ رانسس کے عہد میں حلال زادوں اور حرام زادوں میں بڑی رقابت اور کشمکش رہی..... رہی ہم جنسی تعلقات کی بات تو یونان قدیم کی ایک رسم کا جبری احیا ہوا.....

سان برنارڈینو (SAN, BERNARDINO) نے یہ شرناک عمل اتنا دیکھا کہ شہر کی قسمت کو سدوم اور غمورہ کی سرنوشت کہہ کر ڈرایا۔ اریٹی نیو - ARE) TINO نے بھی روم میں اس بدافلاقی کا مشاہدہ اسی فراوانی سے کیا..... دوسری فحاشیوں کے سلسلے میں بھی یہی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ "این فسورا" (INFESSURA) کو پورنشپین روم میں اپنے شماریات کی اہمیت بڑھانے کے شوق نے کہا۔ ۱۴۹۰ء میں ۹۰ ہزار کی رومی آبادی تھی اور ۶۸۰۰ عواکفوں کے نام درج دفتر تھے۔ اور اس تعداد میں چھپ کر اور بغیر لائسنس کی عواکفوں کا شمار نہیں ہے۔ وینز کے شماریات ۱۵۰۹ء کے مطابق ۱۱۶۵۴ فاحشہ عورتیں تھیں جبکہ شہر کی آبادی تین لاکھ تھی..... پندرہویں صدی میں جو بڑی پندرہ برس کی عمر تک شوہر کے گھر نہ جاسکتی تھی وہ ننگ خاندان سمجھی جاتی تھی۔ سولہویں صدی میں "رسوالی کی عمر" سترہ سال تک کر دی گئی، تاکہ بڑکی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ جن مردوں کو عیاشی کی تمام تر پہولتیں حاصل تھیں، وہ صرف اس وقت شادی پر مائل ہوتے تھے جب لڑکی اپنے ساتھ قابل کشش ہمیز لائے..... قرون وسطی کے قوانین ازدواج کے مطابق، شادی دوران

دونوں کے تعلقات دیکھے جاتے تھے کہ میاں بیوی میں محبت پختہ ہو جائے، خوشی اور غمی، خوشحالی و تنگی میں ایک دوسرے کے ساتھی اور غمخوار رہیں، عام طور پر یہ آرزو پوری بھی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود شادی شدہ عورتوں سے بدکاری کا رواج تھا اونچے درجے کے آدمیوں میں شادیاں ڈیپلومیٹک اور سیاسی و اقتصادی اتحاد کے لئے ہوتی تھیں، بہت سے شوہر، کسی محبوبہ داشتہ سے تعلق اپنا حق جانتے تھے۔ بیوی کو ناگوار بھی ہوتا تو انھیں لب بند رکھنے پر مجبور ہوتی تھی۔

متوسط طبقے میں کچھ لوگ تفریحی بدکاری کو جائز سمجھتے تھے۔ میکیا ولی اور اس کے دوست اپنی بیویوں کی داستاؤں سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب بیوی اپنے شوہر کی تقلید میں شوہر سے انتقام لیتی تھی تو عموماً شوہر اس اقدام سے چشم پوشی کرتے اور غیرت کی ٹوپی ذرا اونچی کر لیتے تھے۔

جی، یہ تھی عوامی زندگی ان حضرات کی جو تعداد ازدواج کو مشرق کا ناقابل معافی جرم سمجھتے تھے اور کبھی کبھی اس علاقے کے موسم کو قبول ان کے، اس غیر انسانی عمل کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ مگر ان کا علاقہ، ان کا موسم اور ان کا ماحول انھیں بیوی سے بے وفائی اور ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

ضمناً، یہ نکتہ بھی بن کہا نہ رہ جائے کہ قانونی (شرعی) طور پر کئی بیویاں رکھنے نہ کادستور اہل یورپ میں، اچھے برے سے بحث کے بغیر اصل دین عیسوی سے غیر متعلق ہے۔ دین مسیح میں کئی بیویاں نہ رکھنے کا کوئی حکم ہے ہی نہیں۔ بلکہ حضرت مسیحؑ تورات کے ضابطوں کی تائید کرتے ہیں اور تورات میں لکھی بیویوں کو قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔ بنابرین ہیں تو یہ کہنا چاہئے کہ دراصل دین مسیح میں کئی بیویاں جائز قرار دی گئی ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پرانے مسیحی کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ لہذا یورپ والوں کا کئی بیویوں کے قانونی نظام سے الگ رہنا ایک یا متعدد اسباب

مبنی ہوگا، مذہب تو علت نہیں ہے۔

ماہواری :

کچھ لوگوں نے تعدد ازواج کا سبب بتایا ہے کہ ماہانہ بیماری، اور مدت ماہواری میں مرد کو لذت اندوزی سے روکنے کا احساس، پھر بچہ جننے سے تھکن اور غلیظگی کی خواہش، بچہ کی خوراک و پرورش کا مسئلہ، ایک بیوی سے زیادہ تقاضا کرتا ہے۔ ویل ڈیورنٹ کے بقول:

”ابتدائی معاشرتوں میں بیوی جلدی بوڑھی ہو جاتی ہے اور مرد سے دوسری شادی کی خواہش کرتی ہے تاکہ اپنے بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے اور تولید اولاد میں درمیانی فاصلہ بڑھا سکے اور مرد کے شوق تولید اور جنسی عمل میں رکاوٹ نہ بنے، عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلی بیوی، اپنے شوہر سے دوسری شادی کی فرمائش اس لئے بھی کرتی تھی کہ اس کا کام ہلکا ہو، اور نئی خاتون سے بچے ہوں۔ جس سے فائدہ اور سرمایہ بڑھے۔“

بلاشبہ، عورتوں کی ماہانہ بیماری، اور بچہ جننے سے تھکن، کی بنا پر جنسی عمل میں دونوں دو الگ سمتوں میں واقع ہوتے ہیں، اس بنیاد پر مرد کو کچھ نہ کچھ دوسری عورت کا خیال آتا ہے لیکن دونوں مذکورہ علتیں مستقل سبب تعدد ازواج نہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اخلاقی یا سماجی رکاوٹ موجود ہو جو مرد کو اس کی آرزو پورا کرنے اور معشوق بنانے یا آزاد زن پرستی کا عمل نہ کرنے دے۔

خواتین کی زوجگی کا سن محدود ہوتا ہے

بعض حضرات کے خیال میں مرد کے برخلاف خواتین کی تولیدی قوت ایک خاص

عزت تک رہتی ہے۔ پھر وہ "یا لہ" ہو جاتی ہے، یہ بھی تعدد ازواج کی وجہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بیوی اس وقت "یا لہ" ہو جب یا تو شوہر کے لئے اولاد کافی نہ پیدا ہوئی یا وہ بچے فوت ہو چکے ہوں۔

مرد کا رجحان فرزند طلبی، اور بیوی کو طلاق نہ دینے کا خیال سبب ہوتا ہے کہ دوسری یا تیسری بیوی گھر میں لائے، جیسے پہلی بیوی کا ناقابلِ تولید ہونا شوہر کے لئے دوسری بیوی کا محرک ہے۔

اقتصادی اسباب

تعدد ازواج کے اقتصادی اسباب و عوامل کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں، اس زمانے کے برعکس پرانے زمانے میں زن و فرزند کی کثرت اقتصادی طور پر مرد کے لئے نفع بخش چیز تھی۔ مرد، اپنے بیوی بچوں سے غلاموں کی طرح بیکار لیتا تا تھا، کبھی اپنے بچوں کو بیچتا بھی تھا۔ بہت سے افراد کی غلامی، جنگی قیدی ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ ان باپوں نے انھیں بازار میں لے جا کر بیچا تھا۔

تعدد ازواج کی یہ وجہ ممکن ہے صحیح ہو، کیونکہ فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ مرد قانونی بیوی کے ذریعے کثرتِ اولاد سے فائدہ اٹھائے، محبوباؤں کی تلاش اور زندگی بازاری سے مرد پر خصوصیت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس سبب کو ہر ایسے معاشرے میں موثر نہیں مانا جاسکتا، جہاں کثرتِ ازواج کی رسم موجود ہو یعنی یہ سبب عام سبب نہیں ہے۔

فرض کریں کہ شروع شروع میں اقوام و قبائل اسی وجہ سے متعدد بنادیاں کرتے تھے، لیکن سب قومیں ایسی نہ تھیں۔ پرانی دنیا میں کئی بیویاں رکھنے کی رسم اس طبقات میں رائج تھی۔ جوشان و شوکت، شخصیت و امتیاز کے ساتھ زندگی گزارنے

والے تھے۔ بادشاہ، امیر، سردار، مذہبی رہنما اور خاص تاجر جیسے لوگ۔
معلوم ہے کہ یہ طبقات بیویوں اور اولاد کی فراوانی سے کوئی اقتصادی فائدہ حاصل
نہیں کرتے تھے۔

تعداد و خاندان ایک سبب

کثرتِ اولاد، اور خاندان کی نفی بجائے خود ایک اور عامل تھا کہ کئی شادیاں
کی جائیں۔ زن و مرد کو دو مختلف ہتھوں اور دو فرق مراتب رکھنے والی ایک بات
یہ بھی ہے کہ ایک عورت جس تعداد میں بچے پیدا کر سکتی ہے وہ محدود اور گنتی کے ہیں،
خواہ ایک شوہری نظام ہو یا چند شوہری۔ لیکن مرد کی قوت تولید، زیر اختیار عورتوں
کی تعداد پر منحصر ہے۔ ممکن ہے ایک مرد سیکڑوں عورتوں سے ہزاروں بچے پیدا
کروا سکے۔

آج کی دنیا کے برخلاف، پرانے زمانے میں ایک اور اہم عامل یہ تھا کہ مردوں
کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لڑکیوں کی شرحِ پیدائش لڑکوں سے
زیادہ نہ اس وقت تھی نہ اب ہے۔ اگر اتفاقاً کچھ علاقوں میں لڑکیوں کی شرح
پیدائش زیادہ ہو بھی تو دوسرے علاقے میں اس کے برعکس ہے وہاں لڑکوں کی شرح
پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہوگی۔ ایک چیز ضرور ہے اور وہ ہے مردوں کی شرح
اموات کا عورتوں سے زیادہ ہونا۔ مردوں کی شرحِ اموات ہمیشہ ایک سبب
رہا ہے کہ اگر ایک بوی کے دستور پر قائم رہا جائے تو عورتوں کی بڑی تعداد، قانونی
شوہر، گھر، زندگی اور جائز اولاد سے محروم رہے گی۔

انتہائی زمانے کے معاشرے میں ایسا ہی تھا، بحث کی بات ہی نہیں، ہم
ویل ڈیویڈنٹ کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ :

سماج کی پہلی منزل میں جنگ و شکار کی وجہ سے مردوں کی زندگی خطرے میں رہتی تھی۔ اور مرد، غورتوں سے زیادہ مرتے تھے۔ غورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی سبب یا کئی بیویوں کا نظام رواج پاتا یا عورتیں بے شوہر کے رہتیں۔

تحقیق

تاریخی لحاظ سے جن عوامل و اسباب کو "تعداد ازواج" کی اساس مانا جاسکتا ہے وہ یہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ان عوامل و اسباب میں کچھ علتیں حقیقی نہیں، تعداد ازواج کے ذیل میں ان کا تذکرہ بلاوجہ کیا جاتا ہے، جیسے موسم۔ اس کے علاوہ مزید تین قسموں کے علل و اسباب کا مزید جائزہ لیجئے۔ پہلی قسم ان علل و اسباب کی ہے، جن کے اثر سے مرد تعداد ازواج کی طرف مائل ہونا ممکن ہے، یعنی مرد کے لئے وجہ جواز تو کوئی نہیں۔ مگر زور و ظلم و اتعداد کا پہلو قوی ہے۔ اقتصادی عامل بھی اسی قسم کا ہے، اور ہم اس پر توجہ دلا چکے ہیں۔ دوسرے علل کا قانونی زاویہ سے مطالعہ کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی وجہ جواز مرد یا معاشرے کے واسطے موجود ہو۔ مثلاً بیوی کا بانجھ ہونا یا اس کا "بائسہ" (ماہواری بند ہونے کی عمر کی عورت ہونا) دوسری طرف شوہر کا محتاج فرزند یا قبیلے اور ملک کا طالب کثرت آبادی ہونا۔ یہاں کلیہ کے طور پر زن و مرد کی فکری عوامل کو از زاویہ سے دیکھا جائے گا کہ جنسی آسودگی یا تولید نسل کی بنیاد پر دونوں کی نوعیت غیر مساوی ہے۔ اسی پہلو کو تعداد ازواج کے لئے وجہ جواز قرار دیا جاسکتا ہے۔

"تیسرے علل کا وہ حصہ ہے، جسے تیسری نوع میں اس وقت شمار کیا جاسکے گا

جب یہ فرض کر لیں کہ وہ گزشتہ صدیوں میں موجود بھی تھے، یا آج وہ عمل موجود ہیں ان میں سے بعض اسباب تو اتنے مؤثر ہیں کہ نہ صرف وہ تعدد ازواج کا جواز مہیا کرتے ہیں بلکہ اس سے تو مرد پر عورت کا ایک واجب الادا حق عائد ہوتا ہے اور فقط عورت ہی نہیں، معاشرے اور سماج کی ذمہ داری بھی یہی ہوگی کہ مرد کی شادی کرے، اس کی علت عورتوں کی عددی اکثریت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرض کر لیں گزشتہ دور یا موجود زمانے میں شادی کے قابل لڑکیاں، شادی کے قابل لڑکوں سے زیادہ ہوں اور ایک شادی قانونی قرار دی جائے۔ تو بن بیای اور گھریلو زندگی سے محروم خواتین کا ایک طبقہ سماج میں موجود ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعدد ازواج، محروم عورتوں کی طرف سے ایک "حق" اور مردوں اور گھریلو عورتوں کے کا ندھے پر ایک قانونی پابندی آپڑے گی، کہ بن بیای اور عائلی زندگی سے محروم عورتوں کو آباد کریں تاکہ وہ بھی خانگی زندگی حاصل کر سکیں۔

گھریلو زندگی سے زیادہ انسان کا فطری حق ہے۔ کسی بشر کو کسی نام اور کسی عنوان سے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ خانگی زندگی ایک حق ہے جو ہر فرد اپنے معاشرے میں پیدا کرتا ہے اور معاشرہ کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا جس کے نتیجے میں سماج کا کوئی گروہ اس حق سے محروم رہ جائے۔ اس حق کی نظیر، روزگار، روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم و تربیت اور آزادی، ہر بشر کا اولین حق اور حقیقی حق ہے۔ یہ حق کسی نام و عنوان سے چھینا نہیں جاسکتا۔ عائلی زندگی بھی ایک فطری حق ہے اور جب شادی کے قابل عورتوں کی تعداد شادی کے لائق مردوں کی نفی سے زیادہ ہو تو "صرف ایک بیوی" کا قانون، مذکورہ فطری حق کے خلاف ہے لہذا یہ قانون بھی حقوق فطری بشر کے خلاف ہوگا۔

ماضی کے بارے میں تو یہ سب کچھ ہو گیا، سوال یہ ہے کہ آج کیا کہا جائے؟
کیا آج بھی ان اسباب کا وجود ہے جن کی بنا پر کئی بیویاں رکھنے کا جواز نکلتا ہے
اور وہ علت بھی موجود ہے جو تعدد ازواج کو بطور ”حق“ فرض کرتی ہے۔ یا آج
ان چیزوں کا وجود نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر یہ مؤثر اسباب موجود ہیں تو پہلی بیوی کا حق کیا ہوگا؟
ان سوالوں کے جواب آئندہ فصل میں آ رہے ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

”ایک بیوی کئی شوہر“ کی رسم ختم و ناکام ہونے، نیشنل ”ایک شوہر کئی بیویوں“ کی کامیابی کے اسباب و علل پر گفتگو ہو چکی۔ ہم نے ”تعدد ازواج“ کی رسم شروع ہونے پر متعدد اسباب بیان کیے اور ان پر روشنی ڈالی۔ اس کا ایک سبب جنس مرد کے نفسیات میں حکومت و استبداد کا جذبہ ہے۔ ایک وجہ زن و مرد میں فطری حسد کا فرق ہے، دونوں میں سن و سال کے لحاظ سے تولید نسل کی صلاحیت، اور تولید فرزند کی تعداد میں امکانات کا اختلاف بھی ”تعدد ازواج“ کا جواز بن سکتا ہے۔

لیکن جو خاص ”علت“ پوری تاریخ میں اثر انداز رہی ہے وہ ہے ”تعدد ازواج“ عورت کا مرد پر ایک ”حق“ اور براہ راست مرد کا ایک ”فرض“ ہے۔ اور وہ علت ہے، قابل نکاح خواتین کی عددی کثرت اور شادی کے قابل مردوں کی کمی ہے۔

ہم طول کلام سے بچنے کے لیے ان علتوں پر بحث چھوڑ رہے ہیں جو اگرچہ خوب ”چند زنی“ کے لیے کافی نہیں مگر مرد کے لیے ”وجہ جواز“ ضرور ہیں۔ ہم اپنی گفتگو اس علت پر محدود کرتے ہیں کہ اگر وہ علت موجود ہو تو تعدد ازواج، عورتوں کے طبقے کا ”حق“ ضرور بنتا ہے۔

مذکورہ دعوے کے ثبوت سے پہلے دو باتیں بطور تمہید واضح ہونا ضروری ہیں:

- ۱۔ حتمی و یقینی شہادیات کی رو سے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ قابل شادی عورتوں کی تعداد، شادی کے قابل مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔

۲۔ اگر ایسی سند مل جائے تو حقوق انسانی کی رو سے محروم خواتین کا ایک حق، مردوں اور عورتوں کے ذمے عائد ہو جائے گا۔

پہلی بات: خوش قسمتی سے، آج کی دنیا کے پاس، اس بارے بڑی حد تک شماریات موجود ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک چند سال بعد مردم شماری کرتے ہیں۔ مردم شماری کی مہم ترقی ملکوں میں بڑے اہتمام سے اہم دی جاتی ہے۔ اس طرح مرد و زن کی الگ تعداد ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس سے مختلف برسوں میں عورت و مرد کی اوسط تعداد بھی دریافت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ بھی علم میں آجاتا ہے کہ ۲۰ سے ۲۴ سال کے لڑکوں کی تعداد کیا ہے اور اسی عمر کی لڑکیاں کتنی ہیں؟ ہر عمر کے افراد معلوم ہو سکتے ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ، اپنے سال مردم شماری میں ان اعداد و شمار کی اشاعت کرتا ہے۔ غالباً اب تک سولہ رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۹۶۴ء کی مردم شماری کی رپورٹ ۶۵ اور ۹ میں چھپی تھی۔ اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ ثبوت مدعا کے لیے، ہر ملک کے مردوں کی تعداد اور عورتوں کی مجموعی تعداد کیا ہے، یہی جاننا کافی نہیں ہے۔ مفید و لازم تو یہ معلوم کرنا ہے کہ شادی کے قابل لڑکوں اور شادی کے قابل لڑکیوں کی اوسط کیا ہے؟ کیونکہ قابل شادی مردوں اور شادی کے قابل عورتوں کی تعداد ان کے مجموعی اوسط سے عموماً مختلف ہوگی۔ اس کے سبب دو ہیں:

۱۔ لڑکیوں کے بلوغ کا زمانہ، لڑکوں کے زمانہ بلوغ سے پہلے آتا ہے، جب ہی تو دنیا بھر کے قوانین میں لڑکیوں کا قانونی سن لڑکوں کے قانونی سن سے کم ہے۔ عملی طور پر دنیا کی اکثریت میں شادی کے وقت لڑکی کی عمر لڑکے سے کم از کم پانچ سال چھوٹی ہوتی ہے اور شوہر اوسطاً بیوی سے پانچ برس بڑے ہوتے ہیں۔

۲۔ سب سے اہم اور بنیادی علت یہ ہے کہ اگرچہ لڑکیوں کی پیدائش، لڑکوں کی پیدائش سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہے، چند علاقوں میں تو لڑکوں کی پیدائش

کی شرح زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیشہ جنس ذکور کی موت کا اوسط جنس اناث سے زیادہ ہے اس سے شادی کی عمروں میں فرق پڑ جاتا ہے اور کبھی تو بہت زیادہ فرق نظر آنے لگتا ہے۔ یوں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد، شادی کے قابل مردوں سے کہیں زیادہ برآ جاتی ہے لہذا، ممکن ہے، ایک ملک میں ذکور کی تعداد اناث کی مجموعی تعداد سے مساوی یا زیادہ ہو، لیکن شادی کے قابل درجے میں، یعنی شادی کے قانونی عمر تک پہنچنے پہنچنے صورت حال برعکس ہو جائے۔

مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۶۲ء جو اقوام متحدہ کا اس بارے میں آخری نشریہ ہے، وجہ زیر نظر بحث لکھی گئی تھی (اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

مثلاً اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق کوریا کی مجموعی آبادی ۲۳۵،۶۴۷،۲۶۲ تھی ان میں مردوں کی تعداد ۱۲۵،۱۲۵،۱۳۷ تھی اور خواتین کی تعداد تھی ۱۱۰،۵۲۲،۱۳۰۔ یعنی کل آبادی میں سے ۱۲۹،۴۲۳ مرد، عورتوں سے زیادہ تھے۔ اس تعداد میں ایک سال کے کم عمر کے بچے، ایک سال سے ۴ برس تک اور پانچ برس سے نو برس تک اور بارہ برس سے چودہ، پندرہ سے انیس برس تک کی عمر کے بچے بھی شریک ہیں۔

شماریات بتاتے ہیں کہ ان عمروں میں ذکور کی تعداد اناث سے زیادہ ہے۔ لیکن بیس برس سے چوبیس برس تک کے ٹوٹل میں یہ نسبت بدل جاتی ہے۔ اس سن میں ۳۶۴،۰۸۲ ذکور اور ۱۱۱،۰۰۵ عورتیں۔ اور اس کے بعد قانونی شادی کے لئے زن و مرد کی عمروں کا حساب کریں تو عورتیں، مردوں سے زیادہ نکلتی ہیں۔

جمہوری کوریا کے شماریات استثنائی ہیں، وہاں مردوں کی مجموعی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف اکثر ممالک عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، یہ زیادتی، شادی کی عمر کے حساب سے بھی برقرار رہتی ہے۔

روس کی مجموعی آبادی ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ہے، اس میں مرد ۸۴،۰۰۰،۰۰۰ عورتیں ۱۱۸،۲۶۱ ہیں، یہ فرق شادی سے پہلے کی عمر تک ہے، شادی کی عمر، یعنی بیس سال

سے چوبیس سال، نو پچیس سال سے اسیس، تیس سے چوبیس، نینترسی برس سے چوراسی سال تک ہی نسبت برقرار رہتی ہے۔

انگلستان، فرانس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، چیکوسلوواکیہ، پولینڈ، رومانیہ، منگری، امریکہ اور جاپان میں یہی تناسب ہے۔ بعض علاقے ایسے ہیں جہاں اختلاف ہے مثلاً مشرقی و مغربی جرمنی میں فرق تناسب زیادہ نمایاں ہے۔

ہندوستان میں، عام طور پر اور عمر ازدواج میں خاص طور پر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے۔ البتہ پچاس برس اور اس کے اوپر عورتیں زیادہ، مرد کم ہو جاتے ہیں، بظاہر عورتوں کی کمی کا سبب ہندوستان کی وہ قدیم رسم ہے کہ جس میں بیوہ کو معاشرے سے ختم کر دیا جاتا ہے۔

گزشتہ سال ایران کی مردم شماری میں یہ بات سامنے آئی کہ ایران استثنائی ملک ہے جہاں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے اس رپورٹ کے مطابق ایران کی مجموعی آبادی ۹۰,۷۸۱,۷۲۵ ہے۔ اس میں سے مردوں کی تعداد ۴۲,۷۳۳,۷۳۳ ہے اور عورتیں ۴۷,۰۴۷,۹۹۲ ہیں۔ گویا اس میں ۸۹۳,۵۷۸ مرد، عورتوں سے زیادہ ہیں۔

مجھے یاد ہے، اُن دنوں، تعداد ازدواج پر بحث کرنے والوں نے لکھا تھا۔ دیکھیے، تعداد ازدواج کے حامیوں کے دعوے کے برخلاف، ہمارے ملک میں مردوں کی تعداد، عورتوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ اس بنا پر قانون ازدواج کو ختم کر دینا چاہیے۔

مجھے ان دنوں تعجب ہوا تھا کہ یہ لکھنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ پہلے تو قانون ازدواج ایران ہی سے مخصوص نہیں۔ دوسرے یہ کہ موضوع سے مربوط و مفید بات تو یہ ہے کہ آبادی کے قابل مرد، ان عورتوں سے زیادہ ہیں جو شادی کے لائق ہیں، یا کم ہیں؟ فقط یہ کہنا کہ مردوں کی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے، زیر نظر مقصد کے لیے کافی نہیں ہے۔ ابھی دیکھا ہے کہ جمہوری کوریا اور دوسرے ممالک میں بھی مرد زیادہ ہیں۔

لیکن شادی کے قابل افراد کی نسبت سے مردم شماری کی رپورٹ دیکھی تو عورتوں کی تعداد زیادہ نکلی۔ ایران جیسے ممالک کی مردم شماری کے قابل اعتبار نہ ہونے سے قصع نظر، اگر صرف ایران میں عورتوں کے رجحان پسزائی کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایرانی عورت مردم شماری کے آدمیوں کے جواب میں لڑکی پیدا ہونے کی جگہ، یہی کہیں گی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ لڑکا ہی لکھوائیں گی۔ یہی بات، مردم شماری کی رپورٹ سے اعتماد اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ ملک میں ہر جگہ منگنیوں اور رشتہ مانگنے کی رسم بس کثرت سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے، کیونکہ تعداد ازواج کی رسم اس ملک کے شہروں اور دیہاتوں حتیٰ کہ قبائل میں بھی عام تھی اور اب بھی ہے کبھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہاں خواتین کم ہیں۔ کبھی عورت کی بلیک مارکیٹ نہیں ہوئی، اس کے برعکس ہمیشہ رشتے کی خواہش کے چرچے عام رہے۔ لڑکیاں، بیوہ خواتین، یا کسی وجہ سے شادی سے محروم جوان عورتیں مجرد مردوں سے زیادہ موجود ہیں۔ بد صورت و غریب مرد بھی شادی کی طلب گاری کیے لکھے ہیں تو ناکام نہیں ہوئے، مگر لڑکیوں کی صورت اس کے برعکس ہے اور بے چاری لڑکیاں مجبوراً بے شوہر کے رہ گئی ہیں۔ یہ بات اتنی عام اور ہر جگہ ہوتی ہے کہ ہر رپورٹ اور شماریا سے زیادہ یقینی ہے۔

”اسی لے مونٹگیو“ نے ”زن جنس برتر“ میں ایک بے معنی بحث ”عورت کا آرٹسٹ ہونا سماجی مطالبہ کا نتیجہ ہے“ اور اسی ضمن میں اس نے کہا — پوری دنیا میں، ہمیشہ شادی کے قابل عورتوں کی تعداد زیادہ رہی ہے۔“

۱۹۵۰ء کی مردم شماری سے نشاندہی ہوتی ہے کہ امریکہ میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد اندازاً دس لاکھ، تیس ہزار اور چار سو ہے، یہ تعداد مردوں سے زائد ہے۔

(زن روز شمارہ ۶۹ صفحہ ۱۱۱)

برینڈرسل متہ شادی و اخلاق پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں بحث میں صفحہ ۱۱۵ پر لکھا ہے :-

”آج کے انگلستان میں بیس لاکھ سے زیادہ ایسی خواتین ہیں جو مردوں سے زیادہ ہیں اور روزمرہ کے مطابق ان کو ہمیشہ بے اولاد رہا ہے۔ اور یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔“

چند سال پہلے ایرانی اخبارات میں یہ خبر پڑھی تھی کہ جرمین میں خنک عظیم دوم کے نتیجے میں بے شوہر عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ قانونی شوہر اور گھریلو زندگی سے محرومی کے سبب ان عورتوں نے حکومت سے ”ایک شوہری“ قانون کے خاتمے کا مطالبہ کیا تاکہ ایک شوہر کئی کئی شادیاں کر سکے۔ حکومت نے اسلامی دانشگاہ ”الانہر“ سے سرکاری طور پر کوئی فارمولا طلب کیا۔ پھر ہم نے دریافت کیا تو اطلاع ملی کہ چرچ نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ دراصل کلیسا کی نظر میں خواتین کی محرومی یا بدکاری کی فراوانی صرف اس لئے قابل قبول ہے کہ تعداد ازواج ایک مشرقی و اسلامی فارمولا ہے اور اسے کسی حالت میں قبول نہ کرنا چاہئے۔

شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عدی کثرت کے علل و اسباب

کیا علت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہونے کے باوجود

شادی کے لائق عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں؟

اس کی علت و وجہ ظاہر ہے۔ مردوں کی شرح اموات عورتوں کی شرح اموات سے زیادہ ہے۔ جانی نقصانات کا زمانہ عموماً وہ عمر ہے جب مرد شادی کے قابل ہوتا ہے یا اس کے قریب، ناگہانی حادثات پر غور کریں۔ اور حوادث پر نظر ڈالیں جنگ، فرق۔ بندیوں سے گرنا۔ عمارتوں میں دبنا۔ ٹکڑیا اکیڈنٹ۔ جیسے حادثات جنس

ذکور سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔

بہت کم لیے حادثات میں عورت دکھائی دیتی ہے۔ انسان کا انسان سے متعلق

یا انسان کا فطرت سے تصادم ہر جگہ نقصان مردہ ہوتا ہے۔ فقط جنگ ہی کا مطالعہ کریں تو اول تاریخ بشریت سے آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں جب کسی نہ کسی علاقے میں جنگ ہو اور مرد کو جانی نقصان نہ اٹھانا پڑیں۔ یہی بات مکمل جواب ہے کہ شادی کی عمر میں زن و مرد کا توازن کیوں باقی نہیں رہتا۔

صنعتی عہد میں جنگی نقصانات کا تناسب اس جنگ سے کئی سو گنا بڑھ گیا ہے جو زنی اور شکاری دور میں ہوتی تھی۔ آخری دونوں عظیم جنگوں میں جنس ذکور کا جانی نقصان تقریباً سات کروڑ افراد تک پہنچا تھا۔ یہ تعداد کئی صدیوں پہلے بے شمار لڑائیوں کے برابر ہوگی اب ان آخری برسوں میں ہونے والی لڑائیوں ہی کو دیکھئے جو مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، افریقہ میں ہو رہی ہیں۔ وہاں جو کچھ گزر رہا ہے اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوگی۔ ویل ڈیورانت کہتا ہے :-

”تعداد ازواج کی رسم کے زوال میں چند عوامل کا دخل ہے۔ کاشتکاری کی زندگی جس میں سکون و قرار ہے، اس سے مردوں کی زندگی میں اضطراب و خطرات و خفقان کم ہو گیا۔ اسی وجہ سے مرد و زن تقریباً مساوی ہو گئے۔“

ویل ڈیورانت کے قلم سے عجیب بات دیکھی، یعنی اگر مردوں کا جانی نقصان فقط فطرت سے ٹکراتے کی بنا پر تھا، جب تو شکاری زندگی اور کاشتکاری میں فرق تھا۔ کیونکہ جنس ذکور کا بنیاد اتلاف جنگ سے ہوتا ہے۔ اور یہ صورت کاشتکاری زندگی میں شکاری زندگی سے کم نہ تھا، دوسرے یہ کہ مرد، ہمیشہ عورت کو اپنی نگہداشت میں رکھتا رہا اور جان جو کھوں کے کام خود انجام دیتا رہا ہے، بنا بریں عہد کاشتکاری میں بھی اسی طرح غیر متوازن تھا، جیسے دور شکاری میں تھا۔

ویل ڈیورانت، شینی دور کی بات صنعتی عہد کا نام نہیں لیتا، حالانکہ یہ عہد مردوں کی جان ضائع کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے اور توازن کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے۔

بیماریوں کے خواتین کی قوت مدافعت

مرد کے جانی اتلاف عورت کے جانی نقصان سے زیادہ ہونے، ایک سبب

نئے علوم کی ترقی کے نتیجے میں دریافت ہوا ہے وہ موضوع یہ ہے کہ بیماریوں سے مرد کا مقابلہ عورت سے کمزور ہے، لہذا بیماریوں میں مرد زیادہ مرتے ہیں اور خواتین کم۔

دی ماہ، ۲۵ اگست (۱۹۵۶ء/۱۹۵۷ء) کے روزنامہ "اطلاعات" (تہران) میں تھا:

"ادارہ شماریات فرانس کے مطابق، فرانس میں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے

زیادہ ہوتے، یعنی سو لڑکیوں کے مقابل ایک سو پانچ لڑکے پیدا ہوتے کے باوجود،

عورتوں کی تعداد سترہ لاکھ پینسٹھ ہزار نفر مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کا

سبب یہ بتایا گیا کہ خواتین مردوں سے زیادہ بیماریوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔"

رسالہ سخن، جلد ۶، شمارہ ۱۱ میں ایک مقالہ چھپا ہے —

"زن در سیاست و اجتماع" یہ مضمون، یونیسکو کے با تصویر ماہنامے کے ایک مقالے

کا ترجمہ ہے، ڈاکٹر ذہرا خانم ریٹے "اشلی مونٹاک" سے نقل کیا ہے:

"عملی نقطہ نظر سے عورت کی فطرت مرد کی فطرت پر فوقیت رکھتی ہے۔

X کروموزوم (CHROMOSOME) جنس مادہ میں، کروموزوم ۲۲ جنس ز

سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اسی وجہ سے عورتوں کی عمر مردوں سے زیادہ

ہوتی ہے۔ خواتین کی اوسط عمر مردوں سے زیادہ ہے، عورت عام طور

پر مرد سے زیادہ تندرست ہوتی ہے، بہت سی بیماریاں وہ مردوں سے

زیادہ مقابلہ کر کے جھیل جاتی ہے۔ علاج کا اثر بھی جلدی قبول کرتی ہے۔

عورت ایک گونگی اور مرد پانچ گونگے، رنگوں کی ایک نابینا عورت کے

مقابلے، رنگوں کے سولہ اندھے مرد، دیکھے گئے ہیں۔ لزف الدم

"HAEMORRHAGE"، میمرج کی تکلیف، تقریباً مردوں کو ہی

ہوتی ہے۔ حادثات سے مقابلہ کرنے میں عورت زیادہ مضبوط ہے۔ آخری جنگ عظیم میں ہر جگہ دیکھا گیا ہے کہ ایک جیسے حالات میں، مرد سے بہتر عورتوں نے مقابلہ کیا ہے۔ محاصرہ۔ قید۔ قیدیوں کے ٹیمپ میں مردوں سے زیادہ۔۔۔۔۔ قریب قریب ہر ملک میں مردوں کی خودکشی عورتوں سے تنگنی ہے۔

.....

”زن جنس برتر“ میں، ایشیائی مونتاز کا نظریہ اس سے زیادہ واضح ہوا ہے۔ جناب مسام الدین امامی کا ترجمہ شمارہ ۱۷، رسالہ ”زن روز“ میں چھپ چکا ہے۔ بیماریوں کا زیادہ دلیری سے مقابلہ کرنے کی نسوانی قوت کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن مرد قوت حاصل کر کے عورت سے انتقام لے۔ اور اسے خطرناک اور بھاری کاموں میں لگا دے جس سے وہ موت سے دوچار ہو، خصوصاً اسے میدان جنگ میں لے جا کر اس کے تن نازنین کو گولیوں کا نشانہ بنوا دے یوں اس کو ان کاموں کا مزہ چکھائے۔ اس کے بعد بھی بیماریوں سے مقابلے کی قوت مدافعت کی وجہ سے جنس زن و مرد کا توازن محفوظ نہ رہے گا۔

یہ سب باتیں، پہلی تمہید پہلے مقدمے سے متعلق تھیں، یعنی شادی کے قابل عورتوں کی نسبت مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ واقعاً، یہ بات حقیقت رکھتی ہے، اور اس کی علت بھی واضح ہو گئی۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ علت یا اسباب آغاز تاریخ بشر سے موجود تھے اور آج بھی ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

رہی ہمید کی دوسری بات۔ یعنی، شادی کے قابل عورتوں کی فراوانی

اور شادی کے قابل مردوں کی کمی سے طبقہ خواتین کا ایک ”حق“ پیدا ہوتا ہے۔ یہ حق شادی شدہ عورت و مرد کے ذمے ہے:

انسانی حقوق میں عائلی زندگی کے فطری و حقیقی حق ہونے میں تو کوئی جاہل حرفہ زن نہیں ہے۔ زن و مرد میں سے ہر ایک کا عائلی زندگی بسر کرنا، ایک حق ہے۔ مرد بے تو بیوی، عورت بے شوہر و اولاد سے بہرہ ور ہونا ایسا ہی حق ہے جیسے مکان، تعلیم و علاج و معالجہ، امن و آزادی کے حقوق ہیں۔

سماج کو اس معاملے کی رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان حقوق کو فریم کرے۔

ہمارے نزدیک ”منشور حقوق انسانی“ میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ”حق شادی“ پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ حق آزادی حق امن مؤثر قومی عدالتوں سے رجوع کا حق، حق قومیت، حق ترک قومیت، ہر مذہب و قوم سے شادی کرنے کا حق، مالکیت کا حق، اتحادی ادارے بنانے کا حق، سکون و راحت کا حق، تعلیم و پرورش کے حق، تو یاد رکھے ہیں۔ لیکن ”عائلی زندگی کے حق کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے۔ یعنی خاندانی مرکزیت بنانے کا حق اور اس کے قانون بات ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ حق عورت کی بہت بہت اہمیت رکھتا ہے، عورت کو مرد سے زیادہ گھریلو مرکزیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقالہ نمبر ۲ میں کہہ چکا ہوں، شادی، مرد کے لیے مادی لحاظ سے اور عورت کے واسطے جذباتی و نفسیاتی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مرد اگر گھر کو چھوڑ دے تو عیاشی و بار بازی کے ذریعہ آدھے ضروریات پورے کر سکتا ہے۔ مگر خاندان اور گھر کی اہمیت عورت کے لیے ان باتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ عورت اگر عائلی فضا کو بیٹھے تو عیاشی و بار بازی سے اپنے مادی و نفسیاتی ضروریات سے تھوڑا بہت بھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔

عائلی زندگی کے حق کا مطلب مرد کے نزدیک ایک فطری خواہش کی آسودگی، ایک ہمسر، شریک زندگی اور یک دل ساتھی اور قانونی اولاد رکھنے کا حق ہے۔ لیکن عائلی

زندگی رکھنے کا مطلب عورت کی اصطلاح میں نام ہے، مذکورہ باتوں کے علاوہ ایک حامی و سرپرست رکھنے کا۔ جذبات کی حمایت رکھنے کا۔
ان دو تہیہوں (مقدموں) کے اثبات کے بعد:

۱۔ عورتوں کا عدویٰ تناسب مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

۲۔ عائلی زندگی انسانی فطرت کا ایک حق ہے۔

نتیجہ۔ اگر ایک بیوی ہی کو شادی کی قانونی صورت دی جائے تو عورتوں کا بہت بڑا گروہ اپنے انسانی فطری حق "عائلی زندگی" سے محروم رہے گا۔ خاص شرائط کے ساتھ، تعدد ازواج کا قانون ہی اس فطری حق کا احیا کر سکتا ہے۔

روشن فکرمسلمان خواتین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقیقی شخصیت کو پہچانیں۔ اور خواتین کے برحق حقوق، اخلاق، نسل بشر کی حمایت کے عنوان سے ان کے رب کے اہم فطری حق کے بارے میں، حقوق انسانی کے گیشن کو "یو این او" میں قرار داد پیش کریں، جس میں ان منطقی شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کے جواز پر حقوق بشری میں سے ایک حق تسلیم کرنے پر زور دیا جائے، مطالبہ کریں کہ وہ اس تجویز کو قانونی طور پر تسلیم کرے۔ یہ خدمت خواتین اور اخلاق کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فقط یہ بہانہ کہ مشرقی فارموسے کی اہل مغرب ہیروی کریں، کوئی گناہ کی بات تو نہیں ہے۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں "برٹریڈرسل" کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ موصوف اس نکتے کو دھیان میں رکھتے تھے کہ اگر

سل کا نظریہ

فقط "ایک بیوی" کے طریق کار کو قانونی حیثیت دی جائے، تو اس سے عورتوں کا ایک بڑا گروہ قانونی شادی سے محروم رہے گا۔ لہذا انھوں نے راہ حل نکالی، مگر کیا راہ حل؟ بڑی سادہ تجویز کہ اس قسم کی عورتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ فرزند سے محروم نہ رہیں، وہ مردوں کا سکار کر کے بے پدراولاد کو جنم دیں، اور حاملہ ہونے یا گود میں بچہ ہونے

کی حالت میں ان کو مالی امداد کی جو ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر ایک باپ جو نفقہ دیتا ہے، حکومت اس کی ذمہ دار بنے اور اس زاویے سے باپ کی جانشین ہو کر ایسی عورتوں کی امداد کرے۔

اس کے بعد رسل نے کہا :

”آج کے انگلستان میں مردوں سے دو بیس لاکھ عورتیں زائد ہیں۔

رسم ”ایک زوجہ“ کی وجہ سے یہ عورتیں ہمیشہ بے اولاد رہیں گی۔ یہ ان کی بڑی

محرومی ہے۔“

پھر لکھتا ہے :

مکمل شادی ایک بیوی پر مبنی ہے مگر یہ قانون اس مفروضے پر ہے کہ زن و

مرد میں تقریباً یکسانیت ہے۔ مگر جہاں برابری نہ ہو وہاں بڑی زیادتی

(قساوت) ہوگی کہ یہ یا غنی کھپے کے مطابق دوسرے افراد مجبور رہیں۔ پھر

اگر ہم قوم میں افرادی کثرت کی ضرورت بھی محسوس کریں تو یہ طریق کار خصوصی قساوت

و سخت دلی سے بڑھ کر عام صورت میں جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔“

یہ تھا بیسویں صدی کے ایک فلسفی کا حال جو اس نے ایک معاشرتی مسئلے کی الجھن کے لئے

پیش کیا، اور وہ تھا اس مشکل کا حل جو اسلام نے تجویز کیا۔ اسلام کہتا ہے — کہ یہ

مشکل یوں حل کر دو کہ ایک شخص جس میں مالی، اخلاقی اور جسمانی صلاحیتیں ہوں اور وہ ایک

بیوی سے زیادہ بیویوں کی کفالت کر سکتا ہو تو وہ دوسری قانونی و شرعی بیوی قبول

کرے، مگر پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روانہ نہ رکھے۔ پہلی بیوی بھی

ایک معاشرتی ذمہ دار سمجھ کر اپنے حق اور اپنی فداکاری کے ذریعے شرکت کو تسلیم کرے

گویا ایک خاص قسم کا شوشلزم جو سوشلزم کے تمام اقسام میں سب سے اہم ہے، قبول کرے۔

مگر بیسویں صدی کا یہ فلسفی کہتا ہے : محروم عورتیں دوسروں کے شوہروں پر ڈاکہ ماریں

انہیں چرائیں، بے پردہ پنچے جنیں اور حکومت سے کفالت حاصل کریں۔ بیسویں صدی کے اس فیلسوف کی نظر میں عورت کی ضرورت خانہ داری صرف تین زاویوں سے ہے۔

- ۱۔ جنسی زاویہ جو عیاری، دل ربائی کے ذریعے عورت حاصل کر سکتی ہے۔
- ۲۔ اولاد کے زاویہ سے بھی چوری، جس سے بچہ ہاتھ آئے۔
- ۳۔ اقتصادی زاویہ سے، دولت ملنا چاہئے۔ اس فیلسوف کی نظر میں جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ شوگر، مخلصانہ جذبات میں، اور اس کی یہ ضرورت کہ ایک مرد (شوگر) اسے اپنی حمایت کے دامن میں لے، اسے فقط منہسی نظر سے نہ دیکھے۔ اس فلسفی کے نزدیک ایک بات اور غیر اہم ہے اور وہ ہے نومولود کی حالت زار، یہ بچہ اس نے جنم لیا۔ یہ بچہ اسے پریشان کرتا ہے۔ ہرزچہ، بلکہ ہران ن چاہتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے حوالے سے جانا پہچانا جائے، ہرزچہ چاہتا ہے کہ ماں باپ کی سچی محبت اور مامتا اپنے تجربہ گواہ ہے کہ جس ماں کا بچہ کوئی معین باپ نہ رکھتا ہو، اس ماں کے دل میں اس بچے کی محبت کا چشمہ نہیں پھوٹتا جسے بچے کے باپ کی توجہ نصیب نہ ہو۔ وہ ایسے بچے سے بہت کم پیار کرتی ہے۔ محبت کی یہ کمی کہاں سے پوری کی جائے؟ کیا حکومت اس کمی کو چھڑا کر سکتی ہے؟

غالب رسل صاحب کو افسوس ہے، اگر ان کی تجویز سے قانونی شکل حاصل نہ کی جاتی تو بہت سی بے شوہر عورتیں بے اولاد رہ جائیں گی۔ لیکن خود رسل صاحب بہتر جانتے ہیں کہ انگلستان کی بے شوہر عورتیں ایسے قانون کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں انہوں نے عملی طور پر خود ہی تنہائی، بے شوہری و بے اولادی کا عمل نکال لیا ہے۔

”دس انگریزوں میں ایک....“

اخبار اطلاعات، تہران، ۲۵، ۹، ۳۸ (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں ایک سرفخی تھی۔

۔ ”دس انگریزوں میں سے ایک حرام زادہ ہے“ ۔ نیچے تھا ۔ ”لندن، رائٹر،
۱۶ دسمبر، فرسیمی نیوز ایجنسی نے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر زیڈ۔سے۔اسکاٹ، میڈیکل
آفیسر، لندن نے اپنی تیار کردہ رپورٹ میں خاطر نشان کیا ہے کہ گزشتہ سال لندن میں
جونپے پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ہر دس میں سے ایک ناجائز ہے۔ ڈاکٹر اسکاٹ نے
زور دیکر کہا ہے کہ ناجائز بچوں کی شرح پیدائش مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۱۵۹ میں،
۳۲۸۲۸ سے بڑھ کر ایک سال میں ۵۲۴۲۲ تک پہنچ گئی ہے۔“

انگریز قوم نے جناب۔سل کی تجویز پر قانون بننے سے پہلے اپنا مسئلہ حل کر لیا ہے
تعدد ازواج ممنوع اور
ہم جنس بازی کی اجازت
حکومت انگلستان نے جناب۔سل کی رائے کے بالکل
برعکس کام کیا اور بجائے بے ثور عورتوں
کی مشکل حل کرنے کے، اس کے مرد حریفوں
کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا۔ اسی طرح انھیں پہلے سے زیادہ محروم بنانے کی سعی کی حکومت
نے ”ہم جنس بازی“ کا قانون منظور کر لیا، ۱۴/۴/۶۶ شمسی مطابق ۵/۴/۱۹۶۶ء
کے اطلاعات نے خبر دی۔

”لندن، برطانیہ کے دارالعوام نے آٹھ گھنٹے کی طویل بحث کے بعد ”ہم جنس بازی
کے مسودہ قانون کی منظوری دیکر، قرارداد کا متن دارالامرا کو بھیج دیا۔“

۲۴/۴/۶۶ ہجری شمسی مطابق ۱۵/۴/۱۹۶۶ء یعنی دس روز بعد اطلاع دی۔
ہاؤس آف لارڈز نے اپنی دوسری نشست میں ”ہم جنس بازی“ کے مسودہ قانون
کی منظوری دیدی۔ اس مسودہ کو پہلے، انگلستان کا دارالعوام منظور کر چکا تھا۔ اس کے
بعد یہ قانون ملکہ الزبتھ کے پاس جائے گا اور وہ بہت جلد دستخط کریں گی۔
موجودہ صورت حال یہ ہے کہ انگلستان میں تعدد ازواج ممنوع ہے لیکن۔

”ہم جنس بازی“ صحیح ہے۔

ان عوام کی نظر میں اگر ایک مرد اپنی بیوی کی "سوت" عورت سے آئے تو قاتلونا درست نہیں ہے، اس نے غیر ان کی کام کیا۔ لیکن اگر وہی نوعیت عورت کے بجائے لڑکے سے بدل جائے تو شرفیاء، انسانی، اور بیسویں صدی کے مطابق کام ہوگا۔ دوسری لفظوں میں انگلستان کے اربابِ حل و عقد کے نزدیک اگر شوہر کے گھر میں اس کی بیوی کا شرکیہ خانہ ڈاڑھی موچھ والا ہو تو "چند ازواجی" (چند ہسری) میں کوئی عیب نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یورپ نے جنسی اور گھریلو جھگڑے حل کر لئے، اب ہیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ تو انھوں نے یہ مسائل اس طرح حل کئے ہیں جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ باتیں میرے لئے باعثِ تعجب نہیں ہیں۔

تعجب و افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے عوام اپنی منطق اپنے ہاتھ سے دبائیے؟ ہمارے جوان، اور تعلیم یافتہ لوگ واقعات کے تجزیہ و تحلیل سے کیونکر ہاتھ دھو بیٹھے؟ انھوں نے اپنی شخصیت کیوں گم کر دی ہے؟ ہاتھ کے قیمتی پتھر کو دنیا کی اس طرف کے لوگوں کے اخروٹ کہتے ہیں کیوں پھینک دیتے ہیں؟ کیوں بات مان لیتے ہیں۔ اور اگر غیر کے ہاتھ میں اخروٹ ہو اور ان سے کہا جائے کہ یہ قیمتی جوہر تو اے کیوں مان لیتے ہیں؟

ان عوام کی نظر میں اگر ایک مرد اپنی بیوی کی "سوت" عورت سے آئے تو قاتلونا درست نہیں ہے، اس نے غیرانسانی کام کیا۔ لیکن اگر وہی نوعیت عورت کے بجائے لڑکے سے بدلہ لئے تو شریفانہ، انسانی، اور بیسویں صدی کے مطابق کام ہوگا۔ دوسری لفظوں میں انگلستان کے اربابِ حل و عقد کے نزدیک اگر شوہر کے گھر میں اس کی بیوی کا شرکیہ خانہ ڈاڑھی موچھے والا ہو تو "چند ازواجی" (چند ہسری) میں کوئی عیب نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یورپ نے جنسی اور گھریلو جھگڑے حل کر لئے، اب ہیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ تو انھوں نے یہ مسائل اس طرح حل کئے ہیں جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ باتیں میرے لئے باعثِ تعجب نہیں ہیں۔

"تعجب و افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے عوام اپنی منطق اپنے ہاتھ سے دبھیٹے؟ ہمارے جوان، اور تعلیم یافتہ لوگ واقعات کے تجزیہ و تحلیل سے کیونکر ہاتھ دھو بیٹھے؟ انھوں نے اپنی شخصیت کیوں گم کر دی ہے؟ ہاتھ کے قیمتی پتھر کو دنیا کی اس طرف کے لوگوں کے اخروٹ کہتے سے کیوں پھینک دیتے ہیں؟ کیوں بات مان لیتے ہیں۔ اور اگر غیر کے ہاتھ میں اخروٹ ہو اور ان سے کہا جائے کہ یہ قیمتی جوہر تو اے کیوں مان لیتے ہیں؟

کیا چند ازواجی مرد کی فطرت ہے؟

یقیناً آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ یورپ کے ماہرینِ نفسیات و فلاسفہ معاشرت کا نظریہ یہ ہے کہ مرد چند ازواجی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے اور ایک ازواجی خلاف فطرت انسانی، ویل ڈیورانت "لذات فلسفہ" میں صفحہ ۹۱ پر اس دور کی جنسی اخلاقی آوارگی پر تفصیلی بحث کے بعد لکھتا ہے :

"بلاشبہ ان میں سے بہت سی باتیں اصلاح ناپذیر ہیں اسی کا سبب "تنوع پند" دہر روز نئی چیز، اور فطرت ایک بیوی پر اکتفا نہیں کرتی۔"
آگے چل کر لکھتا ہے :

"مرد، فطرت میں ذاتی طور پر چند ازواجی واقع ہوا ہے۔ ایک بیوی پر اسے پابند کرنے والی مضبوط چیز ہے، اخلاقی پابندیاں، سخت محنت اور غربت کا معین معیار اور پہلی بیوی کی سخت نگہداشت۔"
"زن روز" کے شمارہ ۱۱۲ میں ایک مضمون تھا :
"کیا مرد فطرتاً خیانت کا رہے؟"

اس میں درج ہے کہ ایک جرمن پروفیسر آئیمید (SCHMIDT) کہتا ہے :
"..... پوری تاریخ میں مرد ہمیشہ خیانت کا رہا ہے اور عورت خیانت میں اس کے پیچھے پیچھے، قرون وسطیٰ میں بھی مسلسل ایسے شواہد ملتے ہیں کہ نوے فی صد جوانوں نے بار بار رفیقہ حیات بدلی ہے۔ اور پچاس فی صد مردوں

نے اپنی بیویوں سے خیانت کی ہے۔ رابرٹ کینسی (DR. ROBERT KINSEY) شہور امریکی محقق تھا، اس نے ایک رپورٹ جو کینسی رپورٹ سے شہرت پائی، میں لکھا ہے: امریکہ کے زن و مرد نے بے وفائی و خیانت میں تمام قوموں کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ رکھے ہیں۔ کینسی اپنی رپورٹ کے دوسرے حصے میں لکھتا ہے: عورت، مرد کے برخلاف، عشق و لذت میں نوع جوئی (ہر روز نئی یاری) سے میزبان ہے، اسی وجہ سے بعض اوقات مرد کے رویے سے نہیں جتنی، لیکن مرد تنوع کو ایک قسم کی مہم سمجھتا ہے اور آسانی سے راستہ سے کاٹ جاتا ہے اس کی نظر میں ہم ترین چیز ہے جسمانی لذت اسے جذباتی لذت دلچسپی، نہ روحانی سے روحانی و جذباتی باتوں کا نگہ اس وقت لگتا ہے جب تک جسمانی چسکا نہیں لیتا ایک ٹھونڈی ٹھنڈی نے مجھ سے کہا: مرد کا پالی گیمسٹ (POLYGAMIST) ہونا، اور اس کی تنوع پسندی و تعدد خواہی اور عورت مونو گیمسٹ (MONOGAMIST) ہونا، یعنی انحصار طلبی اور ایک پر اکتفا کرنے کا جذبہ صاف اور سامنے کی بات ہے۔ کیونکہ مرد میں ملینوں خلیے سperm کے پیدا ہوتے ہیں (SPERMATOZOA) جب کہ عورت میں آمادگی کے وقت تخمدان (رحم) میں صرف ایک تخم (PREGNANT) ہی پیدا ہوتا ہے۔ کینسی کے مفروضے سے قطع نظر، ہم خود اپنی ذات سے پوچھیں، کیا مرد کے لیے وفاداری مشکل ہے؟

فرانسیسی، نری ڈی مونٹھرلان (HENRI DE MONTHERLAN) نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

”مرد کے لیے وفادار ہونا مشکل ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایک عورت ایک مرد کے لئے پیدا ہوئی ہے اور ایک مرد، زندگی اور تمام عورتوں کے لئے۔ مرد اگر اندھیرے میں اڑتا اور اپنی بیوی سے خیانت کرتا ہے تو خود کوئی غلطی نہیں کرتا۔ کوتاہی اس کی خلقت و فطرت کی ہے جس نے اس کے اندر خیانت کو جنم دیا ہے۔“

اس رسالے کے شمارہ نمبر ۱۲۰ میں ایک مضمون ہے۔ ”فرانسیسی عشق اور شادی کا فلسفہ“

اس ذیل میں تحریر ہے :

”فرانسیسی میاں بیویوں نے، آپس میں ”بے وفائی کا مسئلہ“ حل کر لیا، انھوں نے اس بارے میں قاعدہ و قانون، حدود و حدود مان لئے ہیں۔ اگر شوہر اس قانون کی سرحد سے آگے بڑھتا ہے تو اندھیرے کی طرف اس کی پیش قدمی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کیا حوالہ، ایک مرد، دو سال عاکی زندگی بسر کرنے کے بعد وفادار رہ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں رہ سکتا۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے لیکن خواتین کے معاملے میں ایک حد تک فرق ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ اس فرق سے باخبر ہیں۔ فرانس میں اگر کوئی شوہر خیانت کرتا ہے تو اس کی بیوی ناراضگی محسوس نہیں کرتی، غصہ نہیں آتا، وہ اپنے دل کو سمجھاتی ہے۔ اس نے دوسری سے فقہ جسمانی لمس کیا ہے، روح اور جذبات سے نہیں دیے، روح اور جذبات میری ملکیت ہیں“

چند برس پہلے، بیالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر رسل لی (DR. RUSSELL LEE) اس بارے میں نظریہ ”ذاتیہ کیمیا“ میں چھپا تھا اور ایرانی لکھنے والوں نے کچھ عرصے تک اس پر بحث جاری رکھی تھی۔ ڈاکٹر رسل لی کے نزدیک مرد کا ایک عورت پر قانع رہنا، نسل کی خیانت کرنا ہے، فقط مقدار ہی نہیں، کیفیت کے لحاظ سے بھی برا ہے۔ کیونکہ ایک عورت پر اتنا کرنے سے اس کی نسل کمزور ہوتی ہے۔ کئی بیویوں کی وجہ سے نسل قوی اور طاقتور پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں مرد کی فطرت کا یہ تعارف ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے، ان مفکروں کے نظریہ کی پیداوار ان کے معاشرتی ماحول کے سبب ہے۔ مرد کی حقیقت فطرت ایسی نہیں ہے۔ ہم ہرگز مدعی نہیں ہیں کہ عورت و مرد بیالوجی (زیست شناسی) کے زاویے سے مشابہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ہم تو اس کے برعکس یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زیست شناسی اور نفسیات

کے زاویے سے مرد و عورت میں فرق ہے۔ اس اختلاف میں نخیق کا ایک مقصد ہے۔ اس بنا پر زن و مرد کے انسانی حقوق کی یکسانیت کو دونوں کے تمام حقوق کی اکائی قرار دینے کا بہانہ بنا نا غلط ہے۔ ایک شوہر و زوجہ کی رسم میں بھی نفسیاتی اعتبار سے زن و مرد کے نفسیات الگ الگ اور قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ عورت فطرتاً ایک شوہر پسند ہے، ”چند شوہری“ رسم اس کی نفسیات کے خلاف ہے، ایک شوہر سے بیوی کی رنگارنگ منافع کی وابستگی کا ”چند شوہری نظام“ سے کوئی ربط نہیں۔ لیکن مرد ایک بیوی کی رسم سے طبعاً ہم آہنگ نہیں ہے، باین معنی کہ چند ازواجی زندگی اس کے نفسیات سے اختلاف نہیں رکھتی۔ ہم اس لفظ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے کہ مرد کے نفسیات ایک بیوی“ کی رسم سے ہم آہنگ نہیں۔ ہم اس نظریے کے منکر ہیں کہ جو کہا گیا ہے کہ:

”مرد تنوع پسندی کا رجحان اصلاح ناپذیر ہے۔“

ہم اس رائے کے خلاف ہیں کہ:

”مرد کے لئے وفاداری ناممکن ہے۔ اور ایک بیوی ایک شوہر کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور ایک مرد تمام عورتوں کے لئے۔“

ہمارے خیال میں مرد کے اندر خیانت کاری، سماجی ماحول پیدا کرتا ہے، خلقت و فطرت کی دین نہیں ہے۔ مرد کی خیانت کاری کی ذمہ داری خلقت پر نہیں ہے۔ اس جواب وہ سماجی فضا اور ماحول ہے۔ خیانت کاری کے اسباب ماحول پیدا کرتا ہے یہ ماحول عورت کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ اغوا اور اجنبی مرد کو بے راہ کرنے میں ہر قسم کی عیاری استعمال کرے، ایک ہزار ایک نیمزنگ دکھائے اور اسے اپنی راہ پر لائے۔ ”دعوت قانون ازدواج کو ایک بیوی“ میں منحصر و محدود کر کے ہزاروں، لاکھوں، بلکہ بیسیوں شادی کے قابل عورتوں کو ازدواجی زندگی سے محروم کرتا ہے۔ پھر ان کو مرد کے اغوا کرنے کی خاطر سماج میں دھیس دیتا ہے۔

مغربی آداب کے عام ہونے سے پہلے اسلامی مشرقی علاقوں میں نوے فی صد ایک بیوی "ہی" کا رواج تھا۔ نہ ایک شرعی بیوی کے علاوہ ان کے گھر میں کوئی اور ہوتی نہ یا بیچ محبوبہ سے عشق بازی ہوتی تھی، خصوصی روابط زن و شوہر اپنے تمام مفہوم و معنی کے ساتھ اکثر و عمومی طور پر سماں خاندانوں میں حکمران تھی۔

چند ازواجی نظام یک زوجہ نظام کی پائنداری کا سبب

بہاری بات پر آپ کو تعجب ہوگا، اسلامی

مشرق میں "چند ازواجی نظام" ہی "ایک زوجہ" رسم کی قوت کا باعث و سبب ہوا۔ ہاں مقدربیویا رکھنے کی اجازت بہت بڑا سبب ہے کہ "ایک زوجہ" کی رسم پائدار ہو جائے، یعنی یعنی جن حالات میں تعدد ازواج کی ضرورت ہوتی ہے۔ شادی کے قابل عورتیں شادی کے قابل مردوں سے زیادہ ہوں۔ اگر عورتوں کی اس تعداد کو قانونی تحفظ نہ دیا جائے، اور شرعاً پوری کرنے والوں اخلاقی، مالی اور جسمانی صلاحیت رکھنے والوں کو کئی بیویاں رکھنے کا حق نہ دیا جائے تو یاری و معشوقہ بازی قدم بڑھا کر "ایک بیوی" کے نظام کو جڑوں سے خشک کر دے۔

اسلامی مشرق میں، ایک طرف تعدد ازواج کی اجازت اور دوسری طرف ہیجان انگیز اور انمواد کے محرکات موجود نہ تھے، لہذا ایک ازدواجی نظام اکثر خاندانوں پر حکومت کرتا تھا اور عشق بازی کا کاروبار اتنا نہ تھا کہ اس کے لیے خاص فلسفہ وضع کیا جائے اور کہا جائے کہ مرد کی تخیلی کئی بیویوں کا تقاضا کرتی ہے اور ایک بیوی پر اکتفا کرنا مرد کے لیے کمالات و ناممکناتِ عالم سی ہے۔

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ ان دانشوروں کی رائے کے مطابق جو مرد کے لیے چند ازواج کو مطابق فطرت بتاتے ہیں اور قانونوں معاشرت کے زوایے سے برا سمجھتے ہیں، مرد کی ذمہ داریاں دو قانونوں کے مابین کیا ہے؟

ان حضرات کے دستانِ فکر میں مرد کی ذمہ داری واضح ہے۔ قانوناً ایک بیوی

علاؤ چند بیویاں۔ ایک بیوی تو قانونی و شرعی ہونا چاہئے۔ اس کے بعد یا رومجوبہ و معشوقہ جنسی پہلے بنے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان حضرات کی رائے میں یا رہنمائی، معشوقہ ساتھ کھینچے۔ کا حق مرد کو فطرت سے دیا یا ختی سلیم شدہ ہے اور قانونی ہے۔ ساری زندگی ایک بیوی کے ساتھ گذر کرنا ایک قسم کی نائی ہے۔

بحث کی اصل صورت میرا گمان ہے کہ اب وہ لکھ آگیا ہے، جب ہمارے قارئین کرام توجہ کریں کہ انسان کے لیے "چند ازدواجی"

کا جو مسئلہ زیر بحث تھا اور اب بھی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک بیوی کی رسم بہتر ہے یا چند بیویوں کی؟

ایک بیوی کی رسم کے اچھے ہونے میں تو کوئی تردید ہے ہی نہیں۔ ایک بیوی کے نظام کا مطلب ہے خاندانی لگاؤ، یعنی میاں بیوی کے جسم و جان ایک ہوں، ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی کی جان وحدت و یگانگت ہے۔ اور یہ بات انفرادی صورت ہی میں کامل و مکمل طور پر جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ دراصل آدم زاد اس دور ہے پر نہیں ہے کہ ایک بیوی کا نظام اختیار کرے یا کئی بیویوں کا مسئلہ تو یہ آن پڑ ہے کہ سماجی ضرورتوں کے پیش نظر، خصوصاً شادی کے قابل لڑکیوں کی فراوانی ان مردوں سے جو شادی کے قابل ہوں، ایک بیوی کا نظام ملے طور پر خطرے میں ہے۔ "فقط ایک بیوی" کا نظام تمام خاندانوں میں نافذ ہو، ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، دو میں سے ایک راستہ ہے۔

یا تعدد ازواج کا قانون

یا معشوقہ بازی کا رواج

یوں کہیے کہ۔ یا۔ چند شادی شدہ افراد کئی بیویاں رکھیں، جن کی تعداد تقریباً

دس فی صد سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سے بے شوہر خواتین گھر بار بنا سکیں گی، زندگی کا

کو کوئی سرسیر ہو سکے گا۔ یا پھر معشوقہ بازی کی راہیں کھول دی جائیں۔ چونکہ دوسری

صورت میں ہر معشوقہ کئی مردوں سے تعلق پیدا کر لے گی لہذا تقریباً بیوی والوں کی

کثرتِ عقد چند بیویوں والے ہو جائیں گے۔

"کئی بیویوں کے جواز و عدم جواز کی بات یوں پیدا ہوتی ہے اور یہی صحیح اندازِ مسئلہ ہے مگر یورپی پروپیگنڈا کرتے والے حقیقتاً تسکرا نہیں کرنا چاہتے یہ لوگ دراصل معشوقہ بازی و یار بازی کے حامی ہیں، قانونی و شرعی بیوی کو بارہ دوش اور راستے کی رکاوٹ جانتے ہیں۔ یہ تو ایک بھی زائد مانگتے ہیں، دو، تین اور چار بیویوں کی تو بات ہی چھوڑئے۔ اصل لذت تو پابند ازواج سے آزادی میں سمجھتے ہیں۔ مگر بات یوں کرتے ہیں کہ جیسے وہ "ایک بیوی کے نظام کے حامی ہیں۔ وہ بڑی معصومیت سے کہتے ہیں، ہم تو اس کے طرفدار ہیں کہ ایک شوہر اور ایک بیوی ہو، دونوں وفادار ہوں۔ کئی ہمسریوں کی ہم نہیں مانتے۔

بیسویں صدی کے مرد کی نیرنگیاں

بیسویں صدی کا مرد عائلی حقوق سے متعلق بے شمار مسائل میں الجھا

جوتی مارنا چاہتا ہے۔ وہ مساوات و آزادی کے خوبصورت ناموں سے عورت کو بہلا کر اس کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو کم کر کے، بے حساب انداز سے اپنے کام بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ مگر تعدد ازواج کے سوا بہت مسائل میں کامیاب ہو سکا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں کبھی کبھی ایرانی مصنفین اور مضمون نگاروں کے یہاں ایسی چیزیں دیکھتا ہوں تو ایک شک سے دوچار ہو جاتا ہوں کہ یہ لوگ سادہ دل میں یا گرفتار غفلت؟

"تعدد ازواج" کے بارے میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آج کل ترقی یافتہ ملکوں میں باہمی ذمہ داریوں کی بنیاد پر میاں بیوی کے تعلقات استوار ہوتے ہیں، لہذا تعدد ازواج کی قانونی حیثیت (دائمی نکاح) ہونا منقطع عورت کی طرف سے بھی ویسی ہی مشکل جیسے شوہر سے چاہیں کہ رقیبوں کو اپنی عائلی زندگی

میں برداشت کرے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات ذہن میں واقعات صورت معاملہ یہی ہے یا جو تالان پہن رہے ہیں؟ (جسکی میں بات کچھ سے کچھ کہہ رہے ہیں) کیا، واقعات ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ ”تعدد ازواج“ معاشرتی مشکل کی وجہ سے ہے۔ اس مشکل کی ذمہ داری تمام شادی شدہ مرد و زن پر ایک بوجھ کی صورت میں ہے اور اس کا سبب اچھا حل ”تعدد ازواج“ ہی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ آنکھیں بند کر کے نعرے لگانا ”ایک زوجہ“ نظام زندہ باد۔ ”کئی ازواجی نظام مردانہ بیماری کا علاج نہیں ہے؟

کیا انھیں نہیں معلوم کہ تعدد ازواج، عورت کے حقوق کا ایک حصہ ہے، مرد کا نہیں زن و مرد کے تقابلی حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔؟
مصلحہ خیر بات ہے، کہتے ہیں:

”تعدد زوجات“ عورت کی طرف سے اتنا ہی مشکل کام ہے، عورت بھی جانتی ہے کہ ازدواجی زندگی کے دوران مرد بھی اپنے رقبوں کو برداشت کرے۔ اس سے قطع نظر کہ دونوں باتوں کا قیاس غلط ہے۔ شاید، وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ آج کی دنیا میں کچھ حضرات بری چیز کو آنکھ بند قبول کر لیتے ہیں اور ماجرے کی صحت میں کوئی شک و تردد صحیح نہیں سمجھتے۔ آج کی دنیا مرد سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی بیوی کے عشق کا احترام کرے اور تعلقاً زن و شوہر کے ہوتے ہوئے اپنے رقبوں کو سمجھے۔ آج کی دنیا ”نافاں برداشت باتوں“ کو حسد، تعصب اور فینٹزم جیسے ناموں سے ٹھکراتی ہے۔ کاش ہمارے جوانوں کو یورپ اس کے ضمن میں ہونے والے واقعات کی تھوڑی سی بھی سگاہی ہو جاتی۔

۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

”تعدد ازواج مرد کی فطری مانگ نہیں، یہ سماج سے ابھرنے والی ایک ضرورت ہے۔

کر کے نظریے سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی سماج میں شوہروں کی خوشنمذ
نواہین کی نسبت ان مردوں سے زیادہ نہ ہو جو ہمسروہ نیتہ حیات کے متلاشی ہوں تو "کئی بیویوں"
کا دستور خود بخود یا تو بالکل ختم ہو جائے گا یا کمی آجائے گی۔ اور اگر ایسے حالات میں رکھ فرض
کیجئے، عورتیں عددی کثرت کی وجہ سے معاشرے سے خانہ آبادی چاہتی ہوں قانون تعدد
ازواج ختم کر دیا جائے تو فقط یہ اقدام نہ کافی ہوگا نہ صحیح ہوگا۔ اس کے لیے کچھ اور اقدامات
ضروری ہوں گے :

- ۱۔ عدالت جماعتی، ہر شخص کو روزگار مہیا کیا جائے، ہر شخص کی اتنی آمدنی رکھی جائے
کہ جو شخص بھی شادی کی ضرورت محسوس کرے وہ گھریلو مرکزی زندگی حاصل کر سکے۔
- ۲۔ عورتوں کو ارادہ و انتخاب کی آزادی دی جائے کہ وہ شوہر خود منتخب کر سکے۔
باپ یا بھائی یا کسی اور رشتے دار کو حق نہ ہو کہ وہ شادی شدہ، بیوی والے دولت مند
مرد سے اس عورت کو بیاہ دے، ظاہر ہے کہ عورت آزاد و خود مختار ہو، اور اپنے لئے ایک
مجزد شوہر کو تلاش کر سکے تو وہ ہرگز بے مرد کا انتخاب نہیں کرے گی جس کے گھر میں پہلے
سے بیوی موجود ہو، اور یہ سوت بن کر اس کے سر پر سوار ہو۔ عورت کے سر پرستوں کا
طریقہ ہے کہ پیسے کے لالچ میں، لڑکی یا بہن کو بیوی والے مردوں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے ہیں۔
- ۳۔ بیجان آفرین، اغوا اور خانہ خرابی کی تحریکیں اس فراوانی نہ ہونے دی جائیں جن کے
دباؤ سے شوہر در بیویاں، شوہر کے گھر سے نکل کر اجنبی کے گھر نہ جانے پائیں۔ بن بیاہی
بے شوہر عورتوں کا تو کمنا ہی کیا ہے۔

معاشرہ اگر واقعاً اصلاح احوال چاہتا ہے اور "ایک بیوی" ہی کا نظام پسند کرتا
ہے تو مذکورہ سینوں اسباب و عوامل کو بروئے کار لے۔ ورنہ تعدد ازواج کے
دستور پر پابندی لگانے سے صرف عیاشی کی راہیں ہی کھل سکیں گی اور کوئی فائدہ
نہ ہوگا۔

بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحران

جس صورت میں مردوں کی طلب گار عورتوں کی فراوانی ہو اور ضرورت مندان ازدواج مرد کم ہوں تو اس حالت میں تعدد ازدواج پر پابندی لگانا

انسانیت سے خیانت ہے۔ کیونکہ اس سے فقط حقوق خواتین ہی پامال نہیں ہوتے۔ اگر چند عورتوں کا حق تلف ہوتا تو شاید اسے برداشت کر لیجاتا مسئلہ تو وہ بحران ہے جو اس اقدام کے بعد معاشرے میں سر اٹھائے گا اور وہ بحران ہر چیز سے زیادہ خطرناک ہوگا جبکہ بان بچوں کا گھر ہر مرکز سے زیادہ متفقد س ہے۔

چونکہ جو اپنے فطری حق سے محروم ہوتا ہے وہ ایک موجود زندہ ہے۔ ایک موجود زندہ اپنے تمام علامات کے ساتھ جو محرومی دنا کا می ہیں رد عمل دکھاتا ہے کیونکہ وہ ان ہے۔ روحانی و نفسیاتی الجھنوں کی ناکامیوں کے تمام حالات میں عورت ہے۔ زمانہ نیم گھنچوں کے ساتھ حوا کی بیٹی ہے، ”آدم فربہ“ کی مکمل دست رس کے ساتھ۔

وہ جو اور گیموں نہیں ہے کہ استعمال سے بچے تو سمندر میں پھینک دیں، یا ”قحط سالی“ کے ڈر سے گودام میں رکھ دیں۔ وہ گھر اور کمرہ نہیں کہ ضرورت نہ ہو تو قفل ڈال دیں ہاں، وہ ایک زندہ موجود ہے، ایک انسان ہے، ایک عورت ہے، وہ اپنی حیثیت انگیز قوت کا مظاہرہ کرے گی اور معاشرے کے چھتے چھڑا دے گی۔ وہ بر ملا کہے گی:

شخص درست گویم نمی توانم دید
کرمی خورد حریفان و من نظاره کنم

ز غالب نے اس کا مفہوم یوں ادا کیا ہے۔

غیر میں محفل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

”ہی“ ”نمی“ ”توانم دید“ میں نہیں دیکھ سکتی، بہت کام کرے گی، گھر اور خاندان ویران کرے گی

دشمنیاں اور کہنے پیرا ہوں گے، وہ دن ان کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا جنسانی جنت اور قبی گرجیں آپس میں متحد ہو جائیں۔

گھرے محروم خواتین، اس مرد کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گی جس کے قدم نہیں بھی اتنی جلدی نہیں پھسلنے جتنی جلدی یہاں لڑکھڑاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب پھسلنے زیادہ ہوتی ہے تو ہاتھی پھسل جاتے ہیں (چوگلں بسیار شد پیلان بلغزند) افسوس تو یہ ہے کہ یہ پھسلنے اگر تھوڑی بھی ہو تو اس ہاتھی کے پھسلنے کے لیے کافی ہے۔

بھرا کیا بات یہیں ختم ہو جائے گی؟ نہیں۔ گھر بار والیوں کی باری اس کے بعد آئی گی، وہ بیویاں جو اپنے شوہروں کو خیانت کرتے دیکھیں گی وہ انتقام و خیانت کے لیے آگے آئیں گی، وہ بھی شوہر کی خیانت کا پیچھا کریں گی۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا۔؟
اس کا آخری نتیجہ ”کنیسی کی رپورٹ“ میں درج ہے، اور وہ بھی ایک محلے

میں:

”امریکہ کے مرد و عورت، فساد و کج روی و خیانت میں اقوام عام کے ہاتھ پست پر باندھ چکے ہیں۔“

ملاحظہ فرمائیے کہ فقط مرد کی کج روی اور فساد ہی پر قصہ تمام نہیں ہوتا، اس آگ کا شعلہ خاندان نشین، بال بچوں والیوں کے دامن تک پہنچتا ہے۔

عورتوں کی فراوانی میں مختلف رد عمل - ان فی زندگی میں عورتوں کی عددی افزائش ہمیشہ

رہی ہے، اس کی وجہ سے اصل چیرا اس کے رد عمل ہیں، جو معاشرے میں کبھی ایک جیسے نہیں رہے جن قوموں کے مزاج تقویٰ اور پاک دامنی سب وابستہ رہے وہ بڑے بڑے آسمانی ادیان کے وسیلے سے اس مشکل کو تعدد ازواج کے طور پر حل کرتی رہیں جن قوموں کا مزاج خوف خدا اور پاک دامنی سے زیادہ سازگار نہ

نہوں نے اس مشکل کا حل عیاشی سے نکالا۔

”تعداد ازواج“ نہ مشرق میں اسلام کی پیداوار ہے نہ اس کے چھوڑنے میں یورپ کے دین مسیحی کا کوئی ہاتھ ہے، مشرق میں یہ دستور اسلام سے پہلے بھی تھا، یہاں کے مذاہب نے اس کی اجازت دی تھی، خود اصل دین مسیح میں بھی اس کی ممانعت پر کوئی صریح حکم موجود نہیں۔ وہاں جو کچھ ہے وہ خود مغربی اقوام کے رسم و رواج کی بنا پر ہے، دین مسیح کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

جن قوموں نے عیاشی کا رویہ اپنا یا ہے وہ ان قوموں سے زیادہ ہیں جن کا تعداد ازواج ہے اور انھوں نے ”یک ہمسری“ پر مضبوط چوٹ لگائی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین سیکل، مصنف ”زندگانی محمد“ تعداد ازواج کے بارے میں قرآن مجید کی آیتیں لکھنے کے بعد کہتے ہیں:

”یہ آیتیں ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو بہتر قرار دیتی ہیں، اور ان کا مطلب ہے کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ عدل کا رویہ نہ رکھ سکو گے تو بس ایک بیوی کرو۔ فوراً ہی اصرار کیا ہے کہ تم انصاف نہ رکھ سکو گے۔ اس صورت حال کے باوجود ممکن ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایسے حادثے پیش آجائیں کہ تعداد ازواج کی ضرورت پڑے تو بشرط عدالت اس کو جائز بھی قرار دیا ہے۔

جنگ کے دنوں میں جب مسلمانوں کے گروہ شہادت حاصل کرنے گئے اور فطرتاً ہی وہ عورتیں رہ جاتی تھیں، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی دستور دیا تھا۔ کیا واقعی طور پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لڑائیوں اور وباد اور شورشوں کے بعد جن میں مہینوں مرد جاک ہوئے ہیں اور بے شمار عورتیں بے شوہر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی چند بیویوں کے بجائے ایک بیوی پر اکتفا کرنا بہتر ہے؟ جب کہ چند

یہودیوں کی اجازت، عدل و انصاف کے رویے کے ساتھ دی گئی ہے
اور بطور استثناء ہے؟

کیا یورپ کے عوام دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ایک ہی
پرانفا کا قانون جس طرح موجود تھا، عملاً بھی اسی طرح نافذ تھا؟“

چند ازواجی کے مشکلات و عیو

خوشی - سعادت - برکت - خوش حالی - خلوص - درگزر - جان نثاری -
وحدت و یگانگت، غرض سب کچھ ایک گھر و بیوی ایک میاں کو نصیب ہوتا ہے -
چند ازواجی زندگی میں یہ سب باتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں -

دو مائیں رکھنے والے بچوں کی تباہ حالی سے قطع نظر، خود شوہر کی ذمے داریاں
کئی بیویوں کے ساتھ انہی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ ان میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے - ان مشکلات
کا سامنا دراصل مسرت و آسودگی کو پس پشت ڈالنے کی برابر ہے -

تعدد ازواج سے خوش و مطمئن لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو عیسیٰ
طو پر اپنی شرعی و اخلاقی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے - ایک بیوی سے زیادہ محبت
کرتے اور دوسری کو نظر انداز کر دیتے ہیں - قرآن مجید اس بد نصیب کی تعبیر کا معلقہ
سے کرتا ہے، شوہر سے ہوا میں معلق چھوڑ دیتے ہیں - اس قسم کے لوگ جب تعدد ازواج
کا نام لیتے ہیں تو دراصل ان کا مقصد ”ایک بیوی“ ہوتی ہے یہ ضمیمہ ظلم و ستم، جرم و بیداد
گہری -

ایک بازاری محاورہ لوگوں کی زبان پر ہے: ”ایک خدا ایک بیوی“ -
اکثر لوگوں کا خیال یہی تھا اور اب بھی یہی ہے - اور حقیقت میں اگر خوشی و مسرت
کو معیار سمجھا جائے اور مسکے کا انفرادی اور شخصی زاویہ سے جائزہ لیں تو یہ خیال
بالکل ٹھیک ہے - ممکن ہے سب شوہروں کے بارے میں صحیح نہ ہو، اکثریت کے لیے تو

بہر حال ٹھیک ہے۔

اگر کوئی شوہر تمام شرعی و اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد بھی تعدد ازواج کو اپنے لیے مفید سمجھتا، اور تن آسانی چاہتا ہے تو یقیناً اسے بڑی غلط فہمی ہے "ایک بیوی" خوشیوں اور راحتوں کی ضمانت کے لحاظ سے "کئی بیویوں" پر بہر حال اور مسلم طور پر بہتر و برتر ہے۔ لیکن

تحقیق کا صحیح راستہ | تعدد ازواج جیسے مسائل کے صحیح اور غلط ہونے کی چھان بین کا طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ مسئلہ شخصی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس کا قیاس "ایک بیوی" کے مسئلہ سے غلط ہے۔

اس قسم کے مسائل کا حل اس بات سے وابستہ ہے کہ ایک طرف تو ہم ایسے عمل و سنیات کو دیکھیں جن سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ غور کریں کہ ان سے بے توجہی کے خطرناک نتائج کیا ہیں۔ دوسری طرف اس پر دھیان دیں کہ خود اس مسئلے یا مسائل سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر دونوں زاویوں سے جو آثار و نتائج سامنے آئیں ان کا جائزہ لیں۔ ان مسائل پر گفتگو اور ان کے واقعی حل کا نہاں ہی ایک راستہ ہے، جس سے تحقیق کرنا چاہیے۔ وضاحت کے لیے ایک مثال:

فرز کریں۔ جبری فوجی بھرتی کی رائے ہے۔ اگر اس مسئلے کو فقط نفع اور جس گھر سے اس سپاہی کا تعلق ہے اس خاندان کے رجحانات کے زائیسے سے دیکھیں تو قانون کا یہ اقدام اچھا نہیں۔ کس قدر اچھا ہوتا اگر سپاہی بھرتی ہونے کا یہ قانون نہ ہوتا اور خاندان کا محبوب فرزند ان کی گود سے دور نہ ہوتا، میدان جنگ میں جا کر خاک و خون میں نہ نہاتا۔

لیکن مسئلے کی تحقیق کا یہ صحیح انداز نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی خاندان سے ایک جوان بیٹے کا جدا ہونا، نیز ممکن حد تک گھر والوں کے لئے غم نصیبی کو سامنے رکھنے کے

بعد ملک کے دفاع میں سپاہیوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے بدترین نتائج پر غور کریں، پھر منطقی اور معقول بات معلوم ہوگی کہ فرزندِ ندان وطن کا ایک گروہ سپاہی کے نام سے ملک اور ملت پر جان نثاری کے لیے موجود ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے سے خاندان کو رنج برداشت کرنا چاہئے۔

ہم نے گذشتہ مقالات میں شخصی اور سماجی ضرورتوں کو تعدادِ زواج کی وجہ جواز بتایا ہے۔ اب ہم تعدادِ زواج سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مجموعی حساب کا راستہ ہموار ہو سکے گا۔ نیز اسی سلسلے میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہم تعدادِ زواج کی خرابیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے اعتراضات تسلیم بھی نہیں کرتے جیسا کہ عنقریب عیاں ہوگا۔ تعدادِ زواج کی بہت سی خرابیاں بیاں ہو سکتی ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بحث شروع کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات اور خرابیوں کا بیان یہ ہے:

روحانی زاویہ نظر | زن و شوہر کا رشتہ فقط مادی و جسمانی ہی نہیں ہے، یہی نہیں کہ یہ تعلق بدنی لمس اور مالی امداد کا ہو۔ اگر یہی بات ہوتی تو کئی بیویوں کا نظام ایک تاویل رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مادی و جسمانی معاملات کو متعدد افراد میں تقسیم کیا جاسکتا تھا اور ہر ایک کا ایک حصہ ہوتا۔

میاں بیوی کے رشتے میں سب سے عمدہ اور اساسی بات روحانی اور حقیقی معاملات ہیں۔ عشق وہ جذبہ ہے — شادی کی مرکزیت دو دلوں کو جھوڑنے کا سبب ہے۔ ہر اندرونی حس کی طرح عشق و احساسات قابلِ تجزیہ و تقسیم نہیں ہیں۔ انھیں توڑ بھوڑ کر ڈھیر یاں لگا کر آدمیوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔ بھلا ممکن ہے کہ دل کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں یا ایک دل دو جگہ رہن رکھا جاسکتا ہے؟ کیا ایک دل دو آدمیوں

کو دینا ممکن ہے؟ عشق و پرستش یکتائی چاہتی ہے، اس میں شریک و رقیب کی گنجائش نہیں ہے۔ گندم اور جو نہیں کہ پیانے میں ناپ ناپ کر ہر ایک کو اس کا حصہ دیا جاسکے۔ اس کے جذبات کنٹرول میں نہیں آسکتے، لہذا روح ازدواج اور انسانی پہلو، دو انساں کو تعلق، دو جانوروں کی طرح فقط شہوت اور خستی نہیں ہے۔ یہ تعلق ناقابل تقسیم ہے، نالائق انضباط۔ لہذا تعداد ازواج بری چیز ہے۔

ہمارے خیال میں، اس گفتگو میں کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ٹھیک ہے شادی کی روح جذبات و احساسات ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ قلبی احساسات آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ مگر — جذبات و احساسات قابل تقسیم نہیں — یہ شاعرانہ تخیل ہے، یہ مغالطہ ہے۔ اس میں تو بحث نہیں کہ خاص احساسات کسی حصہ جسم کے مانند دو نہیں کئے جاسکتے اور ہر شخص کو اس کا حصہ نہیں دیا جاسکتا۔ جس پر یہ نتیجہ چھپا ہوا کہ روح حالی اور نفسیاتی امور بھی قابل تقسیم نہیں ہیں۔ بحث روح بشر کی گنجائش میں ہے، طے شدہ بات ہے کہ آدمی کی روح میں اتنی تنگی نہیں ہے کہ دو رشتے اس میں نہ سما سکیں۔ ایک باپ دس بیٹوں کو پرستش کی حد تک محبوب رکھتا ہے۔ ہر ایک پر جان بھی قربان کر لے۔

ہاں، ایک بات ضرور ہے کہ کثرت کی وجہ سے محبت وہ عروج نہیں پاتی جو وحدت کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ عشق و جذبات کی آخری معراج کثرت سے جوڑ نہیں کھاتی۔ اور عشق کیا، عقل و منطق بھی اس سے ہم آہنگ نہیں۔

”رسل“ نے شادی اور اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”بہت افراد، آج کل عشق کو احساسات و جذبات کا منصفانہ تبادلہ

جانتے ہیں۔ تعداد ازواج کو مسترد کرنے کے لیے دوسری دلیلوں

کو چھوڑ کر ہی دلیل کافی ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ ”جذبات کی منصفانہ تقسیم کی جائے، تو دلیل اسی میں منحصر کیوں ہے؟ آخر باپ، اپنی تمام اولاد سے محبت نہیں کرتا، اور وہ سب باپ کو نہیں چاہتے؟ یہاں، جذبات کا منصفانہ تبادلہ نہیں ہوتا؟ اتفاق دیکھئے کہ اولاد کی تعداد کافی ہو، باپ کا رشتہ الفت ہر ایک سے ایسا ہوتا ہے کہ اولاد کے فرداً فرداً جذبہ الفت پر غالب آتا ہے۔

حیرت ہے۔ بات وہ کر رہا ہے، جو ہمیشہ شوہروں کو سمجھاتا ہے کہ بیوی کے عشق کو بیگانہ عورت کے مقابلے میں قابل احترام سمجھیں اور ان کے غیر سے معافیت کو نہ روکیں، پھر بیویوں کو بھی یہی نصیحت کرتا ہے۔ کیا واقعاً، رسل کے نزدیک میاں بیوی کے جذبات کا منصفانہ تبادلہ ہو سکتا ہے؟

سوت کا وجود، نا اتفاقی کا مشہور ذریعہ ہے۔ بیوی کی نظر میں سوت بڑا دشمن کوئی نہیں۔ ”تعداد ازواج“

تربیتی نقطہ نظر

بیویوں کو آپس میں اور کبھی شوہر کے خلاف آمادہ جنگ، بلکہ میدان جنگ میں لاسے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک بیوی بچے والے گھر کو خلوص اور محبت کی تحفظ کے پرکھن ہونا چاہئے۔ ماؤں کی دشمنیاں اور انتقام طلبی کی دھمکی آگ بچوں میں دوڑ جاتی ہے، دو، دو۔ تین، تین گروہ بن جاتے ہیں۔ گھر کا ماحول جیسے بچوں کا پہلا مدرسہ تعلیم و تربیت روح ہونا چاہئے، جہاں نیکی و رحم و محبت کا سبق ملنا چاہئے وہاں نفاق اور غیر شریفانہ باتیں سکھائی جانے لگتی ہیں۔

تعداد ازواج سے اس قسم کے نامناسب تربیتی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے، لیکن ایک بات یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ نتائج کتنے تعداد ازواج کے غیر سے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے اس کچ ردی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں جو میاں اور دوسری بیوی کے رویے میں آجاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بے چینی

سب کی سب تعداد ازواج کے خمیر کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر باہمی دونوں کی پیداوار ہیں۔

ایک میاں بیوی باہم زندگی بسر کرتے ہیں، دونوں کی زندگی اپنی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ اسی آئنا میں، مرد ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر دوسری عورت پر فریقہ ہو جاتا ہے، اس کے دفاع میں چند ہم سری کا سودا سما جاتا ہے، وہ خفیہ طور پر قول و قرار کر لیتا ہے۔ ناگہاں دوسری بیوی آسمان سے آنے والی موت بن کر، پہلی بیوی کے آتش یا گھر میں نازل ہو جاتی ہے۔ اس کے شوہر اور خود اس کے ساتھ رفیق و شفیق بن بیٹھتی ہے اس کی زندگی پر شب خون مارتی ہے۔ صاف سی بات ہے کہ اس پہلی بیوی کا رد عمل کینہ و انتقام کے علاوہ اور کیا ہو۔ بیوی کے لیے سب سے زیادہ پریشاں کن بات یہ ہے کہ اس کا شوہر اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ عورت کی سب سے بڑی شکست یہ ہے کہ یہ سمجھ لے کہ میں اپنے شوہر کا دل نہ بچا سکی۔ اب وہ کسی اور کو دوست بنا رہے ہیں جب مرد، خود سری و ہوس رانی کی راہ غلط پر آتا اور دوسری بیوی شب خون کرنے لگتی ہے۔ تو پھر پہلی بیوی سے کھل و برائت کی توقع فضول ہے۔

ہاں، اگر پہلی بیوی کو شوہر کے اس عمل کی وجہ جواز معلوم ہو، مثلاً وہ سیر نہیں ہوا۔ اور تعداد ازواج سے وہ اسے پیٹھ نہیں دکھانا چاہتا۔ مرد بھی اپنی ہوس رانی کا غلط راستہ اور خود سری چھوڑ دے۔ پہلی بیوی کے ساتھ جذبات و احترامات کا رشتہ برقرار رکھے، دوسری بھی دھیان رکھے کہ پہلی کے حقوق ہیں۔ وہ حقوق قابل احترام بھی ہیں ان پر دست درازی جائز نہیں ہے۔ خصوصاً، سب مل کر ایک سماجی مشکل کو حل کرنے کی فکر میں رہیں، تو یقیناً، اندرونی بے چینیاں کم ہو جائیں۔

قانون تعداد ازواج، سماجی مشکل کا ایک ترقی پسندانہ حل ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے والے کو بھی ذرا اونچی سطح سے دیکھنا چاہیے۔ اسے اعلیٰ درجے کی اسلامی تربیت

سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔

تجربہ نے بتایا ہے۔ جب اور جہاں مرد نے خود سری و ہوس رانی کے غلط رویے سے دامن بچایا اور بیوی نے واقفاً محسوس کیا کہ اس کے شوہر کو دوسری بیوی کی ضرورت ہے تو وہ خود آگے بڑھی اور دوسری بیوی کو اپنے شوہر کے گھر میں لائی ہے اور مذکورہ بالا برائیوں میں سے کوئی بھی برائی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اکثر بے چینیوں کا سبب مرد کا وہ غیر انسانی رویہ ہوتا ہے جو وہ اس قانون کے اجراء میں اختیار کرتا ہے۔

کہتے ہیں تعدد از دواج کی اجازت، گھٹیا حرم
اور شہوت رانی کی اجازت ہے۔ مرد کو ہوس پرستی
کی اجازت دی گئی ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی شہوت کو ممکن حد تک کم سے کم کرتا جائے کیونکہ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جس قدر شہوت کے راستے کھلے رکھے گا اس کی رغبت اور اس کا شوق بڑھتا جائے گا، ہوس کی آگ بڑھ سکتی جائے گی۔

مان ٹسکونے "روح القوائین" ص ۲۲ پر، کئی بیٹوں پر یہ رائے دی ہے؛
"شاہ مراکش کے حرم میں سفید و زرد و سیاہ پوست، ہر نسل و قوم کی عورتیں
ہیں۔ یہ شخص اگر ان سے دو گنی عورتیں بھی حاصل کر لے، جب بھی ایک نئی
نویلی دلہن کا طلب گار رہے گا۔ کیونکہ ہوس پرستی، خست کی طرح بڑھنے
والی چیز ہے۔ دولت میں قدر بڑھتی جائے تعدد از دواج
گھٹیا درجے کی عشق بازی ہے اور خلاف فطرت (ہم جنس بازی) کو بھی
تجربے میں لاتی اور معاشرے میں پھیلاتی ہے۔ شہوت رانی کی راہ میں جو
عمل بھی حد سے باہر ہوگا، مزید بے قاعدگی کا سبب بنے گا جب سلاہوں
میں شورش ہوئی تو اس وقت بادشاہ کے محل میں ایک بیوی بھی نہ تھی
حکمران صاحب خلاف فطرت عشق بازی میں دن رات گزار رہے تھے۔"

سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔

تجربہ نے بتایا ہے۔ جب اور جہاں مرد نے خود سری و ہوس رانی کے غلط رویے سے دامن بچایا اور بیوی نے واقفاً محسوس کیا کہ اس کے شوہر کو دوسری بیوی کی ضرورت ہے تو وہ خود آگے بڑھی اور دوسری بیوی کو اپنے شوہر کے گھر میں لائی ہے اور مذکورہ بالا برائیوں میں سے کوئی بھی برائی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اکثر بے چینیوں کا سبب مرد کا وہ غیر انسانی رویہ ہوتا ہے جو وہ اس قانون کے اجراء میں اختیار کرتا ہے۔

کہتے ہیں تعدد از دواج کی اجازت، گھٹیا حرم
اور شہوت رانی کی اجازت ہے۔ مرد کو ہوس پرستی
کی اجازت دی گئی ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی شہوت کو ممکن حد تک کم سے کم کرتا جائے کیونکہ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جس قدر شہوت کے راستے کھلے رکھے گا اس کی رغبت اور اس کا شوق بڑھتا جائے گا، ہوس کی آگ بڑھ سکتی جائے گی۔

مان ٹسکونے "روح القوائین" ص ۲۲ پر، کئی بیٹوں پر یہ رائے دی ہے؛
"شاہ مراکش کے حرم میں سفید و زرد و سیاہ پوست، ہر نسل و قوم کی عورتیں
ہیں۔ یہ شخص اگر ان سے دو گنی عورتیں بھی حاصل کر لے، جب بھی ایک نئی
نویلی دلہن کا طلب گار رہے گا۔ کیونکہ ہوس پرستی، خست کی طرح بڑھنے
والی چیز ہے۔ دولت میں قدر بڑھتی جائے تعدد از دواج
گھٹیا درجے کی عشق بازی ہے اور خلاف فطرت (ہم جنس بازی) کو بھی
تجربے میں لاتی اور معاشرے میں پھیلاتی ہے۔ شہوت رانی کی راہ میں جو
عمل بھی حد سے باہر ہوگا، مزید بے قاعدگی کا سبب بنے گا جب سلاہوں
میں شورش ہوئی تو اس وقت بادشاہ کے محل میں ایک بیوی بھی نہ تھی
حکمران صاحب خلاف فطرت عشق بازی میں دن رات گزار رہے تھے۔"

یہ اعتراض دو پہلوؤں سے بحث و نظر کا طالب ہے۔
۱۔ پاکیزگی اخلاق، افعال شہوت کے خلاف ہے، پاکیزگی نفس کے لیے شہوت کو کم سے کم کر دیا جائے۔

۲۔ انسانی نفسیات کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس قدر فطرت کے ساتھ چلے گا کسرشی بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کی مخالفت کرے گا، اسی قدر اس میں ٹھہراؤ آئے گا۔ پہلا زاویہ، افسوس ہے کہ یہ ایک غلط تعلیم ہے اور اس مسیحیت پر قائم ہے جس کی اساس ”ریاضت“ ہے، اس مندو، بدھ اور... جیسے نظریات و مذاہب کی اسی پر چھاپ ہے، اسلامی اخلاق کی اساس کچھ اور ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ نہیں کہ شہوت کو جس قدر کم کیا جائے اخلاق سے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر صفر پر پہنچ جائے تو سوئی اخلاقی ہے۔ اسلام کی نظریں شہوت رانی میں افراط اصول اخلاق کے خلاف ہے۔ تعدد ازواج، افراطی عمل ہے، یا نہیں؟ تو یہ دیکھیں کہ فطرت نے مرد کے لیے ”یک ہم سری“ ہی رکھی ہے اور چند ہم سری کو انحرافی و افراطی عمل قرار دیا ہے۔

اکیس ویں (۳۱) مقالے میں معلوم ہوا کہ آجکل شاید کوئی بھی پیدائہ ہو جائے جو مرد کی فطرت کی ”یک ہم سری“ کا قائل ہو اور چند ہم سری کو خلاف فطرت ماننا ہو بلکہ اس کے برعکس بعض کی رائے یہ ہے کہ مرد کی فطرت چند ہم سری سے زیادہ مناسب اور ایک ہم سری مجرد کی طرح خلاف فطرت ہے۔ ہم اس نظریے کے اگرچہ مخالف ہیں لیکن مرد کی فطرت ایک ہم سری کے قائل بھی نہیں۔

مان شکو کی طرح جن لوگوں نے تعدد ازواج کو شہوت پرستی کے ہم پلہ مانا ہے ان کی نظر حرم سرا بازی خلفار بنی عباس و بنی عثمان پر ہے۔ اسلام، سب سے آگے اور سب سے زیادہ اس کردار کے خلاف ہے۔ اسلام نے تعدد ازواج پر جو حد و قید لگائی ہے اس سے ہوس رانی و آزادی مرد کا خاتمہ ہو جانا ہے۔

رہا بحث کا دوسرا تمہیدی پہلو۔ آدمی کی طبیعت جس قدر راضی رکھی جائے اتنی ہی کشش ہوتی جاتی ہے اور جس قدر مخالفت کی جائے اسی قدر ٹھنڈی رہتی ہے۔ یہ نظریہ بالکل فرائیڈ کے نظریہ کے مقابلے میں ہے کہ آج بھی فرائیڈ کے ماننے والے اس کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔

فرائیڈ ازم والے کہتے ہیں۔ طبیعت کو جس قدر مطمئن کیا جائے، سکون اور حبنا دیا جائے اتنا ہی منہ زور ہوتی ہے، کششی دکھاتی ہے، لہذا ان لوگوں کا شمار اس گروہ میں ہے جو سوفیسط، آزادی اور رسم و رواج، ادب و آداب کو درہم برہم کرنے والا گروہ ہے۔ خاص کر جنسی معاملات میں۔ کاش، مان ٹسکو زندہ ہوتا۔ اور دیکھتا کہ اس کے نظریات فرائیڈ اور اس کے پرستاروں نے کس طرح استعمال کیے ہیں۔ اس کی فریضیوں کا کتنا مذاق اڑایا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دونوں خیال غلط ہیں کیونکہ طبیعت و فطرت کے کچھ حقوق و حدود ہیں ان حقوق و حدود کو سمجھنا اور پہچاننا ضروری ہے۔ طبیعت (فطر) دو چیزوں کے نتیجے میں کششی کرتی اور سکون کو درہم برہم کر ڈالتی ہے۔ ایک محرم و دنا کامی، دوسرے، اس کے سامنے لگی ہوئی ہر حد و قید سے مکمل آزادی۔

بہر حال تعدد اروج ضد و مخالف اخلاق نہیں نہ اس سے پاکیزگی نفس اور روح کا سکون متاثر ہوتا ہے، جو مان ٹسکو کا خیال ہے۔ نہ ایک یا چند شرعی بیوں پر قناعت و اکتفا خلاف اخلاق ہے۔ جیسے آج اس کے ماننے والے، جن کا ہر وقت عملی مظاہرہ اسی نظام کے تحت چاہتے ہیں۔

قانونی نقطہ نظر

عقد ازدواج کے بموجب میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے کے قبضے میں آجاتے ہیں، ایک دوسرے سے لذت اندوزی کا جو ربط پیدا ہوتا ہے

اس کا سبب شادی کے منافع کی ملکیت ہے جو عقد ازدواج کے بموجب ہے۔ لہذا تعدد زوجات کی صورت میں صاحب حق پہلی زوجہ ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ بھی شوہر اور کسی غیر عورت کے درمیان طے ہوتا ہے وہ دراصل "فضولی" ہے (قانونی حیثیت سے کمزور ہے) دیل یہ ہے کہ مرد کے "منافع زن و شوہر" اب سے پہلے، زوجہ اول کے ہاتھ بکسچکے ہیں۔ اور وہی ان کی مالک سمجھی جاتی ہے، اس بنا پر اولیت اسی کو حاصل ہے اور اسی کی طرف توجہ رہنا چاہیے۔ اس سے اجازت لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے تو اسے پہلی بیوی کی رضامندی کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ دراصل پہلی بیوی ہی اپنے شوہر کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرے یا نہ کرے۔

تو، دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک مرتبہ اپنا مال بیچ ڈالے پھر اسی بکے ہوئے مال کو دوسری تیسری اور چوتھی مرتبہ الگ الگ خریداروں کے ہاتھ بیچے۔ اگر بیچنے والا وہی مال بعد والوں کے قبضے میں دیدہ و مستحق سزا ہے۔

یہ اعتراض اس نکتے پر اٹھ سکتا ہے کہ "فطرت حقوق ازدواج" کو منافع کا تبادلہ فرض کیا جائے۔ یعنی، میاں بیوی کو "زن و شوہر کے منافع" کو ہر دوسرے فریق کو مالک مانا جائے۔ ہم سر دست اس بات سے بحث نہیں کرتے کہ یہ نکتہ اعتراض و تنقیح طلب ہے یا نہیں۔ فرض کریں کہ ازدواج کی قانونی فطرت یہی ہو۔ جب بھی اعتراض اس صورت میں ہو تو ممکن ہے کہ مرد کی طرف سے نئی چیز اور نئے نئے پسندیدہ کا پہلو پایا جاتا ہو۔ تو پھر ماننا پڑے گا ازدواج کی قانونی حیثیت "زن و شوہر" (میاں بیوی) کے منافع کا تبادلہ ہی کی ہوگی۔ اور بیوی ہر لحاظ سے بالا دست ہوگی اسے شوہر کے مفادات کا لحاظ کرنا ہوگا اور شوہر کے لیے کوئی وجہ جواز نہ ہوگی کہ کئی بیویاں خود سے کیے

لیکن جس صورت میں مرد کا جذبہ، تنوع پسندی نہ ہو بلکہ گزشتہ مقالات میں بیان کر ڈی سبب میں سے کوئی اور داعی ہو، اس وقت تو یہ اعتراض بے محل ہو جائے گا۔ مثلاً: بیوی بانجھ ہو۔ یا: اس عمر کی ہو جب کچھ نہیں ہو کرتا (یا نہ ہو) اور مرد اولاد کا محتاج ہو۔ یا بیوی مریض ہو اور شوہر اس سے لذت نہیں حاصل کر سکتا۔ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں بیوی کو کئی بیویاں کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہو سکتا۔

یہ صورت حال وہ تھی جہاں تعددِ ازواج کی وجہ جواز، انفرادی پہلو اور وہ بھی شوہر کی ذات سے متعلق ہو، لیکن اگر اس معاملے میں معاشرتی قدم بھی آجائے اور تعددِ ازواج کی بنیاد، عورتوں کی فراوانی اور مردوں کی کمی ہو۔ یا۔ معاشرے کو انفرادی قوت درکار ہو اور تعددِ ازواج اس مقصد کے لیے تجویز کیا جائے، تو پھر صورتِ مسئلہ کچھ اور ہوگی، ان مقامات پر تعددِ ازواج قانونی فرض اور با اصطلاح فقہ "واجب کفائی" ہوگا۔ معاشرے سے عیاشی و ادبائی کے خاتمے، یا معاشرے میں افراد کی عددی افزائش کی خاطر یہ ذمے داری تو اٹھانا پڑے گی۔ بدیہی بات ہے کہ جب ذمہ داری اور سماج کی طرف سے فریضہ عائد ہو جائے تو اجازت و رضامندی و قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرض کریں۔ معاشرہ واقعاً عورتوں کی فراوانی میں مبتلا، یا اسے افراد کی عددی کثرت کی ضرورت ہے، تو شرعی ذمہ داری اور واجب کفائی کا حکم تمام بال بچے والے میاں بیوی پر نافذ ہوگا۔ گھر والی خواتین کو فداکاری و جانی کا وہی مظاہرہ کرنا ہوگا جو لڑکے کے فوج میں داخل ہونے کے وقت کیا جاتا ہے۔ کہ معاشرے کے تحفظ کے لیے محاذِ جنگ پر جاسکے۔ ان مقامات پر، ایک یا کئی افراد کی رضامندی کا حوالہ غلط ہوگا۔

جو لوگ زور دیتے ہیں کہ حق و عدالت کا تقاضہ ہے کہ تعددِ ازواج پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر نہ ہو، ان کی نظر فقط مرد کی تنوع طلبی ہی پر ہے، وہ

انفرادی و معاشرتی ضرورتوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ اگر انفرادی یا معاشرتی ضرورت موجود نہ ہو تو کئی بیویوں کا جواز ہی قابل قبول نہ ہوگا اس میں پہلی بیوی کی اجازت کے ہونے نہ ہونے کی بات ہی کیا رہ جاتی ہے۔

فلسفی نقطہ نظر مساوات حقوق زن و مرد فلسفی اصول ہے۔ اس کی بنیاد ہے کہ دونوں انسانیت میں برابر ہیں لہذا قانون

تعداد ازدواج خلاف اصول فلسفی ہے۔ چونکہ زن و مرد مساوی الحقوق انسان ہیں اس لیے یاد و نون کو حق دیا جائے کہ متعدد ہم سر رکھ سکیں یا کسی کو اجازت نہ ہو، مرد کو کئی بیویوں کا حق ہو اور عورت کو چند سوہرے رکھنے سے محروم رکھنا طبقہ پرستی و مرد لواری ہے۔

مرد کو چار بیویاں کرنے کا حق دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کی ویلیو ہم (چوتھے حصے) کے برابر ہے، عورت کی یہ بہت بڑی توہین ہے۔ حتیٰ کہ اسلام نے بھی میراث اور گواہی میں عورت کو مرد کے نصف کے مساوی مانا اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی ہے۔ لیکن قانون تعداد ازدواج اس کے بھی منافی ہے۔

تعداد ازدواج پر یہ اعتراض سب سے زیادہ حقیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معتض کو بالکل معلوم نہیں کہ تعداد ازدواج کے فردی و معاشرتی زاویے سے موجبات و علل و اسباب کیا ہیں؟ اس طرف معتض کی ذرا سی توجہ نہیں ہے۔ معتض کا خیال ہے کہ موضوع زیر بحث — ہوس ہے۔ جب ہی تو کہہ رہے کہ مرد کی ہوس کو تو دیکھا گیا اور عورت کی ہوس نظر انداز کر دی۔

گذشتہ صفحات میں تعداد ازدواج کے علل و موجبات و مہجوزات و اسباب پر گفتگو ہو چکی۔ خصوصاً یہ اہمیت بھی یاد دلانی چاہی کہ جب سے شوہر عورت میں شادی

ندہ مردوں سے زیادہ ہوں تو بیاتہا جوڑوں میں میاں بیوی دونوں پر یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ایسی خواتین کو گھروں میں بسائیں اب اس پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اس مرحلے میں آنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تعدد ازواج و میراث و شہادت میں اسلام کے فلسفے کی بنیاد حقوق خواتین کی توہیں اور ان سے بے توجہی ہوئی اور اسلام، انسانیت کی سطح پر پیدا ہونے والے حقوق میں اختلاف و فرق مراتب کا قائل ہوتا تو ہر مسئلہ میں حکم کی نوعیت یکساں ہوتی۔ کیونکہ یہ فلسفہ ہر جگہ یکساں اطلاق پذیر قرار پانا اسلام نے نہیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کی میراث ایک مرد کی نصف میراث کے برابر ہے اور کہیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کو ایک مرد کے برابر ترکے میں حصے ملے گا۔ اور کہیں بھی یہ حکم نہیں کہ ایک مرد چاہے بیویاں کرے۔ گواہی (شہادت) کے بارے میں بھی ہر مسئلے کا حکم الگ ہے۔ ان باتوں سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر کچھ اور فلسفوں پر ہے اور اس کی قانون سازی کی سائنس اور ہے۔ ہم میراث کے بارے میں گزشتہ مباحث میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ ایک اور مقالے میں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ۔ انسانیت میں زن و مرد کی مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے حقوق زن و مرد کا احترام، اسلام کی نظر میں حقوق انسانی کی الف بے کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام زن و مرد کے حقوق مساوی کے درجے سے بلند رکھتا ہے، اس بات کا گہری نظر سے مطالعہ ضروری ہے۔ اور ان کا نفاذ بھی لازم ہے۔

چند ازواجی دستور میں اسلام کا کردار

اسلام نے نہ تو چند ازواجی دستور کو ایجاد کیا نہ اسے منسوخ کیا، اسلام سے صدیوں پہلے یہ نظام دنیا میں موجود تھا، اور اب معاشرے میں ایسے مشکلات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل صرف تعدد ازواج ہی میں، اسلام ہی کا حامی ہے۔
لیکن۔ اسلام نے چند ازواجی دستور میں اصلاحات ضرور کیے ہیں۔

محدودیت :

پہلی اصلاح۔ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم میں ایک اقدام یہ کیا کہ اسے محدود کر دیا۔ اسلام سے پہلے ”چند ازواجی“ دستور لامحدود تھا، ایک مرد، سینکڑوں عورتیں رکھ سکتا تھا۔ یوں حرم سرائی پیدا ہوئی۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کر دی۔ ایک آدمی کو چار شادیاں کرنے اور چار بیویوں سے زیادہ بیویاں رکھنے سے روک دیا۔ آغا اسلام میں ایسے افراد تھے، حکایات و روایات ان لوگوں کے نام موجود ہیں، جو اسلام لائے اور ان کے گھروں میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں، اسلام نے ان سے مطالبہ کیا اور انھوں نے زائد بیویوں کو رخصت کر دیا۔ غیلان ابن اسلم، کی دس بیویاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ چھ بیویوں کو رخصت کر دے۔

نوفل ابن معاویہ کی پانچ بیویاں تھیں، اسلام لایا، حضورؐ نے فرمایا، ایک کو رخصت کرنا ضروری ہے۔

شیو روایات میں ہے کہ —

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ایک ایرانی مجوسی نے اسلام قبول کیا اس گھر میں اس کی سات بیویاں تھیں، امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، یہ شخص اسلام قبول کر چکا ہے، ان سات بیویوں کے بارے میں یہ شخص کیا کرے امام نے فرمایا:

”تین بیویوں کو بہر حال رخصت کر دے۔“

دوسری اصلاح — اسلام نے عدالت کی قید لگا دی،

اس نے اجازت نہ دی کہ بیویوں یا ان کی اولاد میں کسی قسم

عدالت

کی درجہ بندی ہو۔ قرآن کریم نے صاف صاف کہا:

فَانْخَفَتُمْ اِلَّا تَعْدُوا فَاِحْدَاكَ

اگر تمہیں عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو۔

اسلام کی آمد سے پہلے دنیا میں اصولِ عدالت کا خیال ہی نہ تھا، نہ بیویوں کے معاملات میں انصاف تھا نہ ان کی اولاد میں۔ مقالہ نمبر ۷۲ میں کرسٹن سن اور دوسرے کی رائے نقل کی جا چکی کہ، ایران کے ساسانی دور میں تعددِ ازواج کی رسم عام تھی۔

بیویوں اور بچوں میں درجہ بندی ہوتی تھی، ایک یا کئی بیویوں کو ”ممتاز محل“ کہا جاتا اور ”پادشاہ زن“ سے موسوم ہوتی تھیں۔ انہیں تمام حقوق حاصل تھے۔ دوسری بیویاں نوکر سمجھی جاتی تھیں۔ انہیں قانونی حق بھی بہت کم نصیب تھے۔ نوکر بیویوں کی اولاد میں لڑکے قبول تھے، لڑکیاں باپ منسوب نہیں کی جاسکتی تھیں۔

اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا، اسلام نے کسی بیوی اور اس کی اولاد کے

قانونی حقوق میں کمتری و فرق کو مسترد کیا۔

ویل ڈیورنٹ نے تاریخ تمدن، جلد اول میں تعددِ ازواج پر بحث کرتے

ہوئے نکھارے :

آہستہ آہستہ ایک ایک فرد کے پاس اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہوتا گیا،
لے فکر ہوئی کہ اگر اس کی دولت زیادہ حصہ داروں میں تقسیم کی گئی تو
اس کی ہر اولاد کو بہت کم حصہ ملے گا، اس کو فکر ہوئی پہلی بیوی اور
دوسری بیوی، نیز دوسری ہم خواب عورتوں میں فرق رکھے تاکہ میراث
اصلی بیوی کی اولاد کو ملے۔“

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانے میں بیوی اور اولادوں کے درمیان
فرق مراتب رائج تھا، تعجب ہے کہ ویل ڈیورنٹ اپنی بات کہتے کہتے یہاں تک پہنچا:
”موجودہ نسل تک براعظم ایشیا میں یہی سلسلہ جاری رہا، آہستہ آہستہ
بیوی ایک ہی رہ گئی، دوسری بیویاں یا محبوب عورتیں خفیہ ہو گئیں
یا بالکل ختم ہو گئیں۔“

ویل ڈیورنٹ نے یا تو خیال نہ کیا، یا توجہ نہ کرنا چاہی، کہ جو وہ صدیاں گزر گئیں،
ایشیا میں، دین مقدس اسلام نے اولاد میں فرق مراتب ختم کر دیا ہے۔ ایک اصلی بیوی
اور چند بچی محبوبائیں رکھنے کی رسم یورپ کی رسم ہے، ایشیا کی نہیں، آخر میں یہ دستور
یورپے ایشیا میں آیا اور پھیلنا ہے۔

بہر حال، اسلام نے تعدد ازواج کے بارے میں دوسری اصلاح یہ کی ہے کہ فرق
مراتب کو مہل قرار دیا، سب بیویوں اور ان کی اولاد کو ایک درجہ دیا۔

اسلام کے نزدیک زندگی بازی کسی شکل و صورت میں جائز نہیں، علماء اسلام
تقریباً سب ہی متفق ہیں کہ بیویوں میں فرق مراتب ناجائز ہے، ایک آدھ فقہی دہشتان
میں بیوی کے حق کی تشریح یوں کی گئی ہے جسے بولے فرق آتی ہے۔ میرے نزدیک
یہ بات ناقابل تردید ہے کہ قرآن کریم اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل نہ برتے، ایک بیوی کی صرف زیادہ جھکاؤ ظاہر کرے تو قیامت میں یوں محسوس ہوگا کہ آدھا بدن زمین پر کھینچ کر پچے گا آخر کار جہنم میں داخل ہو جائے گا۔

عدالت انسانی فضائل میں بہترین فضیلت ہے۔ شرط عدالت کا مطلب یہ بلند ترین اخلاقی قوت کا مالک ہونا۔ چونکہ نو مائٹوس ہر کے جذبات تمام بیویوں کے لیے یکساں اور برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے عدالت کی نگہداشت اور ان کی فریق نہ کرنا، مشکل ترین مرحلہ ہے جو شوہر کے ذمے ہے۔

سب کو معلوم ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے کے آخری برس برس میں، جو لڑائیوں کے دن تھے، بے شوہر عورتیں مسلمانوں میں بکثرت موجود تھیں۔ آنحضرتؐ جن شادیاں کیں وہ بیوہ اور بڑی عمر کی عورتیں تھیں اور کئی کے پاس دوسرے شوہروں اور اولاد بھی تھی بلکہ کسی دوسرے حضرت عائشہؓ تھیں جس سے آپؐ نے شادی کی، حضرت عائشہؓ اس پر فخر کرتی تھیں کہ میں اکیلی بیوی ہوں جس نے آنحضرتؐ کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا بدن لمس نہیں کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواج کے معاملات میں انتہائی عدالت کا برتاؤ کرتے تھے، ذرہ برابر فرق نہ برتتے تھے۔ عروہ ابن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، انھوں نے اپنی خالہ سے آنحضرتؐ کی سیرت کے بارے میں کچھ سوال کیے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: آنحضرتؐ اپنی سیرت کے مطابق ہم میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ سب کے ساتھ عدالت و یکسانیت کا برتاؤ کرتے تھے، بہت کم ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ اپنی تمام ازواج کے گھر نہ جائیں، سب کی مزاج پر سی فرماتے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ جس خاتون کا دن ہوتا اس کے یہاں رہتے

گد-دوسریوں سے غافل نہ ہوتے خیریت طلبی ضرور کرتے۔ رات باری والی بی بی ہی کے یہاں گزارتے تھے اور اگر اتفاقاً کسی ایسی اہلیہ کے یہاں شب گزارنا چاہتے جس کی باری نہ ہوتی تو خود ان اہلیہ کے گھر جاتے اور اس رات کی اجازت طلب فرماتے تھے، اگر وہ اجازت دیتی تھیں تو دوسری کے یہاں شب بائش ہوتے تھے۔ اگر وہ اجازت نہ دیتی تھیں تو آپ دوسری کے یہاں نہ جلتے تھے۔ میں خود بھی ایسے موقع پر آنحضرتؐ کو اجازت نہیں دیتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عدالت میں جو انتقال تک رہے، جب چلنا پھرنا چھوڑ دیا، اس وقت بھی انصاف و عدالت کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے، اور اپنا بستر اس حجرے سے اس حجرے میں منتقل کرتے تھے۔ آخر ایک دن سب کو جمع کر کے ایک حجرے میں رہنے کی اجازت لی۔ اور حجرہ حضرت عائشہ میں رہنے لگے۔

حضرت عیسیٰ ابن ابیطالب علیہ السلام کے گھر میں جب دو بیویاں تھیں تو امام اس قدر عدل کا خیال فرماتے تھے کہ اگر ایک معظمہ کی باری ہوتی تو دوسری کے یہاں وضو کرنے بھی نہ جاتے تھے۔

اسلام بجائے خود اس قدر عدالت کا قائل ہے کہ مرد اور اس کی دوسری بیوی کو یہ حق نہیں دیتا کہ شادی کے لمحے یہ معاہدہ کر لیں کہ دوسری بیوی پہلی بیوی سے کچھ فرق حقوق کے ساتھ گھر میں رہے گی۔ یعنی اسلام کے نزدیک عدالت، شوہر پر واجب شرعی ہے۔ شوہر کسی قبل از وقت شرط کے ذریعے اپنی اصل ذمہ داری سے بیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ عورت و مرد دونوں میں سے کسی کو اس قسم کی شرط تن عقد میں رکھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری بیوی صرف عملی طور پر اپنے حق سے دست بردار ہو سکتی ہے، مگر یہ شرط نہیں کر سکتی کہ وہ پہلی بیوی کے برابر حقوق نہ رکھے گی۔ اسی طرح پہلی بیوی عملی طور پر اپنی رضا و رغبت سے اپنے حقوق سے دست بردار

ہو جائے تو ہو جائے، لیکن قانونی طور پر اپنے حقوق کے بارے میں کوئی ایسا قول و قرار نہیں کر سکتی جس کی رو سے وہ قانوناً محروم ہو جائے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا،

کیا، مرد اپنی بیوی سے یہ شرط کر سکتا ہے کہ فقط دن کو اس کے یہاں آئے گا یا مہینے میں ایک بار، یا ہفتے میں ایک بار رہے گا۔ یا شرط کر لے کہ پورا نفقہ یا فلاں بیوی کے برابر نفقہ لے نہ دے گا۔ اور یہ بیوی ان شرائط یا ان میں سے کسی ایک شرط کو مان لے؟ کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا: نہیں، ایسی شرطیں صحیح نہیں ہیں۔ ہر بیوی عقد ازدواج کے بموجب خود بخود ایک درجہ کے تمام حقوق حاصل کر لیتی ہے۔ البتہ عقد اور حصول حقوق کے بعد ہر بیوی، شوہر کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اور یہ کہ اسے طلاق نہ دے، یا کسی اور مقصد کی خاطر اپنے کچھ حقوق شوہر کو حبتہ کر سکتی ہے۔ ان اخلاقی شرائط کے بعد، تعدد ازدواج ذریعہ ہوس رانی کے بجائے فرائض و حقوق کی شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شہوت رانی و ہوس پرستی کا مطلب مکمل آزادی اور آرزو سے دل پوری کرنا ہے۔ ہوس پرستی اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے، جب آدمی دل کے قابو میں آجائے اور جو دل چاہے وہ کرے۔ اور دل پر خواہشات کا قبضہ ہو۔ دل اور خواہشاتِ دل دلیل و حساب قبول نہیں کرتے۔ جہاں نظم و ضبط، قانون قاعدہ، فرض کی انجام دہی اور عدل و انصاف کی بات آجائے وہاں، ہوس، آرزو اور آزادی خیال کا قدم نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے، اسلامی پابندیوں کے ساتھ ”تعدد ازدواج“ کو ذریعہ ہوس رانی کہنا درست نہیں۔

جو لوگ تعدد ازدواج کو ہوس رانی کا ذریعہ مانتے ہیں وہ ایک ناجائز کام

کے سنے اسلامی قانون کو بہانہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرے کو ان کے منہ سے اور اس غلط بہانے پر سزا دینے کا حق ہے۔

انصاف کی بات کرنا چاہیے، تعدد زوجات کی صورت میں اسلامی پابندیوں کے مطابق

عدل وانصاف کا خوف

کرنے والوں کی تعدد بہت کم ہے۔ فقہ اسلام کہتی ہے:

”اگر ڈرتے ہو کہ پانی کا استعمال جسم کو نقصان پہنچائے گا تو وضو نہ کرو۔“

”اگر خوف ہو کہ روزہ تمہارے لیے ضرر کا باعث ہوگا تو روزہ نہ رکھو۔“

فقہ میں یہ دونوں حکم موجود ہیں، آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پوچھتے ہیں۔ جناب! پانی کا استعمال مجھے نقصان پہنچاتا ہے، میں وضو کروں یا نہ کروں؟ روزے سے خوف ضرر سے، روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ یقیناً یہ سوال درست اور بر محل ہیں ایسے اشخاص واقفاً وغو نہ کریں، ایسے آدمی ہرگز روزہ نہ رکھیں۔

قرآن مجید کے نفاذ میں:

”فان خفتم الا تعدلوا فواحدة“ (امداد ۴)

”اگر تم کو خوف ہو کہ بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے زیادہ بیوی نہ رکھو۔“

اس صورت حال میں، آپ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی سے سنا ہے کہ اس نے پوچھا ہو۔ ”میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں اور دوسری بیوی لانا چاہتا ہوں، مگر ڈرتا ہوں کہ بڑا بری وعدالت نہ برت سکوں گا، شادی کروں یا نہ کروں؟ میں نے تو یہ سوال نہیں سنا۔ آپ نے بھی یقیناً یہ بات کسی سے نہ سنی ہوگی۔ ہمارے عوام بیویوں میں عدل و مساوات قائم نہ رکھنے کی نیت کے بعد بھی گرا سلام اور حکام اسلام کی آڑ میں کئی شادیاں کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو بات صاف ہے۔ یہ لوگ اپنی بدکرداری

سے اسلام کو بدنام کیسے ہیں۔

جو لوگ کم از کم اسی ایک پابندی کو پوری طرح نباہ سکتے ہوں تو بلاشبہ وہ تعدد ازواج پر غصے کر سکتے ہیں اور ان پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو سکے گا۔

تعدد ازواج کی بنیاد پر اسلام کے خلاف گفتگو کا ایک سبب گزشتہ خلفاء و سلاطین کی حرم سرا میں خاص

حرم سرا میں

عیسائی مشنریوں اور کچھ مصنفین نے اسلامی اجازت تعدد ازواج کو ان سونے حرم سراؤں سے جوڑ دیا جہاں کے ظلم و ستم کی کہانیوں کا پروپیگنڈا کیا اور اسے اسلام کے سرمنڈھ دیا۔

ہمارے مصنفین بھی ان کے ترجمان بن گئے اور ان کی تحریروں میں وہی صدائے پرکشت آنے لگی، وہی الفاظ، وہی فکر، اور وہی مقاصد کہ تعدد ازواج کا دوسرا نام حرم سرا ہے۔ اتنی آزادی فکر بھی انہیں حاصل نہیں کہ تعدد ازواج و حرم سرا کا فرق بتا سکیں۔

عدل و انصاف سے قطع نظر، کچھ اور ذمہ داریاں، کچھ اور لوازم و فرائض

دوسرے شرائط و لوازمات

بھی مرد پر عائد ہوتے ہیں۔ بیوی کے حقوق کا ایک سلسلہ اپنی جگہ پھر شوہر سے فائدہ حاصل کرنے کا جواز سب جانتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی مرد چند شادی کر سکتا، اس کا حوصلہ در مالی امکانات سے جارت دیتے ہیں تو اعتراض کیوں ہے، آخر ایک بیوی کے لیے بھی تو امکانات مالی پر نظر رکھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جسمانی اور طبعی امکانات بجائے خود ایک شرط لازم ہیں۔

”کافی“ اور ”وسائل شیعہ“ میں حضرت امام معمر صادق علیہ السلام سے

روایت ہے۔ امام نے فرمایا:

جو شخص عورتوں کو جمع کرے اور انہیں جنسی طور پر مطمئن نہ کر سکے، اور وہ عورتیں
بدکرداری میں مبتلا ہوں تو اس کا گناہ اس شوہر کی گردن پر ہے۔
حرم سراؤں کی تاریخ اور ان کے بارے میں داستانوں کا چرچا ایسی عورتوں
کی شان دہی کرتی ہیں جو نوجواں اور اپنے جنسی دباؤ میں گرفتار تھیں، وہی بدکرداری
کرتی اور بااوقات جنگ و جدال کا سبب بنتی تھیں۔

محترم قارئین !

ان سات مقالوں میں ”چند ازدواجی“ کے مسئلے پر جو کچھ میں نے لکھا، اس میں تنبیہ و عمل اور تعدد ازواج کی بنیاد واضح کی ہے۔ اور یہ بات عرض کی ہے کہ اسلام نے اس دستور کو منسوخ کیوں نہ کیا؟ تعدد ازواج کے شرائط و حدود، دستور اور پابندیاں بیان کی ہیں جن کے بعد یہ دستور منظور کی۔

آپ پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اسلام نے تعدد ازواج کی منظوری میں عورت کی توہین نہیں کی بلکہ اس طریقے سے اس نے جنسِ خواتین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ شادی کے قابل عورتوں کی فراوانی اور ان مردوں سے زیادتی کی نیت جو مرد شادی کے قابل ہوں۔ اور یہ تناسب دنیا میں پہلے بھی اور اب بھی ہے۔ اگر اس معاشرتی مسئلے کو یوں نہیں چھوڑ دیا جاتا تو عورت، مرد کے لیے ایک بدترین کھلونا بن کے رہ جاتی۔ مرد کا اس کے ساتھ ایک لونڈی سے بھی بدتر سلوک ہوتا کیونکہ انسان ایک لونڈی کے لیے بھی کم از کم ایک قسم کا معاہدہ، ایک قسم کی ذمہ داری تو بہر حال رکھتا ہے، اس کی اولاد کو اپنی اولاد ماننا ہے لیکن معشوقہ اور فریڈ گریڈ سے یہ سلوک بھی نہیں ہوتا۔

آج کا مرد اور تعدد ازواج :

آج کا مرد تعدد ازواج سے روگردان ہے۔ کیوں؟ کیا، اس کا مقصد اپنی پہلی بیوی سے وفاداری ہے۔ یا اس کی خواہش ہے کہ وہ ایک بیوی کے پردے پر روزِ نیا مزہ چکھے اور اپنی اس جس کو نہ ختم ہونے والے گناہوں سے آسودگی بخشے؟

آج کل تعدد ازواج کی خانہ پری و فاداری و پاک دامنی کے بجائے عیاشی و گناہ گاری نے کردی اور اسی خاطر آج کا مرد تعدد ازواج کی ذمہ داری سے نکل بھاگتا ہے کہ اس میں پابندی اور جواب دہی کا بوجھ ہے اسے کیوں اٹھائے وہ اس سے نفرت کرتا ہے کل کا مرد اگر بوس رانی کرنا چاہتا تھا تو گناہ کی راہیں آنی کھلی نہ تھیں، وہ مجبوراً تعدد ازواج کے بہانے اپنی خواہش پوری کرنے کی سعی کرتا ہوگا، ممکن ہے کہ وہ گھٹیا مقصد ہی نسا دیاں کرتا ہو اور قانونی و مالی اور اخلاقی پابندیوں سے بچتا بھی ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ذمہ داری ضرور اٹھاتا تھا، وہ ان بیویوں کی اولاد کو اپنی اولاد ضرور مانتا تھا۔ آج کا مرد اپنی عیش پرستی کے بعد عورت کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں، اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ تعدد ازواج کے خلاف مہم چلائے۔

آج کا مرد سیکریٹری، ٹائپسٹ، جیسے ناموں اور کاموں کے لیے خواتین کو جمع کر کے ان سے بیوی کا کام لے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ اس کی اجرت اور اخراجات، حکومت یا کمپنی کی جیب سے ادا کرتا ہے۔ خود اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی صرف نہیں کرتا۔

آج کا مرد مہر و نان و نفقہ کی زحمت و تکلیفات اٹھائے بغیر روزانہ صبح سویرے طلاق کی ضرورت پیش آئے بغیر اپنی محبوبہ بدل لیتا ہے۔ موسمی چومبہ، تعدد ازواج کے خلاف ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے آخر اس کی نو جوان سیکریٹری "موبور" اس کی پہونشیں ہے، سال بھر بعد اسے بدل لے گا۔ ایسے امکانات کے بعد تعدد ازواج کی ضرورت بھی کیا ہے؟

تعدد ازواج کے بڑے سخت مخالف برٹریٹڈ رسل کی سوانح عمری میں پڑھا کہ۔ اس کی زندگی کے ابتدائی عہد پر اس کی بڑی ماں کے علاوہ دوسری دو عورتوں کی بڑی چھاپ تھی ایک "ایس" (ALYS) اس کی پہلی بیوی دوسری اس کی دوست "آٹولین مورل" (OTTOLINE MORELL)۔ مورل اس دور

کی مشہور عورت تھی، بیسویں صدی کے آغاز میں وہ بہت سے لکھنے والوں کی دست
تھی۔ مثلاً ایسا شخص "تعدد ازواج" کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔

”ہی یار بازیاں تھیں جن کے سائے میں رسل نے اپنی کیلی بیوی "ایس" (ALYS)
کے ساتھ زندگی نباہ دی۔ رسل نے اپنی زبان سے خود اقرار کیا ہے :
کچھ دن بعد، سائیکل پر سوار دو پہر کو شہر کے قریب ایک ٹھنڈی بستی
جا رہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا۔

اب مجھے "ایس" (ALYS) سے محبت نہیں رہی۔ !

فہارس

- ① فہرست آیات۔
- ② فہرست احادیث۔
- ③ فہرست اشعار۔
- ④ فہرست "اعلام" اشخاص و اماکن و کتب۔

فہرست آیات قرآن

تین آیہ

صفحہ

- اِذْ اَوْحَيْنَا اِلٰى اِمَّاكَ مَا يُوحٰى (طہ/۳۸)
- اِنَّا عَرَضْنَا الْاَرْضَ عَلٰى السَّمَاوَاتِ (احزاب/۶۲)
- اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ (بقرہ/۳۰)
- الطَّلَاقُ صُرَّتَانِ فَاِصْلَاحٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ... (تقرہ/۲۳)
- وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلٰغُنَّ اَجَلَهُنَّ (بقرہ/۲۳۱)
- فَدَلٰهُمَا بِغُرُوْرٍ (اعراف/۲۳)
- فَوَسْوَسَ لَہُمَا الشَّیْطَانُ (اعراف/۲۰)
- لِّلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اَکْتَسَبُوْا... (نساء/۳۲)
- لِّلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ... (نساء/۷)
- لَقَدْ اَرْسَلْنَا رَسٰلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ ... (صیہ/۲۵)
- وَمَثَلُہُمْ فِى الْاٰنْجِلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطَآہُ فَآزَرٰہُ... (فتح/۲۹)
- ہُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّہُنَّ ... (بقرہ/۱۸۷)
- وَآتٰوُا النِّسَاءَ صَدُقَاتِہُنَّ نَحْلَةً... (نساء/۴)
- وَ اِذَا حٰیٰیْتُمْ بِتَخٰیۃٍ فَعِیُّوْا بِاِحْسَنِ مِّنْہَا اَوْ رُدُّوْہَا... (نساء/۶)
- وَ اَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ... (الفال/۶)
- فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَقْدِرُوْا فَوَاحِدَہٗ ... (نساء/۳)

وَأَنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْغَتْوَا حُكْمًا ... (نساء/ ۳۵)
 وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ... (اعراف/ ۱۸۹)
 وَخَلَقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا ... (نساء/ ۲۸)
 وَقَدْ سَمِعْنَا رَأْيَ لَكُمْ ... (اعراف/ ۳۱)
 وَكَيْفَ تَأْخُذُ وَنَهُ وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمُ إِلَى بَعْضٍ ... (نساء/ ۲)
 وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ... (بقرة/ ۱۸۸)
 وَلَا تَعْضَلُوهُمْ لَتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُمْ ... (نساء/ ۱۹)
 وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ ... (نساء/ ۲۲)
 لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ... (تین/ ۴)
 وَشَفَعْنَاهُمْ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرًا ... (بقرة/ ۲۳۶)
 وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ أَنْفُسَكُمْ ... (روم/ ۲۱)
 وَأَنْفُسٍ وَمَا سَوَّيْنَاهَا ... (شمس/ ۷)
 يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ ... (اشتقاق/ ۶)
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَجْعَلْ لَكُمْ إِيَّاهُ تَوَكُّلٌ ... (نساء/ ۹)
 يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ...

فہرست احادیث نبوی و ائمہ اطہار

اتقوا الله في النساء فانكم اخذتموهن بامانة الله و... (پیغمبر اکرم)
اذا اراد الرجل ان تزوج المرأة فليقل؛ اقررت بالميثاق الذي اخذ الله؛

امساك بمعروف او تسريع باحسان (امام صادق)

نکاح کرو، طلاق نہ دو، عرس الہی طلاق سے لرز اٹھتا ہے (حدیث رسول)

اگر عمر حبلہ بازی نہ کرتے اور متعہ حرام نہ کرتے... (علی)

ان طلاق ام ایوب لحوب (پیغمبر اکرم)

ایلا کرنے والا چار مہینے بعد جبراً اپنی قسم توڑے... (امام محمد باقر)

یہ بات اس کے لیے ٹھیک ہے جسے اللہ نے بیوی کی وجہ سے... (امام کاظم)

تمہیں متعہ کی کیا ضرورت ہے حالانکہ اللہ نے تمہیں اس سے بے نیاز کیا ہے... (امام مہدی)

جبریل نے عورتوں کے بارے میں اتنا زور دیا کہ... (رسول اللہ)

خدا کی نگاہ میں اس گھر سے زیادہ محبوب کوئی جگہ نہیں جہاں نکاح ہوا... (رسول اللہ)

خدا دشمن رکھتا اور لعنت کرتا ہے اس مرد پر جو بیویاں بدلتا... (رسول اللہ)

اشناد عقد بیویوں میں درجہ بندی صحیح نہیں... (امام باقر)

لا تغار فی الاسلام... (رسول اللہ)

ما حل اللہ شیئاً بغض الیہ من الطلاق (رسول اللہ)

من اخلاق الانبیاء حب النساء... (پیغمبر اکرم)

جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں میں انصاف... (پیغمبر اکرم)

جو اپنی زوجہ کو لباس نہ دے، فقہ نہ ادا کرے مسلمانوں کے امام پر فرض ہے

کہ ان دونوں کو الگ کر دے۔ (امام صادق)

جو کئی بیویاں جمع کر لے پھر ان کی جنسی آسودگی نہ کر سکے ... (آنحضرتؐ)
وہ مقام جہاں، تقیہ نہ کروں گا وہ متعہ ہے۔ (امام صادقؑ)
مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ شادی شدہ نے متعہ کیا (علیؑ)
علاقے سے زیادہ مبغوض و منفور اللہ کے نزدیک کوئی نہیں (امام صادقؑ)

فہرست اشعار

ساز طرب عشق، کہ داند کہ چہ ساز است - کز زخمہ ... تگ و ناز است
 رازیت دریں پردہ گراں را پشندی - دانی ... مجاز است
 عشق است کہ دہر بہ دگر رنگ در آید - ناز است ... نیاز است
 در صورت عاشق چہ در آید ہم سوز است - ہمہ ساز است
 تا توانی پامنہ اندر فراق بہ البغض الاشیاء عندی الطلاق
 سخن درست بگویم، غمی تو انم دید بہ کہ می خورد حریریاں ... نظارہ کنم
 غیریں محفل میں یوسے جام کے بہ ہم ہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فہرست اعلام

اعلیٰ :	ازہر، (البوابشر)
الاحوال الشخھیہ (کتاب) :	آرٹینو :
ادارہ اقوام متحدہ :	ہم کا تھیٹرس :
ارٹ و حقوق مدنی ایران (کتاب) :	کاکا ڈیوس :
ارسطو :	ایس :
ازہر، (اسلامی یونیورسٹی) :	کن اسٹائن :
اسپنسر، ہربرٹ :	را :
اسٹرننگ، پروفیسر :	ابراہیم علیہ السلام :
اسکاٹ، ڈاکٹر زیڈلے :	ابن ابی العوجا :
اسلام بول :	ابن اثیر :
اشمید، جرمن پروفیسر :	ابن عزلی، محی الدین :
اطلاعات، روزنامہ، تہران :	ابو یوب النصاری :
اعلانہ حقوق انسانی :	ابو یسیر :
افریقہ :	جوداؤد :
افلاطون :	بوزہرہ، شیخ محمد :
اقبال، علامہ :	جوعالب :
اسن، بیگم کلا یوڈ :	بو تہیر احسن :
افانسو، اول :	

از: مجتهد دوم (ملک پریانہ) :

امامی، حسام الدین :

ام ایوب :

امریکی :

امریکی :

اموی :

انتقاد بر قوانین اساسی و مسلمانیان (کتاب)

انجیل :

اندلس :

انسان موجود یا شداخت (کتاب) :

انقلاب روس :

انقلاب فرانس :

انگریز، انگریزی :

انگلش، فریڈک :

انگلستان (برطانیہ) :

ایران :

ایران در زمان ساسانیان (کتاب) :

ایرانی (ملت ایران) :

ایشیا :

این منور :

(ب)

باققر (امام محمد باقر) :

باشاد، (نہت روزہ) :

برلن، (مشرقی و مغربی) :

بقرہ، سورہ :

بنی حسن، (حسنی سادات) :

بنی حسین، (حسینی سادات) :

بوخسار (جرمن) :

بورنیو :

بودھ (مہیب) :

بوعلی :

(پ)

پترنگال :

پیرپڈو :

پیغمبر اکرم، دیکھئے رسول اکرم :

پیمان مقدس با میثاق ازدواج (کتاب) :

پیرس :

پیوس دوم :

(ت)

تاریخ آبرمالہ (کتاب)

تاریخ اجتماعی ایران از زمان ساسانیان

تہا انقضای امویان و کتاب :

تاریخ تمدن (کتاب) :	چیکو سلواکیہ :
تاریخ تمدن اسلام و عرب (کتاب) :	چین :
تبت :	(ح)
تنسیبہ الامۃ (کتاب) :	حافظ :
تہران :	حسان بن ثابت :
تھوڈا، (قبیلہ) :	حسن مجتبیٰ (امام) :
تورات (کتاب) :	حسین (امام) :
تھیوڈر، (رومی بادشاہ) :	حقوق الزوجیہ (رسالہ، کتاب) :
(ج)	حلی، آیت اللہ :-
جاپان :	حلی، علامہ :
جاپانی :	حوا :
جرمن :	(خ)
جرمنی (مشرقی و مغربی) :	خانلری، ڈاکٹر زہرا :
جسٹس نین، شاہ روم) :	خدیحہ، ام المؤمنین :
جعفر صادق، (امام) :	خسرو پرویز :
جعفری (مذہب، مذہب) :	خلاف (کتاب) :
جمہوریت (کتاب) :	(د)
جواہر الکلام، (کتاب) :	دموسہ :
جیمز، ولیم :	دنور :
(چ)	دوکر پینی :
چومبہ، موسیٰ :	

(د)

ڈارون :

ڈومٹیرین ، حشری :

ڈیلی اکسپرس ، روزنامہ :

(ر)

راغب اصفہانی :

رائیٹر :

رسل ، برٹریڈ :

رسل لی . ڈاکٹر :

رسول اکرم (رسول خدا ، رسول اللہ ، محمد مصطفیٰ) :

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) :

رشید رضا ، سید محمد :

روان شناسی ماوران ، (کتاب) :

رو لینڈ . رومن :

روس ، سویت یونین ، جمہوری :

روسو ، جان چاک :

روسی :

رومانی :

رومی :

ریک ، پروفیسر :

روم :

زردشتی :

زکریا :

زناشوکی و اخلاق (کتاب) :

زن جنس برتر (کتاب) :

زندگانی محمد (کتاب) :

زندہ بیدار ، رسالہ (کتاب) :

زن روز ، رسالہ :

زہرا ، حضرت فاطمہ :

(س)

ساسانی :

ساسانیان :

سان برنارڈینو :

سان فرانسسکو :

ساواژ ، ڈاکٹر :

سجن ، مجید :

سدوم :

سروانٹس :

سعدی :

سنن ابی داؤد (کتاب) :

سنی دہلستان ، اہل سنت :

سویئر :

سیزر :

سیارت (کتاب) :

سی سی پوس (پوسر) :

(ش)

شا ، برناٹو :

شایگان ، ڈاکٹر علی :

شرح قانون مدنی ایران ، (کتاب) :

شفا ، (کتاب) :

شعیب :

شمس ، شبلی :

شہید شانی :

شیخ ، (فقہ ، مذہب ، عوام ، فقہاء) :

(ص)

صاحب جواہر :

صادق ، دیکھیے جعفر صادق علیہ السلام :

صحیح بخاری (کتاب) :

صدر التآخین شیرازی :

(ط)

طارق بن مرقع :

طباطباتی ، علامہ :

طبری :

طوسی ، شیخ (شیخ الطائف) :

(ع)

عائشہ ، ام المومنین :

عباس ، (عم رسول) :

عباسی ، خلفاء ، بنی العباس :

عثمانی ، سلاطین ، خلفاء :

عراقی ، فخر الدین :

عرب (جاملیت) :

عربی ، (زبان) :

عربی ، محی الدین :

عروہ بن زبیر :

علی بن ابی طالب (امیر المومنین) :

علی بن یقطین :

عمر ، حضرت :

عمورہ :

عمید ، ڈاکٹر موسیٰ :

عیسائی ، مسیحی :

(غ)

غالب ، مرزا :

غزالی :

غیلان بن اسمہ :

(ف)

فرار :

فرانس سوار ، روزنامہ :

فرانس :

فرانسیسی :

فرائڈ :

فرائڈ و تحریم وراثتوں کا محرم کتاب :

فرعون :

فرستہ ، اول :

فصل برنگی :

فلاڈلفیا :

فلسفۃ النشوء و الارتقاء ، کتاب :

فلاڈلفیا :

فیگارو ، روزنامہ :

(ق)

قانون اساسی (متمم قانون اساسی ایران) :

قانون مدنی ایران :

فرز کریم :

(ک)

کارنجیا :

کارل الکسیس :

کاشف الغطاء و علامہ :

کاظم ، امام موسی کاظم :

کافی ، کتاب :

کامن ، سامی :

کرسٹی سن :

کشاف ، تفسیر (کتاب)

کلبی ، د فلسفی دبستان :

کوالوسکی ، مونیہ :

کوریا ، جمہوری :

کیتھولک :

کینسی ، رابرٹ :

کینسی رپورٹ :

کیشر :

کیلی فورنیا :

کیمھان ، روزنامہ :

گ

گنڈھی :

ل

لہجہ :

لاس انجلز :

لبنانی :

لذاب فلسفہ (کتاب)

لکی :

لیزر :

لندن :

لوہوں، گوستاوا :

لوط :

لینڈزی، جج :

ہوں للوڈسٹہ : (م)

ماربو، بٹریس :

مانابار :

مانسکو :

مکوسی :

نئی الدین، ابن عربی :

مدین :

مدینہ :

مراکش :

مرجیت دروہانیت (کتاب)

مریم، حضرت :

مسائل (کتاب)

مسجد المحرم :

مسیح، عیسیٰ :

مسیحیت، عیسائیت، عیسائی :

مصر :

معاویہ :

مفردات غریب القرآن (کتاب) :

مکام الاخلاق (کتاب) :

میکادو :

ملایا :

المنار، تفسیر :

منشور اقوام متحدہ :

منفورد وانیٹی :

منوچہریاں، خانم مرانگیر :

مورل، اٹولیس :

موسیٰ علیہ السلام :

مولوی :

کی،

یورپ،

یورپی،

یونانی،

یونسکو، مجلہ،

یہود، قوم،

مونوریس، شاہ روم،

منیگلو، شے،

مصحودی،

مینران العمل (رسالہ)،

و،

والٹر،

والٹس،

وسائل (کتاب)،

وکتوریہ، عہد،

ولایت وزعامت، مقالہ،

ول ڈیورنٹ،

وید (کتاب)،

ویننر،

و،

ہارون رشید،

ہزار ویکشپ (کتاب)

ہند،

ہندی،

ہوبنر،

ہیکل، ڈاکٹر محمد حسین،